نواں باب

نیا یروشلم

قسطنطین، میلویان کی جنگ میں کامیابی کے بعد مغرب میں شہنشاہ بن گیا۔ 323ء میں اس نے لیکینئس، مشرقی صوبوں کے شہنشاہ کو بھی شکست دے دی اب وہ پوری رومی سلطنت کا اکلوتا حکمران تھا۔ قسطنطین گوشہ گمنامی سے نکل کر حیرت انگیز انداز میں بام شہرت پہ پہنچا تھا۔ وہ اپنے عروج کو عیسائیوں کے خدا کی برکت سمجھتا تھا۔ اگر چہ وہ عیسائیت کے بارے میں بہت کم معلومات رکھتا تھا اور اس نے بپتسمہ بھی بستر مرگ پر لیا لیکن وہ کلیسیا کا بہی خواہ اور وفادار ہمیشہ رہا۔ اسے یقین تھا کہ جب عیسائیت کو قانونی حیثیت مل جائے گی تو یہ وسیع وعریض سلطنت روما کو متحد رکھنے والی قوت ثابت ہوگی۔ ابتدا میں فلسطین میں ایک چھوٹی سی اقلیت عیسائی برادری پر مشتمل تھی۔ لیکن تیسری صدی عیسوی کے دوران یہ رومی سلطنت میں سب سے اہم مذہب بن کر ابھری اور اس کے پیروکاروں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ 235ء کے بعد عیسائی ایک عقیدہ رکھنے والی عظیم کلیسیا کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ اس نے ایسے ذہین وفطین افراد کو اپنے دامن میں سمیٹنا شروع کر دیا جو اس سامی مذہب کی ترجمانی بہت موثر انداز میں کر سکتے تھے۔ چنانچہ رومی اور یونانی دنیا اب تیزی سے عیسائیت کو سمجھنے اور قبول کرنے لگی۔ تعزیر وتعزیب کے برسوں میں کلیسیا نے ایک مستعد انتظامیہ تشکیل دے لی تھی جو بذات خود ایک چھوٹی سی سلطنت تھی۔ یہ کثیر ثقافتی، وسیع المشرب، بینالاقوامی اور ہمہ گیر ''سلطنت'' تھی جسے انتہائی قابل اور ضابطہ پرست افراد چلا رہے تھے۔ جب قسطنطین نے اسے قانونی حیثیت دے دی تو روپوش عیسائی بھی منظر عام پر آ گئے اور عوامی زندگی میں نمایاں کردار ادا کرنے لگے۔ قسطنطین چاہتا تھا کہ اس مذہب کے لوگوں کی طاقت اور مہارت سلطنت کی توانائی بن جائے۔

لیکن وہ دوسرے مذاہب کی قیمت پر عیسائیت کو فروغ نہیں دے سکتا تھا۔ قسطنطین ایک حقیقت پسند حکمران تھا اور جانتا تھا کہ دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والی رعایا کی برہمی سلطنت کو خطرات سے دوچار کر دے گی۔ اس نے اپنا رومی خطاب ''پونٹی فیکس مس'' (پجاریوں کی مجلس کا سربراہ) برقرار رکھا اور سلطنت کے پرانے قربانی کے مذہب پر کوئی قدغن

نہ لگائی۔ قسطنطین کو بالاخر نئے مسیحی روم کا اپنا خواب پورا کرنے کا ایک راستہ مل گیا۔ اس نے ایک بہت بڑا تعمیراتی منصوبہ شروع کیا۔ اس منصوبے کے تحت عیسائی شہدا کی قبروں پر مزار بنوائے اور ایک مقبرہ سینٹ پیٹر کی یاد میں رومی شہنشاہوں کے مقبروں کی طرز پر تعمیر کروا دیا۔ یہ نئی کلیسیائی عمارتیں قدیم معبدوں سے بالکل مختلف تھیں۔ یہ کائناتی علامتوں کا ناک نقشہ نہیں رکھتی تھیں۔ ابھی اس نو آزاد کلیسیا کو عوامی اجتماعات کے لئے عبادت کا طریقہ کار ''عشائے ربانی'' کی رسم بھی تشکیل دینا تھی۔ ان عمارتوں کو جنہیں کلیسائے باسلیق کا نام دیا گیا۔۔۔۔۔ روم کے کفر کے نشانات کے درمیان نمودار ہونا پڑا۔ لیکن وقت نے دکھا دیا کہ دنیا میں اپنا مقام حاصل کرنے کے لئے عیسائیت کا سفر شروع ہو چکا ہے۔ روم میں مرکزی مقامات پر پہلے ہی تاریک خیال مذاہب کی عمارتوں کا قبضہ تھا چنانچہ قسطنطین کو شہدا کی یادگار تعمیر کرنے کے لئے شہر کا مضافاتی علاقہ منتخب کرنا پڑا تھا۔ لیکن نئے دارالحکومت میں ایسی کوئی مجبوری نہ تھی۔ (رومی سلطنت کے داخلی جھگڑوں سے تنگ آ کر قسطنطین نے آبنائے باسفورس کے قریب قدیم یونانی شہر بازنطینی کے مقام پر نیا شہر قسطنطینہ آباد کیا اور پھر اسے اپنا نیا دارالحکومت بنالیا اسی نسبت سے تاریخ میں یہ بازنطینی سلطنت کہلائی) قسطنطینہ مکمل طور پر ایک مسیحی شہر بن سکتا تھا جس میں صلیب کو بڑے افتخار کے ساتھ نمایاں مقام پر نصب کیا جا سکتا تھا اور بائبل کے مشاہیر کے مجسموں کو اس شہر کے چورا ہوں کی زینت

بنایا جا سکتا تھا۔ قسطنطینہ کی اپنی کوئی تاریخ نہیں تھی لیکن شہنشاہ قسطنطین جو مذہبی نشانات کی طاقت میں ایمان رکھتا تھا، اس بات سے پوری طرح آگاہ تھا کہ اس کی عیسائی سلطنت کی جڑیں ایک مقدس ماضی سے پیوست دکھانا بھی ضروری ہے تا کہ ایک تسلسل نظر آئے جو ازمنہ قدیم کے اواخر میں تہذیبوں کی ایک اہم ترین ضرورت تھی۔

قسطنطین کے دور اقتدار کے ابتدائی برسوں میں اس کا سب سے زیادہ متحرک اور پر جوش حامی قیصریہ کا بشپ یوزیبئس تھا۔ میلویان پل کے معرکہ کے بعد یوزیبئس نے قسطنطین کی مدح سرائی کرتے ہوئے اسے نیا موسیٰ قرار دیا جس نے میک زینئس کو اسی طرح پچھاڑ دیا جس طرح موسیٰ نے مصریوں کو نا کام بنا دیا تھا۔(1) اس نے قسطنطین کو ابراہیم ثانی کا بھی خطاب دیا اور کہا کہ وہ خالص توحید پرستی بحال کرے گا۔(2) یوزیبئس کا استدلال تھا کہ حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب نے نہ تو کوئی معبد تعمیر کیا تھا اور نہ ہی کوئی توریت پیش کی تھی۔ اس نے لوگوں کو یاد دلایا کہ یہ بزرگان اسرائیل صرف خدا کی عبادت کرتے تھے اور اس کے لئے کسی معبد کی پابندی نہیں تھی۔ وہ جہاں بھی ہوتے سادگی سے عبادت کر لیتے تھے۔(3) یوزیبئس بھی دیگر عیسائیوں کی طرح کوہ زیتوں پر کھڑا ہو جاتا اور معبد کی تباہی اور یسوع کی پیشین گوئیوں کو زیر بحث لاتا۔ وہ اس بات کو قسمت کی ستم ظریفی قرار دیتا کہ ایلیا کے شہریوں نے معبد کے پتھر اپنے تھیٹروں اور مندروں کی تعمیر میں استعمال کر لئے ہیں۔(4) اس کا کہنا تھا کہ معبد کا المناک انجام اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا اب قربانی جیسی نمائشی مذہبی رسوم کا خاتمہ چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگ اس حقایقی روحانی مذہب پر عمل درآمد کریں جس

کی تبلیغ یسوع مسیح نے کی تھی اور جس کا انحصار معبدوں اور مقدس مقامات پر نہیں۔ اوریجن کی طرح یوزیبئس کے پاس بھی کسی مقدس جغرافیہ کے لئے وقت نہیں تھا۔ ''خدا ان لوگوں کو نہیں ملے گا جو اسے بے جان مادے اور تاریک غاروں میں تلاش کرتے ہیں۔ صرف ان لوگوں کو ملے گا جو روحانی پاکیزگی رکھتے ہیں اور اس کے لئے صاف اور روشن ذہنوں کے ساتھ تیاری کرتے ہیں۔''(5) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت اپنے پیروکاروں سے اکلوتے مقدس مقام کے لئے عجلت چاہتی تھی جب کہ یوزیبئس حضرت عیسیٰ کو یہ کہتے ہوئے سنتا ہے:

''میں سب کو آزادی دے رہا ہوں۔ لوگوں کو سکھاؤ کہ خدا کو نہ تو
زمین کے کسی ایک گوشے میں تلاش کریں، نہ پہاڑوں میں ڈھونڈیں
اور نہ ایسے معبدوں میں اس کی توقع کریں جو خود انسانوں نے بنائے
ہیں، ہاں تم سب اپنے گھروں میں اس کی عبادت کرو۔''(6)

یوزیبئس کا کہنا تھا کہ حضرت عیسیٰ بنی نوع انسان کو حضرت ابراہیمؑ کے ابتدائی اور خالص مذہب کی تعلیمات یاد دلانے کے لیے آئے تھے جو ہر قسم کے غیر عقلی تصورات اور نفسانی آلائشوں سے پاک ہے۔ یوزیبئس گہرے اطمینان کے ساتھ کوہ زیہوں کے مضافات پر نظر ڈالتا اور اپنے تمام ہم عصروں کی طرح تصور کرتا کہ یہ بائبل میں مذکورہ صیہون کا علاقہ ہے جو ''یسوع'' کو جھٹلانے کے سبب اور آسمانی بادشاہت کے قیام کے لئے خدا نے تباہ کیا۔ اب یہ کسی روحانی مرکز کی بجائے محض ایک رومی کھیت تھا جو بقیہ ملک کے عام کھیتوں جیسا تھا۔ اس میں بیلوں کے ذریعے ہل چلایا جاتا اور بیج بوئے جاتے۔(7) صیہون کا ویران اور اجاڑ منظر ثابت کرتا تھا کہ خدا نے واقعی اس شہر کو ترک کر دیا ہے دلچسپ بات یہ ہے کہ یوزیبئس نے کبھی بھی کوزیہون کو ایلیا شہر میں عیسائیوں کا مرکز نہیں کہا۔ چوتھی صدی کے آغاز کے ساتھ ہی مقامی عیسائیوں نے بحث چھیڑ دی تھی کہ ایلیا کی کلیسیا اس لئے مادر کلیسیا ہے کہ اس علاقے کو حضرت عیسیٰ سے نسبت ہے۔ چنانچہ یہ اعلیٰ درجہ وحیثیت رکھتی ہے اس کے برعکس قیصریہ کی کلیسیا کو ایسی کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ جیمز زادک کے تخت کی موجودگی کی علاوہ مقامی عیسائیوں نے کوہ زیہون پر ایسے کھنڈرات کی نشاندہی کرنا شروع کر دی تھی جن کا ذکر بائبل میں موجود ہے۔ ایک پرانے گھر کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ یہ کائفا کاہن کی رہائش تھی۔ ایک اور کھنڈر کو بادشاہ داؤد کے محل کی باقیات سمجھا جاتا تھا۔ ایک ستون کی نسبت کہا جاتا تھا کہ یہاں پیلاطس حاکم نے حضرت عیسیٰ کو کوڑے لگوائے تھے۔ یوزیبئس اپنی تحریروں میں ان سب باتوں کو شامل نہیں کرتا۔ بائبل میں مذکور مقامات کے ناموں کو زیر بحث لاتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ فلسطین کا جغرافیہ انجیل کی صداقت کو ثابت کرتا ہے۔ وہ تمام شہر اور گاؤں ٹھیک ٹھیک انہی مقامات پر پائے جاتے

ہیں جہاں انجیلوں کے مصنفین ان کا ذکر کرتے ہیں لیکن یوزیبئس کو وہ زیہون کے مقامات کو حضرت عیسیٰ کی زندگی کے ثبوت یا شواہد کے طور پر پیش نہیں کرتا۔ ایک مورخ کی حیثیت سے یوزیبئس ان کے معتبر و مصدقہ ہونے کے بارے میں تشکیک کا حق رکھتا ہے لیکن اس خاموشی کے پیچھے دراصل اس کا قیصریہ کی کلیسیا کا بشپ ہونا ہے۔ وہ ایلیا کی کلیسیا کی قدر و منزلت بڑھانے سے شعوری طور پر گریزاں نظر آتا ہے۔ ورنہ اس کے علم میں ہوگا کہ ایلیا کلیسیا کا بشپ میکاریوس ان مقامات کے حوالے سے ہی ایلیا کو فلسطین کا عُروس البلاد ثابت کرنے کی تحریک کا حامی تھا۔

318ء میں قیصریہ اور ایلیا کلیسیاؤں کی مخاصمت اس وقت منظر عام پر آ گئی جب پوزیبئس اور میکایوس، عقائد کے ایک تنازعہ میں ایک دوسرے کے خلاف ڈٹ گئے۔ خطرہ پیدا ہو گیا کہ اس عقیدے کی بنیاد پر پوری کلیسیا بکھر جائے گی۔ اسکندریہ کلیسیا کے ایک کرشمہ ساز پریسبیٹر (منتظم پادری) آرائیس نے مسئلہ پیش کیا کہ کیا حضرت عیسیٰ بھی خدا کی طرح الوہیت کے مالک تھے؟ آرائیس نے بائبل سے حوالے دے کر ثابت کیا کہ حضرت عیسیٰ کلام مجسم تو تھے لیکن اس طرح الوہیت کے درجہ پر فائز نہیں تھے جس طرح باپ، خدا، خود ہے۔ انہیں خدا نے ابتدائے آفرینش سے پہلے تخلیق کیا۔(8) آرئیس نے حجرت عیسیٰؑ کی الوہیت کا انکار نہ کیا اور انہیں طاقتور خدا اور سچا خدا کہا۔ لیکن وہ انہیں حقیقی نوعیت میں آسمانی وجود نہیں سمجھتا تھا۔ ایک گروہ کا عقیدہ تھا کہ یسوع آسمانی وجود تھا ہم اپنے باپ سے جدا مگر کم تر حیثیت رکھتا تھا۔ دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ یسوع آسمانی باپ کا فقط ایک پہلو ہے جب کہ خدا بیک وقت یسوع بھی ہے اور آسمانی باپ بھی۔ تثلیث کا اعتقاد رکھنے والے کہتے تھے کہ خدا بیک وقت واحد بھی ہے اور باپ بیٹے اور مقدس روح میں بھی تقسیم ہے۔ آرئیس کا کہنا تھا کہ خدا باپ نے حضرت عیسیٰ کو ان کی مکمل فرماں برداری اور تسلیم و رضا کے صلہ میں الوہیت عطا کی تھی۔(9) خود حضرت عیسیٰ نے کہا تھا کہ۔۔۔ میرا باپ مجھ سے عظیم ہے۔ آرئیس کے خیالات نئے نہیں تھے۔ اوریجن بھی حضرت عیسیٰ کے بارے میں ایسے ہی خیالات رکھتا تھا۔ عیسائیوں کا ایک طویل عرصہ سے اعتقاد تھا کہ حضرت عیسیٰ خدا ہیں لیکن اس بات پر کہیں اتفاق رائے نہیں تھا کہ حقیقی معنوں میں اس سے مراد کیا ہے۔ اگر یسوع مسیح الوہیت کے مالک تھے تو اس کا مطلب تھا کہ خدا ایک نہیں دو ہیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا تھا کہ ایک انسان کی عبادت کرنا، بت پرستی نہیں ہوگی؟ آرئیس نے اپنا عقیدہ غالباً اپنے پیشروؤں سے زیادہ بہتر اور شفاف انداز میں پیش کیا ہوگا۔ لیکن بہت سے بشپ اسی عقیدہ کے قائل تھے اور تنازعہ کی ابتدا میں یہ بات کسی بھی طرح واضح نہیں تھی کہ کیوں۔۔۔ بلکہ۔۔۔ کیا آرئیس کا نکتہ نظر غلط ہے۔

آرئیس کی مخالفت اس کے بشپ الیگزینڈر اور بشپ کے نوجوان ذہین نائب ایتھانا سیئس نے کی۔ ایتھانا سیئس کا دعویٰ تھا کہ کلام مجسم (حضرت عیسیٰ) ٹھیک اسی طرح خدا تھے جس طرح خدا باپ خود ہے۔ وہ خدا کی اس خصوصیت میں شریک تھے کہ اسے نہ تو کسی نے پیدا کیا اور نہ تخلیق کیا۔ کلام مجسم اگر محض مخلوق ہوتا جسے باپ نے ابتدائے آفرینش میں پکارا تھا تو پھر وہ بنی نوع انسان کو موت و ہلاکت سے کیسے نجات دینے کے قابل ہو سکتا تھا۔ جس طاقت نے دنیا کو پیدا کیا وہی

اسے بچا بھی سکتی ہے۔ چنانچہ یسوع مسیح، کلام مجسم انسانی گوشت پوست کی صورت میں تو تھا لیکن باپ کی الوہیت میں بھی شریک تھا۔ اس کی موت اور حیات نو نے بنی نوع انسان کو گناہ اور ہلاکت سے نجات دلا دی ہے۔ اب خداوند یسوع مسیح میں ضم ہو کر مرد اور عورتیں بھی مقدس بن سکتے ہیں۔

تنازعہ میں شدت آ گئی۔ تمام کلیساؤں کے بشپس کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ کسی ایک فریق کا ساتھ دیں۔ فلسطین میں میکاریوس کا ساتھ ایتھاناسیئس اور آریئس کا ساتھ یوزیبئس نے دیا۔ آریئس کے اعتقادات اپنی ہی قسم کے تھے جب یوزیبئس نے بشپ کا منصب سنبھالا تو اس وقت اسے کلیسیا کے اس عقیدت کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔ تب تک حضرت عیسیٰ کی ذات اور درجات کے بارے میں کٹر قسم کے عقائد کی تعلیمات کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ یوزیبئس اپنی نسل کے دانشور عیسائیوں میں سے ایک تھا۔ اس کے خیالات ویسے تھے جو متعدد سابق مذہبی پیشوا رکھتے تھے۔ ایتھاناسیئس کی نظر میں یسوع کی آمد ایک ڈرامائی اور منفرد واقعہ تھی۔ لیکن یوزیبئس عیسائیت کو ماضی کا تسلسل سمجھتا تھا۔ ایتھاناسیئس کلام الٰہی کی تجسیم کو تاریخ عالم کا بے مثال واقعہ کہتا تھا جس میں الوہیت دنیاوی سطح پر ایک بے نظیر انداز میں ظاہر ہوئی تھی۔ چنانچہ یسوع خدا کا ایک اور اکلوتا مظہر تھا۔ یوزیبئس اس میں ایمان نہیں رکھتا تھا۔ اس کے خیال میں خدا پہلے بھی انسانوں پر ظاہر ہوتا رہا ہے۔ کلام الٰہی ممرے میں حضرت ابراہیم پر انسانی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ (10) حضرت موسیٰ اور یشوع بھی اسی طرح کی رویت الٰہی کا تجربہ رکھتے تھے۔ چنانچہ یسوع ناصری کی صورت میں کلام مجسم کی واپسی نئی بات نہیں تھی۔ (11) وہ اس تجسیم کو ماضی کی رویت الٰہی کی ایک واضح اور صریح قسم قرار دیتا تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ انسانوں پر خدا کا ظہور ایک جاری عمل ہے۔ جو یسوع کے ساتھ اختتام کو نہیں پہنچا۔

ایتھاناسیئس دنیا کی نجات کو یسوع کی اہم ترین کامیابی اور امتیاز سمجھتا تھا۔ یوزیبئس اس سے متفق نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یقیناً یسوع نے ہمیں نجات دلائی ہے لیکن اس کی اصل فضیلت دنیا پہ خدا کے ظہور کی حیثیت سے آمد ہے۔ یسوع خدا کا مظہر تھا۔ اس کو دیکھ کر لوگ تصور کر سکتے تھے کہ غیر مری اور ناقابل تصور خدا کیسا ہے۔ یسوع کے بڑے مقاصد میں سے ایک عیسائیوں کو مذہب کی حقیقی روحانی نوعیت سے روشناس کرانا تھا۔ کئی صدیاں گزر جانے پر لوگ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی خالص روحانیت بھول چکے تھے۔ لوگوں نے اپنا ایمان توریت اور معبد جیسے مادی نشانات اور علامتوں سے آلودہ کر لیا تھا۔ یسوع ہمیں یاد دلانے آیا تھا کہ قدیم پاکیزگی اور خالص توحید کی طرف مراجعت ضروری ہے۔ چنانچہ ہمیں یسوع مسیح کی انسانی صفات پر زیادہ توجہ نہیں دینی چاہیے۔ یوزیبئس نے ایک دفعہ قسطنطین کی بہن قسطانطیہ کو ایک تند و تیز خط لکھا۔ جس نے اسے حضرت عیسیٰ کی کوئی تصویر بھجوانے کی احمقانہ فرمائش کی تھی۔ ''عیسائیوں کو گوشت پوست کے انسان (حضرت عیسیٰ) کی بجائے کلام الٰہی کی الوہی جوہر کی تمنا کرنا چاہیے۔ زمین پر اپنے عارضی قیام کے بعد کلام الٰہی واپس آسمانی بادشاہت میں چلا گیا تھا۔ عیسائیوں کو اب اسے وہاں تلاش کرنا چاہیے۔ یسوع کے انسانی روپ سے وابستگی اسی

طرح گمراہی اور غیر دانشمندی ہے جس طرح یہودیوں کی معبد سے وابستگی تھی۔'' عیسائی ایک مسلسل کتھارسس یا تزکیہ نفس میں مصروف تھے۔ چنانچہ یوزیبئس انہیں مشورہ دیتا تھا کہ'' صحائف کو زیادہ روحانی انداز میں پڑھو۔ تاریخی واقعات میں سے لافانی صداقت تلاش کرو۔'' یسوع کی حیات نو کوئی ڈرامائی اقدام نہیں تھا جس طرح ایتھانا سیس سمجھتا ہے۔'' یہ محض حیات جاودانی کو افشاں کرنے کا ایک اقدام تھا جو انسانی حالات کے مطابق عین فطری تھا۔''

یہ مسائل واضح طور پر غیر مادی تھے۔ اور انہیں کسی بھی طرح ثابت کرنا ناممکن تھا۔ لیکن بہر طور یہ مسائل عقائد سے تعلق رکھتے تھے اور اگر انہیں کسی ایک یا دوسرے طریقے سے طے کیا جاتا تو کلیسیا کا شیرازہ بکھر جانے کا خطرہ موجود تھا۔ قسطنطین کے لئے یہ سب کچھ انتہائی اشتعال انگیز تھا۔ و مذہبی ءمباحث کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن یہ نکتہ سمجھتا تھا کی اگر اس طرح کی مذہبی بحث کو جاری رکھنے کی اجازت دے دی گئی تو وہ ادارہ تقسیم ہو جائے گا جو اس کے خیال میں سلطنت کو متحد اور باہم پیوست رکھ سکتا ہے۔ 325ء کے اوائل میں ایتھانا سیئس کی جماعت قسطنطین کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ آریئس کے ساتھیوں (آرین) کو کلیسائی حقوق سے محروم کرنے کے احکامات جاری کر دیئے گئے۔ قسطنطین نے کلیسیا کے تمام مذہبی رہنماؤں کی ایک کونسل تشکیل دی اور کونسل سے کہا گیا کہ اس قضیہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حل کرے۔ یوزیبئس اس وقت 65 برس کا بزرگ اور اہم ترین بشپوں میں سے ایک تھا۔ مئی میں جب وہ کونسل میں شرکت کے لئے نیقیہ پہنچا تو شہنشاہ کی طرف سے اسے بھی کلیسیائی حقوق سے محروم کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کا حریف میکاریوس جو کامیاب ہونے والی جماعت میں شامل ہو چکا تھا۔۔۔۔۔ اب ایک مضبوط حیثیت میں تھا۔ یقیناً اس کے ساتھی یہ بات کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ کہ ایلیا۔۔۔۔۔ مادر کلیسیا ۔۔۔۔۔ کا بشپ قیضر یہ کے بدعتی بشپ سے مغلوب ہو جائے۔ یوزیبئس قیصریہ کی کلیسیا کا بشپ تھا اور اپنے خیالات کی وجہ سے بدعتی سمجھا جانے لگا تھا۔ اس کا حریف ایلیا کلیسیا کا بشپ میکاریوس تھا جس نے ایتھانا سیئس کی حمایت کی۔ اسی نے شہنشاہ پر اثر انداز ہو کر یوزیبئس کو راستے سے ہٹا دیا۔

نیقیہ کی مجلس نے متفقہ طور پر ایک سرکاری اعلامیہ جاری کیا جس میں ایتھانا سیئس کے عقیدے کو تسلیم کر لیا گیا۔ اعلامیہ کی عبارت کچھ اس طرح تھی۔

''جو شخص یہ کہے کہ کسی وقت خدا کے بیٹے' یسوع مسیح کا وجود نہ تھا
یا وہ نیست سے ہست کیا گیا یا کسی ایسے مادہ یا جوہر سے اس کی تخلیق
ہوئی جو الوہی نہیں ہے یا وہ مخلوق یا متغیر ہے۔۔۔ ایسے شخص کو
کلیسیائے مقدس ملعون قرار دیتی ہے۔''

لیکن یہ اعلامیہ مرکزی کلیسیا میں ہم آہنگی نہ پیدا کر سکا۔ بہت سے بشپ ایسے عقائد کے حامی تھے جو ایتھا ناسیئس اور آریئس کے عقائد میں توازن پیدا کرتے تھے۔ وہ ان دونوں کو انتہا پسند اور خارج المرکز سمجھتے تھے۔ شہنشاہ کے دباؤ کے تحت تمام بشپوں نے اس اعلامیہ پر دستخط کر دیئے تھے جن میں آریئس کے دو حامی بھی شامل تھا۔ انہوں نے امن وہم آہنگی کے لئے دستخط تو کر دیئے لیکن بعد میں پھر سے انہوں نے اپنے پرانے خیالات کی تبلیغ شروع کر دی۔ یہ لوگ بہر حال سرکشی کے انداز میں بدعت کے مرتکب نہیں ہو رہے تھے نیقیہ کی کونسل مسیحی دنیا کی پہلی کلیسیائی کونسل تھی اور ابھی یہ روایت شروع نہیں ہوئی تھی کہ کونسل کے اعلامیوں کو ''خطا سے پاک'' سمجھنے پر اصرار کیا جائے۔ بشپ محسوس کرتے تھے کہ ان کے نکتہ نظر بھی سنا جانا چاہئے۔ چنانچہ آرین تنازعہ طول پکڑ گیا اور اگلے ساٹھ برس تک تند و تیز بحث کا موضوع بنا رہا۔ اعلامیہ پر دستخط کرنے عالے دور آرین مذہبی رہنماؤں میں سے ایک یوزیبئس تھا۔ اس نے کونسل سے واپس آنے کے فوراً بعد ایتھا ناسیئس کی ''تقلید پسندی'' کے خلاف مہم شروع کر دی۔ اس نے ''رویت الٰہی'' کینام سے ایک رسالہ تحریر کیا جس میں حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اپنے خیالات کھل کر پیش کئے۔ وہ چونکہ شہنشاہ قسطنطین کا حامی رہا تھا چنانچہ اس تک اپنے خیالات پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ 327ء میں نیقیہ کی کونسل کے دو سال بعد یوزیبئس کی اعتدال پسند جماعت ابھرنے میں کامیاب ہو گئی اور آرین فرقہ کے لوگوں پر عائد پابندیاں اٹھالی گئیں۔

اگر نیقیہ کی کونسل کو مذہبی سیاست میں معمولی سا عمل دخل بھی حاصل ہوتا تو ایلیا (یروشلم) کی تاریخ میں زبردست ردعمل دیکھنے میں آتا۔ مثلاً میکاریوس اپنی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ کونسل کے ارکان کی طرف سے اصرار کیا جا سکتا تھا کہ ایلیا کے بشپ کو مرکزی کلیسیا میں اعلیٰ درجہ دیا جائے کیونکہ وہ ابھی تک عروس البالد قیصریہ کے کلیسیا کے ماتحت تھا۔ میکاریوس کو وہ سب کچھ نہ مل سکا جو وہ چاہتا تھا۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نیقیہ کونسل میں اسی نے تجویز پیش کی تھی جو ایلیا کے کلیسیا کی حیثیت کو بہتر بنا سکتی تھی اور ایتھا ناسیئس کے عقیدے کی حتمی کامیابی کو یقینی بنایا جا سکتا تھا۔ میکاریوس نے شہنشاہ قسطنطین سے درخواست کی کہ ایلیا میں موجود ایفرودیتی کا مندر منہدم کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ یسوع مسیح کی تدفین والا غار برآمد ہو سکے جو مندر کے نیچے دب چکا ہے۔

قسطنطین کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔ وہ بنیادی طور پہر تاریک خیال رسوم و آداب کا حامی تھا۔ اسی لئے اس نے یوزیبئس کے مقدس مقامات کو ترک کرنے کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ وہ فلسطین کا دورہ کرنا چاہتا تھا جب کہ اس کی ساس یوٹروبیا پہلے ہی سے بائبل کی سرزمین کے سفر میں تھی۔ قسطنطین کو علم تھا کہ اس کی عیسائی سلطنت کو ایسی نشانیوں، مقامات اور آثار کی ضرورت ہے جو اسے تاریخی تسلسل دے سکیں۔ میکاریوس کا غیر معمولی منصوبہ خطرات سے خالی نہیں تھا۔ ایلیا کی آبادی میں اکثریت بت پرستوں کی تھی۔ رومی دیوتاؤں کے یہ پرستار مندر کے انہدام پر شدید ردعمل کا مظاہرہ کر سکتے تھے۔ اس بات کا امکان تھا کہ انہدام کے پیچھے رومن شہنشاہ کی تائید دیکھ کر وہ کسی ردعمل کا اظہار نہ کریں لیکن اس بات کی کیا

ضمانت تھی کہ گلگتا اور یسوع کا مدفن ایفرودیتی کے مندر کے نیچے ہی پایا جاتا ہے۔ اگر مندر کے نیچے کچھ نہ ملا تو ایلیا کے بت پرست بھڑک اٹھیں گے کہ بلا وجہ ایک مندر کو مسمار کر کے انکے جذبات مجروح کئے گئے۔ شہنشاہ اور کلیسیا دونوں کے لئے ایک طرف ایلیا کے باشندوں کا غم وغصہ نقصان دہ ہوگا دوسری طرف کھدائی میں کچھ نہ ملنے پر عیسائیت کو دھچکا پہنچے گا۔ لیکن شہنشاہ کو راضی کر لیا گیا۔

قسطنطین نے مندر کے انہدام کی اجازت دے دی اور کونسل کے اجلاس کے بعد میکاریوس کی نگرانی میں کام شروع ہو گیا۔ دو مقامات پر بیک وقت کام شروع کیا گیا۔ قسطنطین نے حکم دیا کہ ایلیا کی بڑی گلی، کارڈو میکسی مس کے ساتھ گلگتا کے مبینہ مقام سے چند گز مشرق کی طرف ایک عبادت گاہ تعمیر کی جائے۔ یہ منصوبہ نسبتاً سیدھا سادہ تھا چنانچہ تعمیر کا کام تیزی سے بغیر کسی مزاحمت کے شروع ہو گیا۔ لیکن دوسرا کام خاصا مشکل تھا۔ ایفرودیتی کا مندر گرایا جانا تھا۔ معاون چبوترے کو مسمار کیا جانا تھا پھر اس کے نیچے زمین کی کھدائی کا مرحلہ آنا تھا۔ اس بھاری بھرکم کام کی دوہری مذہبی نوعیت تھی۔

پہلی یہ کی عیسائی کافر شہر کے نیچے اپنے عقائد کی جڑیں تلاش کرنا چاہتے تھے۔ اذیت وابتلا کے برسوں میں بت پرست حکام کی ہلاکت آفرین نفرت نے عیسائیوں کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا کہ دنیا ان کے خلاف ہے۔ انہوں نے ایسا مذہب تشکیل دیا ہے جس کا تعلق اس دنیا سے نہیں۔ آسمان کے نیچے کوئی شہر ایسا نہیں جو انکے لئے وقف اور مقدس ہو۔ لیکن قسطنطین کی تخت نشینی کے بعد صورت حال ان کے حق میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اب انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ اس دنیا میں ان کا بھی کوئی سہارا ہے۔ مقدس آثار کی کھدائی کا کام ان کے ایمان واعتقاد کی خصوصی جڑیں دنیا کے سامنے لے آئے گا۔ اور ان قدیم بنیادوں پر وہ حقیقی معنوں میں اپنی عقیدت کی عمارت تعمیر کر سکیں گے۔ ایک نئی مسیحی شناخت متشکل ہونے کے مرحلہ میں تھی۔ لیکن اس منصوبے کا دوسرا پہلو زیادہ مثبت نہیں تھا۔ نئی عیسائیت کی تخلیق بت پرستی کو منہدم کرنے میں مضمر تھی۔ انہدام کے عمل کو تطہیر کا مذہبی رنگ دے دیا گیا۔ بت پرستی، آلائش تھی چنانچہ مندر کا آخری نشان تک معدوم کیا جانا تھا۔ مندر کی عمارت کا ملبہ شہر سے باہر کسی دور دراز مقام پر لے جانا تھا۔ کیونکہ یہ کافروں کی بت پرستی کی وجہ سے ناپاک ہو چکا تھا۔(12) عیسائیت کی نئی پیدائش تاریک خیالی کی بیخ کنی اور تباہی میں ملوث تھی جس کی کھدائی کا کام شروع ہوا تو میکاریوس اور اس کے ساتھیوں پہ کچھ برے لمحے بھی آئے۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں کچھ برآمد کرنا ہے۔ عظیم دریافت کا مرحلہ آنے میں دو سال لگ گئے۔ پرانے مندر کے چبوترے کے نیچے ایک مقبرہ نمودار ہوا۔ فوراً اعلان کر دیا گیا کہ یہ یسوع مسیح کا مدفن ہے۔ یوزیبئس اگرچہ اس معاملے میں شکوک وشبہات رکھتا تھا لیکن اس نے بھی کسی تشکیک کا اظہار نہ کیا۔ اس دریافت کے لئے عیسائی برادری بہت بے چین تھی اور جو کچھ برآمد ہوا اس نے مسیحی دنیا کو ششدر کر دیا۔ یوزیبئس اس واقعے کو ''توقعات کے خلاف'' بیان کرتا ہے۔(13) قسطنطین نے بھی محسوس کیا کہ یہ حیرت سے بھی آگے کی کیفیت ہے ۔۔۔ تین سو سال پہلے جس چٹانی مدفن میں یسوع مسیح دوبارہ جی اٹھا تھا۔۔۔ وہ چٹانی مدفن ۔۔۔ خود اب زندہ ہو گیا تھا۔ عیسائیوں کی مذہبی

جذباتیت عروج پر تھی۔ان کا عقیدہ مجسم صورت میں سامنے تھا۔انکا ایمان زندہ وتوانا ہوگیا۔

چٹانی مدفن ایک قدیم مجر یا کان سنگ میں پایا گیا جو ہیڈریان کے دور کی تعمیرات کے دوران زیرزمین آ گیا تھا۔ اب اسے آس پاس کی پہاڑیوں سے اس طرح الگ کرنا تھا کہ غار کے گرد چٹانی ملبہ بھی موجود رہے۔پھر اس کے گرد دائرہ میں 38 گز قطر کے قریب جگہ صاف کرنا تھی تا کہ شہنشاہ کی خواہش کے مطابق وہاں ایک گول یادگار بنائی جا سکے۔اس کے لئے 16500 کیوبک فٹ چٹان کی اینٹیں تراشی جانا تھیں۔مدور یادگار کے لئے اناستاسیس یعنی ''حیات نو'' کا نام تجویز کیا گیا۔یہ ایک بڑا پراجیکٹ تھا جو قسطنطین کی موت کے ایک عرصہ بعد بھی مکمل نہ ہوسکا۔کئی سال تک چٹان پر مشتمل یہ قبر جو دراصل کسی چٹانی چھجے کا ایک بہت بڑا بلاک تھی کھلے آسمان تلے پڑی رہی۔اس دوران یادگار کے لئے زمین ہموار کی گئی۔

جب حضرت عیسیٰ کا مدفن دریافت ہوا۔انہی دنوں کھدائی کا کام کرنے والے کچھ لوگوں نے ایک اور ٹیلا نما پتھر کا ستون بھی دریافت کیا جسے گلگتا کے چٹانی ٹیلے کی حیثیت سے شناخت کرلیا گیا۔پتھر کا یہ بہت بڑا ٹکڑا جس قدر بھی بچ رہا، گلگتا کے گرجا میں محفوظ کرلیا گیا۔آج کل اسے دیکھ کر اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ اس کی اصل ہیئت کیا رہی ہوگی۔لیکن 1961ء میں کی جانے والی کھدائی میں ملنے والے آثار قدیمہ سے ماہرین نے قیاس آرائی کی ہے کہ گلگتا کی پہاڑی پر پڑا یہ پتھر ایک عمودی بلاک تھا۔اس کی لمبائی تقریباً دس میٹر تھی۔قسطنطین کے زمانے میں بھی یہ کھدائی کے دوران ایستادہ حالت میں تھا۔پتھر کا یہ ستون قدیم قبروں کے مخصوص شناختی اور یادگاری پتھروں جیسا ہے جو وادی قدرون سے ملے تھے۔اس کے نچلے حصہ میں غار نما شگاف تھا جو حضرت عیسیٰ کے زمانے سے پہلے قبر کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہوگا۔حضرت عیسیٰ کو جن دنوں مصلوب کیا گیا،اس زمانے میں ایستادہ پتھر کے اردگرد مٹی جمع ہوکر ٹیلے کی شکل اختیار کرچکی تھی۔اس ٹیلے میں سے پتھر کا کچھ حصہ اس طرح باہر نکل آیا تھا کہ دیکھنے میں کھوپڑی کی طرح نظر آتا تھا۔اسی لئے اس پہاڑی کا نام گلگتا،یعنی کھوپڑی والی جگہ پڑ گیا۔

یوں قسطنطین کے دور میں ہونے والی کھدائی ایک کی بجائے دو مقدس مقامات سرعام پر لانے کا ذریعہ بن گئی۔ ان میں سے ایک وہ پہاڑی تھی جہاں حضرت عیسیٰ کو مصلوب کیا گیا اور دوسرا وہ مقام چٹانی قبر سمیت جہاں انہیں دفن کیا گیا۔ اس دوران قسطنطین کا عبادت خانہ بھی تکمیل کے قریب تھا۔قسطنطین اسے دنیا کا خوبصورت ترین چرچ بنانا چاہتا تھا۔اس مقصد کے لئے اخراجات کو خاطر میں نہ لایا گیا اور مشرقی صوبوں کے تمام گورنروں کو ضروری اخراجات پورے کرنے کے لئے بڑی بڑی رقوم فراہم کرنے کے احکامات جاری کردیئے گئے۔جگہ کم تھی چنانچہ یہ باسیلیق یعنی گرجا بہت چھوٹا تھا۔یہ 44x30 رقبہ سے زیادہ بڑا نہ تھا۔اس کے پانچ حصے تھے ان میں سے ایک میں گلگتا کی چٹان تھی۔مدفن کے قریب مغرب میں یہ نیم قوسی اور محراب دار طاق کی شکل میں اس کا آخری حصہ تھا۔یوزیبئس ہی اس زمانے کا ایک ایسا مورخ ہے جس کی تحریروں میں باسلیق کا ذکر ملتا ہے۔اس کا کہنا ہے کہ یہ باسلیق حیرت انگیز حد تک خوبصورت تھا۔اس کی دیواروں پر اندر

اور باہر سنگ مرمر اور چمکدار پتھر چسپاں تھے۔ اندرونی حصہ منقش تختیوں اور پچی کاری سے مزین تھا۔ چمکدار سونے کی پتیوں سے آراستہ باسلیق پر دھوپ کی کرنیں پڑتیں تو ماحول جگمگا اٹھتا۔(14) قسطنطین کے باسلیق کو سینٹ قسطنطین کا مشہد کہا گیا کیونکہ یہ مسیح کی حیات نو کا گواہ اور اس کی ایک نشانی تھا۔

MAP (نقشہ)

قسطنطین کے مشہد کے مقام پر آج کل ایک خوبصورت چرچ موجود ہے جس میں گلگتا کی باقیات محفوظ ہیں۔ گلگتا کی دریافت ''مصلوب مسیح'' کو عیسائیوں کے سامنے ایک نئے انداز میں لائی تھی۔

یہ ایک پیچیدہ عمارت تھی جو عبادت گزاروں کو یہودیوں کے سابقہ معبد کی طرح مرحلہ وار مدفن تک لے جاتی جو اب مقدسوں کا مقدس تھی۔ زائرین اس مشہد میں میکسی مس کی طرف سے داخل ہوتے جو کافر ایلیا شہر کے مرکز میں بڑی گلی تھی۔ اس کے تین دروازے نیم وا رکھے گئے تھے تا کہ گزرنے والے لوگ باسلیق کی داخلی زیب و زینت دیکھ کر اندر داخل ہونے پر مجبور ہو جائیں۔ داخل ہونے والے فرد کو باسلیق کی اصل عمارت تک پہنچنے کے لئے ایک صحن سے گزرنا پڑتا تھا جو دہلیز سے ایک زینہ اونچا تھا۔ باسلیق کے تمام مغربی دروازے ایک بڑے صحن میں کھلتے تھے جو قبر کے سامنے تھا۔ یہ صحن زائرین کی ایک بڑی تعداد کو سمیٹ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک باغ لگوایا گیا جو اس باغ کی یاد میں تھا۔ جہاں عورتوں نے سب سے پہلے مسیح کو دوبارہ جی اٹھنے کے بعد دیکھا تھا۔ قسطنطین نے رومن ایلیا کے مرکز میں باسلیق بنا کر اسے عیسائیوں کا ایک مقدس مقام بنا دیا تھا۔ اس نے ایلیا کے فورم کے ساتھ ایک نیا یروشلم تعمیر کر دیا تھا۔ اس طرح قسطنطین نے نئے مذہب کو اپنی سلطنت میں مرکزیت دینے کا عندیہ دے دیا۔ عیسائی تصورات کو نئی پرواز مل گئی۔ حضرت عیسیٰ کا مدفن دریافت ہونے اور دلکش باسلیق مکمل ہونے پر عیسائیوں نے اس مقام کے بارے میں اپنی نئی اساطیر تخلیق کر لیں۔ یہ اساطیر مقدس مقام کے بارے میں تھیں جو ان کی روحانیت کا قلب تھا۔ انہوں نے پرانی یہودی روایات کو نئے عقائد میں ڈھال لیا۔ وہ دعوی کرنے لگے کہ حضرت آدم کو گلگتا میں دفن کیا گیا تھا۔ پھر انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ حضرت ابراہیم نے اسی مقام پر حضرت اسحاق کو قربان کرنے لئے باندھا تھا۔ اس نئے مسیحی مقدس مقام سے اسی طرح کی عقیدت وابستہ ہو گئی جو پرانے یہودی معبد سے بنی اسرائیل کی تھی۔ یہ ایک علامتی مرکز بن گیا جہاں خداوند بنی نوع انسان سے ایک منفرد انداز میں رابطہ

کرتا تھا۔ یہ انسانیت کے لئے ایک نئے آغاز کی نمائندگی کرتا تھا جو حضرت ابراہیم کے مذہب کی تکمیل اور تاریخ میں ایک نیا دور تھا۔

MAP (نقشہ)

گرجا حیات نو (اناستاسیس)

اس کے باوجود عیسائی سمجھتے تھے کہ وہ اس انداز کے مذہب سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔ وہ انتہائی فخر کے ساتھ دعوی کرتے تھے کہ ان کا مذہب خالصتاً روحانی ہے۔ جس کا انحصار معبدوں اور مقدس مقامات پر نہیں ہے۔ مدفن کی دریافت پر ان کا حیرت انگیز مثبت ردعمل ظاہر کرتا تھا کہ مقدس مقامات سے جذباتی وابستگی انسانی نفسیات میں گہری جڑیں رکھتی ہے۔ ہماری عقیدت کے مراکز سے متعلق کوئی اچانک صدمہ یا غیر متوقع خوشخبری ان مراکز کے لئے ہمارے جذبات کو بیدار کر دیتی ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب لوگ دور ابتلا سے گزر رہے ہوں اور ان کی اپنی بقا کو خطرہ لاحق رہا ہو تو یہ جذبات شدت سے ابھر آتے ہیں۔ آج اکیسویں صدی کے سائنسی اور سیکولر دور میں رہتے ہوئے بھی ہم دعویٰ نہیں کر سکتے کہ انسان اس ضعیف الاعتقادی سے نجات پا چکا ہے۔ اس کی شہادت آج بھی ہمیں یروشلم میں ملتی ہے۔

عیسائیوں نے جب حجرت عیسیٰ کی قبر کو دیکھا تو اپنی شناخت کے احساس نے انہیں پہلی بار کسی مادی مقام میں اپنی جڑیں پیوست کرنے پر مجبور کر دیا۔ ماضی کے ساتھ اوتوانائی بخشنے والے تعلق نے انہیں رومن ایلیا کے مرکز میں کھڑا ہونے کے قابل بنا دیا۔ اب وہ کنارے سے لگے لوگ نہیں زندگی کے بھرپور دھارے میں شامل ایک قوم تھے۔ ایک قوم کی حیثیت سے انہیں درپیش تند و تیز خطرہ دور ہو گیا تھا۔

اس تمام تر تصور کا مخالف اگر کوئی فرد ہو سکتا تھا تو وہ یوزیبئس تھا۔ لیکن قبر کی دریافت نے غالباً اس کی ذات کی گہرائیوں کو چھو لیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے سابقہ خیالات پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اب وہ چونکہ قسطنطین کے حامیوں میں شامل ہو چکا تھا چنانچہ ان حیرت انگیز واقعات کی توجیہ و توضیح کا فریضہ اسے سونپا گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ جب وہ ان قدیم آثار کے اثرات بیان کرنا چاہتا ہے تو اساطیری زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جسے وہ ترک کر چکا ہے۔ ان باتوں کی اہمیت کا اظہار عقل و شعور اور منطق کی اصطلاحوں سے نہیں کیا جا سکتا تھا بلکہ ان قدیم تشبیہات کے مطابق ہی ہو سکتا تھا جو دل و دماغ کی گہرائیوں کی ترجمان ہوتی ہیں۔ یسوع مسیح کی قبر کا مقبرہ، رویت الٰہی تھی۔ ایک تصوراتی بات، مجسم صورت میں۔۔۔ جو

ماضی میں مخفی اور نا قابل رسائی تھی۔ اس نے حضرت عیسیٰ کے معجزہ حیات نو کو پھر سے پیش کر دیا تھا۔ اب یہ معجزہ یوزیبئس کے نزدیک تاریکی کی قوتوں پر راستی کے نور کی فتح کی بات تھی جو روایتی دیومالا میں تصادم کی کہانیوں سے مختلف تھی۔ مقدس غار کو وہ مقام و مرتبہ ملا جو اس کی حیات نو تقاضا کرتی تھی۔ یوزیبئس سرکاری دستاویز ''لائف آف کانسٹائن'' میں لکھتا ہے:

''مقدس غار تاریکیوں میں اتر جانے کے بعد پھر سے روشنی میں آ گئی اور ان لوگوں کو عجائبات کی تاریخ کی ایک واضح بصیرت دے گئی جو اسے سمجھنے سے قاصر تھے۔ ایفرودتی کے مندر کا نہدام برائی کی قوتوں پر خیر کی فتح تھی کیونکہ یہ ایک ناپاک عفریت کا بسیرا تھا، جسے لوگ ایفرودتی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ یہ ایک بے جان بت کا تاریک مندر تھا۔ جہاں نفرت انگیز باتوں پر عمل ہوتا تھا۔ گندے اور ناجائز نذرانے ملحد اور ملعون قربان گاہ پر پیش کئے جاتے تھے۔ لیکن خدا کے نور نے لوگوں کے دل منور کر دیئے۔ اسی نور نے قسطنطین کو آلائیشیں دور کرنے کی سعادت دی۔ جونہی خدا کا حکم ہوا، مکر وفریب کی عمارت زمیں بوس ہوگئی۔ گناہوں، بتوں اور شیطانوں کی رہائش گاہیں نیست و نابود ہوگئیں۔''(16) حضرت عیسیٰؑ کے مدفن نے تمام تر مسیحی تجربہ ایک بار پھر زندہ کر دیا تھا کیونکہ اس کی بازیافت بیک وقت ایک کشف، ایک حیات نو اور روشنی کی قوتوں کی ایک فتح تھی۔ اب یوزیبئس حیات نو کے معجزہ کو نسبتاً دھیمی اصطلاحوں میں دیکھتا ہے۔ اب وہ اس واقعہ کو ایتھانا سیئس کے عقائد کی روشنی میں کچھ ڈرامائی قرار دینے لگا۔

یوزیبئس کو گلگتا کے پتھر میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ لیکن حال ہی میں منظر عام پر آنے والی غار (قبر) نے اسے زبردست متاثر کیا۔ وہ اس کے الگ تھلگ وجود کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ یہ غار اس بڑے پتھر میں تھی جو ہموار زمین میں اکیلا اور ایستادہ کھڑا تھا۔ حیران کن حقیقت یہ تھی کہ وہاں کوئی اور پتھر یا چیز نصب نہیں تھی۔ (17) یہ یسوع مسیح کی فتح کی انفرادیت کی علامت اور نقش تھا۔ جب یوزیبئس نے قبر کو غور سے دیکھا تو مسیح کی زندگی ایک نئے انداز میں اس کے سامنے آ گئی۔ اگر ہم کسی مقام کو ایک خاص نکتہ نظر سے دیکھنے کے قابل نہ ہوں تو وہاں جو کچھ رونما ہو چکا ہو پوری تفصیل کے ساتھ تصور میں نہیں آ سکتا۔ ایسے مقام کو دیکھنا جو ماضی اور حال کو مربوط کرتا ہو، محض سنی سنائی بات کے تاثر سے مختلف ہوتا ہے۔ یوزیبئس تسلیم کرتا ہے کہ ''قبر کا منظر لفظوں سے زیادہ موثر انداز میں بولتا ہے۔''(18) دوسرے عیسائیوں کی نظر میں قبر کی بازیافت نے ایتھانا سیئس کے عقائد کو مجسم کر دیا تھا۔ یسوع مسیح کے انسانی جسم کے ذریعے خدا کو دیکھنے کی بجائے، جیسا کہ یوزیبئس مشورہ دیا کرتا تھا، وہ اس انسان سے تعلق رکھنے والی چیزوں کو دیکھنا اور چھونا چاہتے تھے اس طرح انہیں یسوع مسیح زمین کے ساتھ خدا کے رابطے کی ایک طاقتور علامت نظر آتا تھا۔

یوزیبئس نے اپنے عقائد و خیالات سے پوری طرح پسپائی اختیار نہیں کی تھی۔ وہ بدستور شہر کو ایلیا کہتا رہا: ''اس کافر شہر میں کچھ بھی مقدس نہیں۔'' وہ یروشلم کا نام صرف حضرت عیسیٰ کی قبر اور مغربی پہاڑی پر قسطنطین کی نئی عمارت کو دیتا تھا۔ بقیہ تمام شہر اس کی نظر میں پلیے کی طرح ملعون اور مجرم تھا۔(19) یوزیبئس، قسطنطین کی عمارت کو اس لئے یروشلم کہتا تھا

کہ یہ قدامت کے خلاف تعمیر کی گئی تھی۔ یہ پرانے یہودی شہر سے بالکل مختلف تھی جس نے یسوع کو مسترد کر دیا تھا۔20)
نئے یروشلم نے عیسائیوں کو ایک ایسا برتر مقام دیا تھا جو یہودیوں کی شکست کا اعلان تھا۔مغربی پہاڑی کے سب سے اونچے مقام پر قائم یہ عمارت یہودیوں کے مسمار شدہ معبد کے پہاڑ کے سامنے سینہ تانے پروقار انداز میں کھڑی تھی۔ یہ نئے مذہب کی حیات نو کی خوبصورت مثال تھی جواب شہنشاہ کی حمایت رکھتا تھا جب کہ یہودیوں کا مذہب ایلیا کے نقشہ سے غائب ہو چکا تھا۔ نیا یروشلم اپنے پیشرو مکینوں کے اسلوب کے برعکس بنا تھا۔اس حد تک نئے یروشلم کے قیام نے یوزیبئس کے پرانے خیالات کو تقویت دی تھی۔عیسائیت اب اس قابل تھی کہ اس کے پیروکار روپوشی سے نکل آئیں اور اپنے مذہب کی جڑیں انسانوں کی دنیا میں گہری کر دیں۔اب یہ اس قابل تھی کہ شاہی سلطنت کے دوسرے اداروں کے شانہ بشانہ کھڑی ہو اور اپنی نئی اور مکمل شناخت سے لطف اندوز ہو سکے۔ نیا یروشلم اس عمل کا ایک اہم حصہ تھا۔لیکن عیسائیت کی ذات کا انحصار پرانی مذہبی روایات کے انہدام پر تھا۔اس کا اظہار اب ایلیا میں شروع ہو چکا تھا نئے یروشلم کی تعمیر پر نئے شہر کی مزہبی روایات کی نفی تھی۔اس کے قیام نے ملحدانہ مذہب کی بیخ کنی اور یہودیت کے خلاف توہین آمیز برتری حاصل کی تھی۔عیسائی اس بات کو یقینی بنا سکتے تھے کہ ان کے دور اقتدار میں یہودیوں کو یروشلم میں رہنے کی اجازت نہ ملے یہودیوں کی الہامی کتابوں پر پابندی برقرار رہی۔عیسائی اب جبر واستبداد سے آزاد تھے لیکن وہ ابھی تک مدافعانہ رویہ اپنائے ہوئے تھے۔اذیت رسانی اپنے شکار کو کبھی کسی رحم و ہمدردی کے قابل نہیں سمجھتی۔ نئے یروشلم کی ابتدا کے ساتھ ہی دوسرے مذاہب کے لوگوں کے اخراج اور انہیں بدنام کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا تھا جو حضرت عیسیٰ کی رحم ومروت کی اخلاقیات سے بہت دور تھا۔

چنانچہ یوزیبئس مسلسل ازیلیا کو یہودیت اور بت پرستی کے اثرات سے آلودہ دیکھتا رہا۔وہ نئے مقدس مقامات کو بھی نظر انداز کرتا رہا۔اس کی کوشش تھی کہ کوہ زیہون پر بنے ان مقامات کو شہنشاہ کی طرف سے مالی امداد نہ ملے۔ یہ مقامات اس کے حریف میکاریوس کے لئے نہایت اہم تھے۔میکاریوس نے ایلیا کے بشپ کی حیثیت سے قبر کی بازیافت کے لئے جو پیش رفت کی تھی،اس نے اس کے وقار میں اضافہ کر دیا تھا۔لیکن بعد کے برسوں میں یوزیبئس یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ ''اس کے'' عقائد فلسطین کی مسیحیت سے بھی جھلکتے ہیں۔ پھر یوٹروپیا،قسطنطین کی ساس نے جب ملک کا دورہ کیا تو یوزیبئس کو اعزاز بخشا گیا کہ وہ اسے مقدس مقامات دکھائے۔حبرون کے قریب ممرے میں پہنچنے پر اس نے یوٹروپیا کو نشاندہی کی کہ یہ مقام جہاں حضرت ابراہیمؑ کو رویت خدا ہوئی،اب مشکوک قسم کی عبادت سے آلودہ کیا جا رہا ہے۔ یوشینئس حضرت ابراہیم کو بہت اہمیت دیتا تھا اور اس تہوار سے بہت خوفزدہ رہتا تھا جس میں یہودی،عیسائی اور بت پرست حضرت ابراہیم سے منسوب شاہ بلوط کے مقدس مقام پر ان کی یاد مناتے تھے۔ ہر سال لوگ فلسطین،فونیقیہ،اور عرب کے مختلف شہروں سے وہاں آتے۔سالانہ میلہ منعقد ہوتا اور ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا جاتا۔اس میں سب لوگ مالی معاونت کرتے۔اس موقعہ پر یہوی اور عیسائی خدا کی عبادت کرتے جبکہ بت پرست زیوس اولمپئس کی پرستش کرتے جوان کے

نزدیک سب سے بڑا دیوتا تھا۔ یہودی اور عیسائی فرشتوں کو پکارتے، شراب کے چند قطرے نذرانے کے طور پر زمین پہ گراتے اور عود و لوبان سلگاتے۔ بت پرست کوئی بیل یا بھیڑ کی قربانی پیش کرتے۔ لوگ اس تہوار پر بہترین لباس پہنتے۔ اس موقعہ پر کوئی عیاشی اور بدکاری نہ ہوتی تھی۔ لیکن یوزیبئس کو اس بین الاقوامی اجتماع سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کیونکہ وہ اسے مذہب کو ناپاک کرنے کی ایک صورت سمجھتا تھا اس نے یوٹروپیا سے یہ یقین دہانی حاصل کر لی کہ وہ قسطنطین کو اس تہوار کے بارے میں اس طرح بتائے کہ میکاریوس کے لیے مشکلات پیدا ہو جائیں۔ چونکہ ممرے، میکاریوس کے دائرہ اثر میں تھا چنانچہ قسطنطین نے اسے ایک سخت قسم کا خط لکھا اور تہوار میں آلودگیوں کی اجازت دینے پر سرزنش کی۔ خط ظاہر کرتا ہے کہ قسطنطین، یوزیبئس کے خیالات کو قبول کر چکا تھا۔ ممرے ہی وہ مقام تھا جہاں کلام مجسم کا مذہب شروع ہوا تھا۔ یہیں مقدس قانون کی اطاعت کی ابتدا ہوئی تھی۔ یہیں خدا اپنے دو فرشتوں کے ساتھ حضرت ابراہیم پر ظاہر ہوا تھا۔(21) ایک نیا باسلیق حضرت ابراہیم کی قربان گاہ بلوط کے درخت اور کنوئیں کے ساتھ شہنشاہ نے تعمیر کرایا۔ یوزیبئس نے اس اقدام کی بہت تعریف کی۔

قسطنطین بذات خود فلسطین کا دورہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن آرین تنازعہ کی مسلسل جاری شوریدہ سری نے اسے روکے رکھا اور وہ قسطنطنیہ میں ہی الجھا رہا۔ چنانچہ اپنی جگہ اس نے اپنی ماں ملکہ ہیلنا آگستا کو فلسطین بھجوا دیا۔ ہیلنا کی مقدس سرزمین کی زیارت کو مسیحی حلقے ذاتی عقیدت قرار دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ 326ء میں اس کا مشرقی صوبوں کا دورہ ایک سرکاری معاملہ تھا۔ اس دورے کا اختتام یروشلم میں نہایت شان و شوکت کے ساتھ ہوا۔ ہیڈریان کی طرح قسطنطین بھی شاہی ارکان کے ان دوروں کو رومی سلطنت کے استحکام کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ معمر ملکہ اور اس کے پرشکوہ مصاحبین کا عیسائیوں کے مقدس مقامات پر عبادت کرنا، قسطنطین کے مسیحی روم کا طاقتور اظہار تھا۔ ہیڈریان نے اپنے دوروں کے دوران مندر، پانی کی نالیاں اور سٹیڈیم تعمیر کروائے تھے۔ ایلیا کاپی ٹولینا بھی فسلطین کے عوام کے لیے ہیڈریان کا ایک تحفہ تھا۔ اب ہیلنا نے عوام کو نئے چرچ عطیہ کئے وہ حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کی قبر کی بازیافت کے لیے کھدائی اور ''حیات نو'' یادگار کی تعمیر کے دنوں میں وہاں آئی تھی۔ غالباً وہ 327ء میں بھی وہاں موجود تھی جب قبر برآمد ہوئی۔ ایک بار پھر یوزیبئس کو ہی فلسطین میں ہیلنا کی رہنمائی کا فریضہ سونپا گیا تھا۔ یقیناً اسی نے ملکہ کو دو نئے چرچ تعمیر کرنے کے لیے موزوں مقامات کی نشاندہی کی ہوگی۔ وہ دو مقامات کے لیے ہمیشہ بہت جذباتی رہتا تھا۔ ان میں سے ایک بیت لحم جہاں حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے تھے اور دوسرا کوہ زیتون جہاں سے وہ آسمانوں پہ اٹھائے گئے۔ ہیلنا خود بھی آرین جماعت سے ہمدردی رکھتی تھی۔ چنانچہ یوزیبئس کے عقائد و خیالات پر مثبت ردعمل کا مظاہرہ کرتی رہی۔ ملکہ نے ان دونوں مقامات پر چرچ بنانے کا حکم دے دیا۔ یوزیبئس یقیناً بیت لحم میں چرچ (باسلیق) کے قیام پر بہت خوش ہوا ہوگا۔ قریبی علاقے میں ایک نیا باسلیق عیسائیوں کی توجہ ایلیا اور نئے یروشلم سے اپنی طرف مرکوز کرا سکتا تھا۔ کوہ زیتون پر بنائے جانے والے نئے باسلیق کو ایلیونا کہا

گیا۔ چوٹی سے ستر میٹر کے فاصلہ پر یہ شہر کا ایک شاندار منظر پیش کرتا تھا۔ مغربی پہاڑی پر قسطنطین کی یادگار عمارت کی طرح ایلیونا اور بیت لحم کے باسلیق بھی اصل مقدس مقامات سے ہٹ کر بنائے گئے تھے۔ کوہ زیتون پر (ایلیونا) باسلیق سے سیڑھیاں مقدس غار میں اترتی تھیں تا کہ زائرین عبادت گزاروں کو پریشان کئے بغیر زیارت کے لیے نیچے جاسکیں۔ اس عمارت میں بھی طرز تعمیر درجہ بدرجہ تقدیس کے مرحلے پیش کرتا تھا تا کہ زائرین کو مقدس ترین مقام تک پہنچنے سے پہلے ذہنی طور پر تیار ہونے کا وقت مل جائے۔

ہیلنا کا دورہ بہت جلد ایک افسانے کا روپ دھار گیا۔ پانچویں صدی کے وسط میں عیسائی برادری نے پورے وثوق کے ساتھ کہنا شروع کر دیا کہ قسطنطین اور میکاریوس کی بجائے سچی عقیدت مند ہیلنا نے گلگتا کی کھدائی کے کام کی سرپرستی اور نگرانی کی۔ یہ بھی کہا گیا کہ اسی نے خواب میں دیکھا کہ کیلوری کی پہاڑی میں وہ صلیب دفن ہے جس پر حضرت عیسیٰ کو مصلوب کیا گیا۔ چنانچہ اس پہاڑی کی کھدائی کر کے وہ صلیب برآمد کر لی گئی اور پھر یروشلم کے چرچ میں رکھی گئی۔ لیکن یوزیبئس ملکہ ہیلنا کے دورہ فلسطین کا ذکر کرتے ہوئے اصل صلیب کی بازیافت کا کوئی واقعہ بیان نہیں کرتا۔ اس دور کا کوئی بھی مورخ ایسا ذکر نہیں کرتا۔ لیکن 390ء میں صلیب یروشلم کے باسلیق کا حصہ تھی۔ پھر اس کے ٹکڑے کر کے تمام مسیحی دنیا میں تقسیم کر دیئے گئے۔ یہ یقیناً 325 سے 327ء کے برسوں کے درمیان برآمد ہوئی تھی اور اس واقعہ میں ہیلنا کا موجود ہونا، ناممکن نہیں۔ چوتھی صدی عیسوی کے اوائل میں عیسائی حلقے حضرت عیسیٰ کو مصلوب کئے جانے کے واقعہ کو بذات خود کوئی ممتاز وقوعہ نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اسے حیات نو کے واقعہ کا ایک ضروری حصہ قرار دیتے تھے۔ حضرت عیسیٰ کی موت اور پھر قبر (غار) میں زندہ ہو جانا، ایک ہی واقعہ کے دو پہلو سمجھے جاتے تھے۔ لیکن یروشلم میں عبادت کے تجربے نے عیسائیوں کو مسیح کے مصلوب ہونے کے واقعہ پر مختلف انداز میں توجہ دینے کی تحریک دی۔ چنانچہ ہم اگلے باب میں دیکھیں گے کہ مسیح کی اذیت ناک موت عیسائیوں کے تصورات میں سرفہرست آ گئی۔ چنانچہ لوگ قبر کی دریافت کو بول گئے اور ہیلنا کی افسانوی صلیب کی دریافت اہم ہوگئی۔

گلگتا کی کھدائی سے پہلے عیسائیوں کے ہاں یروشلم کی زیارت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا تھا۔ لیکن جب قبر منظر عام پر آ گئی تو رومی سلطنت کے تمام حصوں سے یہاں تک کہ مغرب کے دور دراز علاقوں سے زائرین یروشلم کا رخ کرنے لگے اس مقصد کے لیے اختیار کئے جانے والے ایک سفر کا احوال بورڈیاکس نے قلمبند کیا ہے۔ جسے ''زائر کا سفر نامہ'' کہا جاتا ہے اس نے 333ء میں یہ سفر یورپ سے شروع کیا اور عسکری مقاصد کے لیے بنائی گئی شاہراہوں پر آسانی سے چلتا ہوا قسطنطینہ سے یروشلم پہنچ گیا۔ زیارتیں ہمیشہ زائرین کو حیرت انگیز روحانی تجربے سے ہمکنار کرتی ہیں لیکن مذکورہ زائر اس طرح کی روحانی کیفیت کا اظہار بہت کم کرتا ہے۔ اس کا سفر نامہ بائبل میں درج مقامات اور ان سے وابستہ واقعات کی محض ایک کیٹلاگ ہے۔ یہ زائر افتاں وخیزاں آگے بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس نے کہیں رک کر عظیم مذہبی و تاریخی مقامات کا

جائزہ نہیں لیا۔ان سے وابستہ واقعات کے اثرات ونتائج سے اپنے جذباتی تعلق کا اظہار نہیں کیا۔اس کے رہنما یقیناً یہودی ہوں گے کیونکہ وہ جن مقامات کا ذکر کرتا ہے۔وہ عہد نامہ قدیم سے تعلق رکھتے ہیں۔اسی طرح وہ جن واقعات کا ذکر کرتا ہے وہ صرف یہودی روایات میں پائے جاتے ہیں۔زیارت ابھی تک عیسائیوں میں ایک اہم مذہبی فریضہ تصور کیا جاتا ہے۔ ابتدائی زائرین غالباً حضرت عیسیٰؑ کی ارضی زندگی کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے چنانچہ ان سے وابستہ مقامات بھی ان کی ترجیح نہیں ہوتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ مذکورہ زائر گلیلی ، ناصرت، اور کفرنحوم کی طرف جانے کی زحمت نہیں کرتا۔وہ براہ راست یروشلم کا رخ کرتا ہے اور سب سے پہلے معبد کے پہاڑ (کوہ صیہون) پر جاتا ہے اور وہاں رک کر صرف یہ دیکھتا ہے کہ کافروں کی مذہبی رسوم ابھی تک بیت حصدا کے تالاب پر جاری ہیں۔

70ء کے بعد معبد کے پہاڑ کا ذکر پہلی دفعہ یہی زائر کرتا ہے۔زائر کا سفر نامہ بتاتا ہے کہ صدیوں کی مسافت نے اس مقام کو بھوتوں کا بسیرا اور مزید ناپاک بنا دیا ہے۔زائر کا کہنا ہے کہ یہاں ایک زمین دوز حجرہ ہے جس میں مبینہ طور پر (حضرت) سلیمانؑ شیطانوں کو سزا دیا کرتے تھے۔معبد کی اصل جگہ پر (حضرت) زکریاؑ کے خون کے دھبے موجود ہیں۔ انہیں بادشاہ یواس نے قتل کرادیا تھا۔(22) یہودی سپاہیوں نے ناخنوں سے جو نشانات کندہ کئے وہ ابھی تک دیکھے جاسکتے ہیں۔معبد کا ویران چبوترہ عیسائیوں کے ذہن میں یہودی قوم کے تشدد اور الحاد کی یاد تازہ کر دیتا تھا۔زائر یہودیوں کی سوگ کی رسوم کا بھی ذکر کرتا ہے جو اس زمانے میں بھی ماہ ایو کے نویں روز ادا کی جاتی تھیں۔اس کا کہنا ہے کہ ہیڈریان کے دو مجسموں کے قریب ہی ایک سوراخ دار پتھر ہے۔یہودی ہر سال وہاں آکر اسے تیل سے بپتسمہ دیتے ہیں، گریہ زاری اور ماتم کرتے ہیں، اپنے کپڑے پھاڑتے ہیں اور پھر رخصت ہو جاتے ہیں۔(23) زائر اکلوتا مورخ ہے جو اس پتھر کا ذکر کرتا ہے۔غالباً وہ اس چٹان کا ذکر کرتا ہے جو ہیرودیس کے چبوترے کے اوپر باہر کو نکلی ہوئی تھی اور جو آجکل مسلمانوں کے قبتہ الصخرہ میں ہے۔یہ وہی چٹان ہے جس کا ذکر بائبل میں تو موجود نہیں لیکن دیور کے سنگ بنیاد کی حیثیت سے اس کا ذکر ربی کیا کرتے تھے۔اگر یہ وہی چٹان نہیں تو پھر معبد کے ملبہ کا کوئی پتھر ہوگا جس کو ڈرامائی انداز میں استعمال کیا جاتا ہوگا۔یہ بھی ممکن ہے کہ زائر نے مذکورہ یہودی رسوم اپنی آنکھوں سے نہ دیکھی ہوں بلکہ سنی سنائی ایسی بات کا ذکر کر رہا ہو جو غلط معلومات کے ساتھ اسے بتائی گئی تھی۔

لیکن عیسائی اس مقام کا منظر اپنے تصورات کے مطابق تشکیل دے رہے تھے۔زائر چبوترے کے جنوب مشرقی کونے میں ابھی تک ایستادہ ایک برج یا مینار کا ذکر کرتا ہے جسے وہ ہیکل کے کنگرے کی حیثیت سے شناخت کرتا ہے۔اس کا کہنا ہے کہ اسی مقام پر شیطان نے یسوع مسیح کو ورغلانے کی کوشش کی تھی۔(24) اس برج میں ایک کمرہ تھا جس میں بیٹھ کر حضرت سلیمان نے کتاب دانش تحریر کی تھی اور پھر اسی مقام پر جیمز زادک کو شہید کیا گیا۔معبد کے پہاڑ سے زائر سلعوم کے تالاب کے پاس سے گزرتے ہوئے ایلیا کے مسیحی علاقے کی طرف جاتا ہے۔کوہ زیہون پر اسے کاہن کائفا کا گھر دکھایا

جاتا ہے۔ وہ ایک کنشت (صلوات) بھی دیکھتا ہے جو غالباً شہر سے باہر آباد یہودیوں کی عبادت گاہ تھا۔ ممکن ہے وہ ''بالا خانہ' کا ذکر کر رہا ہو۔(25) جب وہ اصل شہر میں داخل ہوتا ہے تو اسے وادی میں ایک کھنڈر نظر آتا ہے۔ اس کے خیال میں یہ وہی مقام ہے جہاں یسوع مسیح پر پیلاطس نے مقدمہ چلایا۔ پھر زائر گلگتا پہ پہنچتا ہے جہاں قسطنطین کا باسلیق ابھی تعمیر کے مرحلہ میں تھا۔ گلگتا کی چھوٹی پہاڑی جہاں یسوع کو مصلوب کیا گیا اور قبر (چٹانی غار) ابھی تک کھلے آسمان تلے تھیں۔(26) زائر نئے یروشلم کو دیکھ کر کسی قسم کی جذباتیت کا اظہار نہیں کرتا۔ سب سے زیادہ متاثر کرنے والی بات یہی ہے کہ زائر نے مقدس سرزمین تک پہنچنے کے لیے طویل سفر کیا۔ جو معلوم دنیا کے دور دراز گوشوں سے عیسائیوں کو کھینچ لانے والی مقناطیسیت بن رہی تھی۔

ستمبر 335ء میں گلگتا میں قسطنطین کا باسلیق بالآخر مکمل ہوا اور مشرقی صوبوں کے تمام تعلقوں کے بشپ ایلیا میں مدعو کیے گئے تا کہ ابتدائی رسم ادا کی جائے۔ اس رسم میں شرکت کے لیے اہم شاہی حکام بھی بلائے گئے۔ یہ ایک یادگار موقع تھا۔ 17 ستمبر کو قسطنطین قیصر روم کی تخت نشینی کی تیرہویں سالگرہ تھی۔ پہلی دفعہ یادگار (مشہد) اور اس کے صحنوں میں ممتاز زائرین جمع ہوئے۔ ایلیا میں اگرچہ عیسائی ابھی ایک چھوٹی سی اقلیت تھے۔ اور نیا یروشلم کا فر شہر میں ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا جبکہ تمام دیگر نئے مقدس مقامات شہر کی دیواروں سے باہر تھے لیکن مذہب کے نام وقف کرنے کی یہ رسم ایک شاہی کارروائی تھی۔ اب یہ بات غیر مبہم انداز میں سب کے سامنے آ گئی تھی کہ روم کا اگلا مذہب۔۔۔ عیسائیت ہوگا۔

یوزیبئس ان بہت سے بشپوں میں سے ایک تھا جنہوں نے اس روز تقاریر کیں۔ اس نے اس موقع کو بھی اپنے خیالات وعقائد کو فروغ دینے کے لیے استعمال کیا۔ بڑی چالاکی سے اس نے غیر حاضر شہنشاہ کو یقین دلایا کہ اس کی مسیحیت اس لیے نامکمل نہیں رہی کہ وہ یہاں آ نہیں سکا۔ خدا کی رحمتیں اس پر قسطنطنیہ میں بھی اسی طرح برسیں گی جس طرح آسانی سے نئے یروشلم میں برستی ہیں۔ اپنے خطاب میں یوزیبئس نے اصرار کے ساتھ کہا کہ کلام مجسم زمین پر اس لیے آیا کہ بنی نوع انسان کو مادی دنیا کی آلائشوں سے پاک کر دے۔ ایتھاناسیئس کو معزول کر کے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ یوزیبئس سمجھتا تھا کہ اس کی اعتدال پسند جماعت کامیاب ہوگئی ہے۔ قبر بلاشبہ ایک مقدس مقام تھا جو عیسائیوں کے لیے بے پناہ جذباتی کشش رکھتا تھا لیکن یوزیبئس کی خواہش تھی کہ اس مقدس مقام کی پرستش نہ شروع کر دی جائے۔ بلکہ عیسائی برادری ان ارضی نشانات کے پیچھے موجود روحانی حقیقت سے آگاہی حاصل کرے۔

یوزیبئس اب ایک معمر شخص تھا۔ عیسائیت اور یروشلم کے لیے اس کے نکتہ نظر کو صرف ان دنوں معتبر سمجھا جاتا تھا جب 313ء میں وہ قیصریہ کا بشپ تھا۔ لیکن اب عیسائی لوگوں کی زندگیاں بالکل تبدیل ہو چکی تھیں۔ ایک نئی نسل ان علاقوں میں پروان چڑھ چکی تھی جہاں عیسائیوں کو اب مزید زبردتوبیخ کا نشانہ نہیں بنایا جاتا تھا اور یسوع کی دوسری آمد کا انتظار نہیں کیا جاتا تھا۔ اب وہ رومن سلطنت میں مکمل تحفظ محسوس کرتے تھے۔ اس احساس نے مذہب کے لیے ان کے تصور و

ادراک کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا تھا۔ وہ اوپر کی چیزوں کے لیے لامتناہی تناؤ میں رہنے کی بجائے زمین پر خدا کو پانا چاہتے تھے۔ انہیں ازیتھانا سیئس کے عقیدہ تجسیم میں یوزیبئس کی مکمل روحانیت کے برعکس زیادہ کشش محسوس ہوتی تھی۔ اگرچہ کچھ لوگ اب بھی آرائیس اور یوزیبئس کی عیسائیت کو پسند کرتے تھے لیکن اکثریت واضح طور پر نیقیہ اعلامیہ کو دل و جان سے قبول کرتی تھی۔ جب 340ء میں یوزیبئیس کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ قیصریہ کا بشپ ایک پر جوش آرین بنا۔ ادھر ایلیا میں میکاریوس کی جگہ میکسی مس کو بشپ بنایا گیا تھا جو ایتھانا سیئس کا سرگرم پیروکار تھا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ کوہ زیہون پر بالا خانہ کے گرد ایک چرچ تعمیر کروایا۔ اس کام کے لیے میکسی مس کو سرکاری معاونت نہ ملی چنانچہ مقامی ذرائع سے عمارت تعمیر ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ نیا

باسلیق قسطنطین کے پرشکوہ باسلیق کے مقابلے میں ایک سادہ سی عمارت تھا۔ لیکن زیہون کا باسلیق بتدریج اہمیت اختیار کر گیا۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اس مقام پر یسوع مسیح نے حواریوں کے ساتھ آخری کھانا کھایا تھا۔ عشائے ربانی کی مقدس رسم قائم کی اور حیات نو کے بعد یہیں پر ظہور کیا۔ اور ان سب باتوں کے علاوہ اہم ترین واقعہ یہ تھا کہ حواریوں پر روح القدس کا نزول یہیں پر ہوا تھا۔ چنانچہ بالا خانہ کو کلیسیا کا مولد اور مادر کلیسیا کا درجہ دیا جانا ضروری خیال کیا گیا۔

یہ موقف دراصل سائرل کا تھا جو 349ء میں ایلیا کے بشپ کے مصب پر فائز ہوا۔ یروشلم کے لیے اپنی عقیدت کا اظہار وہ ہر وعظ میں کرتا تھا۔ وہ دعویٰ کیا کرتا تھا کہ عید فسح کو ضیافت کے موقع پر روح القدس یروشلم میں اترتی ہے اور بالا خانے کی کلیسیا کو سب چیزوں سے زیادہ اہمیت دیتی ہے۔(27) ایلیا کے بشپ فلسطین میں سب سے زیادہ اہمیت اپنے شہر کے کلیسیا کو دلوانے کے لیے فعال رہتے تھے۔ سائرل عیسائیوں کی نئی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ جب حضرت عیسیٰ کی قبر دریافت ہوئی تو وہ پانچ سال کا تھا۔ چنانچہ یروشلم کو ایک مقدس شہر کہنے میں اسے کوئی خرابی نظر نہیں آتی تھی۔ یسوع مسیح زمین پر اترا اور بیت لحم کے قریب اس نے انسانی پیکر اختیار کیا۔ گلگتا کے مقام پر اس نے دنیا کو نجات دلائی اور کوہ زیتون سے آسمان پر چلا گیا وہاں سے اس نے ''بالا خانہ'' میں حواریوں پہ روح القدس نازل کی۔ چنانچہ وہ شہر کیوں مقدس نہیں ہوسکتا جس نے دنیا کی نجات دیکھی؟ یسوع کو صلیب پر چڑھانے کی وجہ سے شہر کو مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ صلیب ذلت و رسوائی نہیں بلکہ یروشلم کا ''تاج'' اور ''جلال'' ہے۔(28) یوزیبئس نے ہمیشہ صلیب کو نظر انداز کیا تھا لیکن سائرل یسوع مسیح کی جسمانی موت کو اپنے نکتہ نظر سے ایک اہم واقعہ قرار دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ صلیب ہی نجات کی اساس، ہمارے ایمان کی بنیاد اور بدی کا انجام ہے۔ خدا نے معبد کو مسترد کیا تھا، شہر کو نہیں۔ اس نے یہودیوں کی مذمت کی تھی، یروشلم کی نہیں۔ یہ سوچ نئی اور مثبت تھی۔ اس میں قدیم استرداد اور مزمت تو موجود تھی لیکن اسے ایک نیا رنگ دے دیا گیا تھا۔ سائرل چونکہ یروشلم کو مجرم شہر نہیں سمجھتا تھا چنانچہ اس نے جرم کا بوجھ شہر سے اتار کر یہودیوں کے کندھوں پر ڈال دیا۔

یوزیبئس کے برعکس سائرل سمجھتا تھا کہ ''یسوع مسیح کا بشری وجود بذات خود ایک مذہبی اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ

اسے شمار نہ کرنا اور کلام مجسم کے روحانی جوہر کو تلاش کرنا غیر ضروری ہے۔ ایک انسانی جسم اختیار کر کے خدا نے بالا رادہ مستقل اور پر نوع انسانی سے یگانگت اور قرابت کا اظہار کیا۔ یسوع کی شبیہ ہمارے لیے خدا کی دائمی رغبت ہے۔ مادی دنیا کو مسترد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے ذریعے خدا کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح سائرل سمجھتا تھا کہ یروشلم کے مقدس مقامات عیسائیوں کو خدا سے رابطہ مہیا کر سکتے ہیں۔ اس نے شہر کو کبھی ایلیا کے نام سے نہیں پکارا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہی مقامات ہیں جہاں خدا نے ہماری زمین کو چھوا تھا۔ اب ان میں روحانی قوت موجود ہے۔ انہوں نے عیسائی برادری کو خدا سے مربوط کرنے کے لئے وقت اور فاصلے کی ان رکاوٹوں کو ختم کیا ہے جو ان کے اور یسوع مسیح کی زندگی کے درمیان پائی جاتی ہیں۔۔۔ سائرل اس بات پر زور دیا کرتا تھا کہ انسانی نجات کے واقعات اسی شہر میں رونما ہوتے تھے جس میں اب ہم رہتے ہیں۔(29) عید فسح کے موقع پر روح القدس کا نزول تین صدیاں پہلے کا واقعہ ہے لیکن ایک مفہوم میں یہ واقعہ ہمارے درمیان یروشلم میں رونما ہوا ہے۔(30) جب یسوع مسیح نے زمین پر آ کر چیزوں کو چھوا۔۔۔ جن میں صلیب، قابر اور وہ سرزمین جس پر یہ سب کچھ ہوا، شامل ہیں تو یہ چیزیں یسوع کی عدم موجودگی میں صدیوں کے بعد بھی رسائی اور رابطہ کا ذریعہ ہیں۔ سائرل لوگوں کو کہتا کہ دوسرے محض سن سکتے ہیں مگر ہم دیکھ اور چھو سکتے ہیں۔(31) یسوع کے نقش قدم پر چل کر ان چیزوں کو روند کر جنہیں یسوع نے روندا تھا، یسوع کی زندگی کے وہ واقعات جنہیں رونما ہوئے عرصہ گزر چکا ہے، زائرین کے لئے زمانہ حال کی حقایقت بن جاتے ہیں۔ یسوع مسیح کسی ایک مقام کا پابند نہیں۔ عیسائی اس کی موجودگی کو دنیا کے کسی بھی گوشے میں محسوس کر سکتے ہیں۔ لیکن مقدس مقامات کی زیارت انہیں اس قابل بناتی ہے کہ وہ ایسے مقامات پر کھڑے ہو سکیں جو ابھی تک اس کی الوہی موجودگی سے لبریز ہیں۔

نیا یروشلم، یہودیوں کے لئے پریشان کن بات تھی۔ زیلٹس کے ایک چھوٹے سے گروہ نے مقدس سرزمین میں عیسائی عمارتوں کی تعمیر روکنے کی کوشش کی۔(32) ان کے لئے یہ بات ایک اچنبھے سے کم نہیں تھی کہ ''عیسائیت جو یہودیت کی ایک ناپاک اور ملحدانہ شکل تھی اب شہنشاہ کی سرپرستی حاصل کر چکی ہے۔۔۔ ماضی میں وہ ایلیا گاپی ٹولینا کی تعمیر روکنے کے لئے موت یا زندگی کا فیصلہ کر چکے تھے لیکن قیصر روم کے بہی خواہوں نے انہیں روک لیا اور پھر قسطنطین کے عہد تک انہیں ہر دور میں یہ امید دلائی گئی تھی کہ ایک نہ ایک روز یہودیوں کو یروشلم میں واپس آنے اور معبد تعمیر کرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ لیکن ابیروشلم کے اندر اور اس کے نواح میں نئی عیسائی عمارتوں کا وجود یہودیوں کی مراجعت کو مشکل ہی نہیں ناممکن بنا رہا تھا۔ قسطنطین نے گلیلی میں بھی ایک مسیحی عبادت گاہ بنانے کا کام شروع کرا دیا تھا جہاں یہودی اکثریت میں تھے۔ سفوریس، طبریس اور کفرنحوم اور ناصرت میں مسیحی مشنری تبلیغ میں مصروف ہو چکی تھی۔ کچھ یہودی شدید مایوسی کے شکار تھے جب کہ بقیہ مسیحا کے منتظر تھے۔(33) زیادہ تر ربی اب بھی میانہ روی کی تلقین کر رہے تھے وہ لوگوں کو اس تباہی کی یاد دلاتے جو رومی اقتدار کے خلاف بغاوت کی کوشش میں ماضی میں یہودیوں کا مقدر بن گئی تھی۔ ربیوں کا دعویٰ تھا کہ عیسائیت کے

لئے شہنشاہ کی سرپرستی محض ایک عارضی جذبہ ہے۔لیکن حالات میں بہتری نہ آئی۔

یہودیوں کی حال زار مسیحی شہنشاہوں کے ادوار میں مسلسل دگرگوں رہی۔قسطنطین نے یہودیوں کو دبانے کے لئے خود تو کوئی اقدام نہ کیا لیکن 337 ء میں اس کی موت کے بعد اس کے جانشینوں نے کچھ اور قوانین نافذ کئے جن کے تحت یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان شادی ممنوع قرار دے دی گئی۔یہودیوں کو غلام رکھنے سے روک دیا گیا۔اس طرح کی پابندیوں سے یہودی الگ تھلگ کر دیئے گئے۔یہودی صنعت تباہ ہو کر رہ گئی۔351 ء میں یہودیوں نے سیفورس، بطریس اور لیدہ میں بغاوت کر دی لیکن رومیوں نے اسے نرمی سے دبا دیا۔353 ء میں قسطنطین دوم نے نئے قانون سازی کی۔عیسائیوں کو یہودیت قبول کرنے سے روک دیا گیا اور یہودیوں کو سرکاری سطح پر کافر، وحشی، قابل نفرت اور گستاخ مسیح قرار دے دیا گیا۔ (34) حجرت عیسیٰ نے محبت اور درگزر کرنے والے مذہب کی تبلیغ کی تھی لیکن اب عیسائیوں نے اقتدار میں آ کر یہودیوں کو اس طرح تختہ مشق بنانا شروع کر دیا تھا جس طرح سماج دشمن عناصر کی بیخ کنی کی جاتی ہے۔انہیں اسی طرح اچھوت بنا کر دیوار سے لگایا جا رہا تھا جس طرح کسی زمانے میں عیسائیوں کے ساتھ ہوا تھا۔

MAP (نقشہ)

سائرل نے یروشلم کو مجرم کی بجائے مقدس شہر اور صلیب کو یروشلم کا تاج
اور جلال قرار دیا۔ یہ تصور آج بھی عیسائیوں میں موجود اور مقبول ہے۔

یہودیوں کا مستقبل مایوس کنکھائی دے رہا تھا۔عیسائیوں نے اپنی الہامی کتابیں مرتب کر لی تھیں۔وہ خود کو نئے اسرائیلی کہتے تھے اور اب یہودیوں کے مقدس شہر کو شاہی اخراجات سے بننے والی عمارتوں کے ذریعے نئے یروشلم کا حصہ بنانے کے منصوبہ پر عمل درآمد ہو رہا تھا۔''تم وہ سب کچھ کیوں لے رہے ہو جو ہمارا ہے۔۔(35) ؟۔ایک یہودی نے عیسائیوں کے ساتھ بحث کے دوران پوچھا۔آخر تم ہماری چیزوں کو اپنا بنانے پر کیوں بضد ہو۔لیکن عیسائی ناز و تعلیٰ میں مبتلا تھے۔پھر اچانک ایسا نظر آیا کہ یہودیوں کی نجات دہلیز تک پہنچ گئی ہے۔361 ء میں قسطنطین دوم وفات پا گیا۔اس کا جانشین جولین کو بنایا گیا جو اس کا بھتیجا تھا۔

جولین کی پرورش ایک عیسائی کی حیثیت سے ہوئی تھی۔لیکن پھر اسے نئے مذہب سے نفرت ہو گئی۔اسے یہ

مذہب روم کی انتہائی مقدس روایات کے منافی، معاندانہ اور خطرناک دکھائی دینے لگا۔ قسطنطین اسے وسیع وعریض سلطنت کو باہم پیوست کرنے والی قوت سمجھتا تھا۔ لیکن جولین روم کے پرانے اصنام پرست مذہب کی طرف مائل ہو گیا اور اسے ہی سلطنت کا سرکاری مذہب قرار دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ایسے خیالات رکھنے والا وہ واحد فرد نہیں تھا۔ رومی مذہب ابھی زندہ تھا اور پانچویں صی عیسوی کے اختتام تک پوری سلطنت میں پھل پھول رہا تھا۔ بہت سے لوگ جو ابھی تک پرانے دیوتاؤں اور رسم ورواج کے دلدادہ تھے ان کے خیال میں بھی جولین کی طرح، عیسائیت رومی عقائد واقدار کی بے حرمتی کر رہی تھی۔ لوگ مضطرب اور خوف زدہ تھے انہیں خدشہ تھا کہ اگر پرانے دیوتاؤں کو ان کا جائز مقام اور قربانیاں نہ پیش کی گئیں تو بہت بڑی تبا ہی یقینی ہے۔ رومی اصنام پرست، حضرت عیسیٰ میں عیسائیوں کے ایمان پر بہت برہم اور نالاں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یسوع ایک انسان تھا جو رسوا کن موت سے ہم کنار ہوا۔ وہ کسی الوہی درجے پر کیسے فئز ہو سکتا ہے۔ رومیوں کے لئے یہ بات با قابل فہم تھی کہ ایک انسان دیوتاؤں کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔ وہ اسے تقدس کے منافی سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب نئے شہنشاہ نے اپنے آباواجداد کا پرانا مذہب بحال کرنے اور اسے رومی دنیا میں جائز مقام دینے کا ارادہ ضاہر کیا تو بہت سے مذہبی اور سماجی حلقے خوش ہو گئے۔ لیکن یہ کام اب اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ اس کے لئے شہنشاہ کو پوری سلطنت میں سرگرم حامیوں کی ایک بہت بڑی تعداد درکار تھی۔

یہودیوں نے ابتدا میں یقیناً یہی محسوس کیا ہوگا کہ انہیں اس کافر شہنشاہ سے بھلا کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن بہت جلد ان پر واضح ہو گیا کہ جولین یروشلم کے لئے ایک انقلابی منصوبہ رکھتا ہے۔

==========

Virtual Home for Real People

حوالہ جات

1. ESUBIUS, Ecclesiastical History 9: 9
2. IBID 1: 4, The Proof of the Gospel 1:6 : 42
3. IBID 1: 6: 42
4. IBID 8: 3 : 11-12
5. IBID 5, Preface 29
6. IBID 1: 6: 40
7. IBID 406-B, C
8. کتاب الامثال (عہد نامہ عتیق) 8:22
9. فلپیوں (عہد نامہ جدید) 2:8-11
10. ESUBIUS, Prwwf of the Gospel -6 preface -1
11. IBID ... 5, Preface -2
12. ESUBIUS, The Life of constantine 3: 27
13. IBID 3: 28
14. IBID 3: 36
15. IBID 3: 28
16. IBID 3: 26
17. ESUBIUS, tHEOPHANY. 3: 61
18. ESUBIUS, Life of constantine. 3: 28
19. ESUBIUS, Sermon Psalm. 87
20. ESUBIUS, Life of Constantine. 4: 33
21. IBID 3. 53

22۔ تواریخ 22-19 :24

23. Itinerary from BORDEAUX to Jerusalem, trans-Aubrey Stewart (London, 1887, New York, 1971) p. 22

24۔ انجیل میت۔ 4:5

25۔ ITINERARY صفحہ 23

26۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔صفحہ 23-24

27. CYRIL, Catechetical Lectures, 3: 7, 17: 13

28. IBID 13: 30, 1922

29. IBID 14: 16

30. IBID 16: 26, 12: 16

31. IBID 13: 22

32. JOHN CHRYSOSTOM, Against The Jews, 5: 11

33. MICHAEL AVI-YONAH, The Jews of Plaestine: A Political History) PP. 160-173

34. IBID P. 176.

35. A. HAYMAN (ed), Disputation of Sergius the Stylite Against (Louvain. 1973). P 67.

==========

www.HallaGulla.com Virtual Home for Real People

دسواں باب

شہر مسیح

19 جولائی 362ء کو شام اور ایشائے کوچک کے یہودی وفد شہنشاہ جولین سے ملاقات کے لئے انطاکیہ پہنچے۔ طبریس کا کوئی نمائندہ ان وفود میں شامل نہیں تھا۔ یہ ملاقات سلطنت کے جیٔ شہنشاہ کے عظیم منصوبہ کا ایک حصہ تھی شہنشاہ جدت پسند عیسائی مذہب کی جگہ پوری سلطنت میں ایک خدا یعنی بالاتر قوت کو قربانیاں پیش ہوتے دیکھنا چاہتا تھا جسے مختلف ناموں سے پکارا اور پوجا جاتا تھا۔ ان ناموں میں زیوس، ہیلویس یا خدائے بزرگ و برتر رومی سلطنت میں زیادہ معروف تھے۔ جولین نے سلطنت کے ہر حصے میں روم کے پونٹی فیکس میکسی مس کی حیثیت سے رومی مذہب کے پروہتوں کا تقرر کر دیا۔ ان کے فرائض میں سرفہرست، اپنے علاقے کے عیسائی بشپ کے مخالفت تھا۔ ایسے شہر جنہوں نے عیسائیت قبول نہیں کی تھی، انہیں خصوصی فراعات دی گئیں۔ عیسائیوں کو بتدریج سرکاری مناصب سے ہٹا دیا گیا۔ اگرچہ شہنشاہ جولین، یہودیت کے کچھ پہلوؤں کو ناپسند کرتا تھا تاہم اس نے یہودیوں کو بہت سراہا کہ وہ اپنے قدیم مذہب کے پوری طرح وفادار ہیں۔ جولین کے اتالیق، یمی لیکس نے اسے سکھایا تھا کہ کوئی دعا اس وقت تک خدا کے پاس نہیں پہنچتی جب تک اس کے ساتھ قربانی نہ پیش کی جائے۔ ادھر یہودیوں کو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ وہ اپنے آباواجداد کی قربانی کی رسوم پابندی کی وجہ سے ادا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ صورت حال سلطنت کے مفادات کو نقصان پہنچا رہی تھی۔ سلطنت کے مفادات کا تقاضا تھا کہ خدا کی خوشنودی حاصل کی جائے۔

جب یہودیویں کے بزرگ جولین کے سامنے پیش ہوئے تو اس نے پوچھا کہ وہ لوگ (حضرت) موسیٰ کے قوانین کے مطابق خدا کے حضور قربانیاں کیوں نہیں پیش کر رہے۔ اسے ساری صورت حال کا اچھی طرح علم تھا لیکن اس نے جان بوجھ کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تاکہ یہودیوں کی طرف سے قربانی کی اجازت کی درخواست سامنے آئے۔ یہودی وفود کے بزرگوں نے توقع کے مطابق وضاحت کی۔۔۔۔ ''اپنے شرعی قوانین کے مطابق ہم شہر مقدس کے علاوہ کہیں قربانی کی

رسم سرانجام نہیں دے سکتے۔ہمیں ہمارا شہر واپس کر دیا جائے۔معبد تعمیر کرنے کی اجازت دے دی جائے تو ہم قربانی کی رسم بحال کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔جولین یہی بات ان سے کہلوانا چاہتا تھا۔ایسا ہو جانے پر عیسائی دلائل پر شدید ضرب پڑتی۔عیسائیوں کا استدلال تھا کہ یہودیت کی شکست عیسائیت کی صداقت کا ثبوت ہے۔چنانچہ شہنشاہ نے یہودی بزرگوں کو کہا ۔۔۔میں پورے جوش وخروش کے ساتھ ملاقات کے فوراً بعد جولین نے بطریق، ھلیل دوم اور سلطنت کے تمام یہودیوں کو لکھا کہ۔۔۔یروشلم کو یہودی شہر کی حیثیت سے پھر بحال کر دیا جائے گا۔''میں یروشلم میں مقدس شہر کی تعمیر نو کروں گا۔اس کے اخراجات میں خود ادا کروں گا۔اسے پھر سے آباد کیا جائے گا۔اور اسے ویسا ہی بنا دیا جائے گا جیسا آپ کئی برسوں سے آرزو کر رہے ہیں۔(2)

یہودی برادری میں بے پناہ جوش وخروش امڈ آیا۔گلیوں میں نفیریاں بجائی گئیں۔ایک دوسرے کو مبارک باد دی گئی۔یوں محسوس ہوتا تھا کہ بہت جلد مسیحا آنے والا ہے۔بہت سے یہودی عیسائیوں سے الجھ پڑے۔عیسائیوں نے ایک عرصہ سے ان کو دبا رکھا تھا۔(3) یہودیوں کے پرہجوم قافلے یروشلم میں اترنے لگے۔دوسو برسوں کے بعد پہلی مرتبہ اس کی گلیوں میں اژدھام نظر آیا۔جو یہودی یروشلم میں خود نہ آ سکا، اس نے معبد کی تعمیر کے لئے چندہ بھجوا دیا۔آنے والے یہودیوں نے کوہ صیہون پر معبد کے کھنڈرات میں ایک عارضی کنشت تعمیر کر لیا۔ شہنشاہ جولین نے حکم دے دیا کہ یروشلم کے عیسائی باشندے وہ تمام املاک یہودیوں کی تحویل میں دے دیں جو انصاف کے تقاضے کے مطابق ان کا حق ہیں۔اس نے اپنے ایک علم دوست مصاحب ایلی پیئس کو معبد کی تعمیر کے کام کا نگران بنایا اور تعمیراتی سامان کی ترسیل شروع کر دی گئی۔ چاندی کے خصوصی اوزار بنوائے گئے کیونکہ قربان گاہ کی تعمیر میں لوہے کا استعمال ممنوع تھا۔ 5 مارچ 363ء کو جولین اور اس کی فوج ایران کے لئے کوچ کر گئے۔شہنشاہ کو یقین تھا کہ مذہب سے وابستگی اسے ایرانی مہم میں کامیابی دلائے گی۔اس نے اعلان کیا کہ واپسی پر وہ خود یروشلم میں آئے گا اور فتح کی تقریبات کے ایک حصہ کے طور پر معبد کو وقف کرنے کی رسم میں ذاتی طور پر شریک ہوگا۔شہنشاہ کی روانگی کے بعد یہودی کارکنوں نے پرانے معبد کی بنیادیں تلاش کرنے کے لئے کھدائی شروع کر دی۔دوصدیوں سے پڑا ملبہ ہٹانا اور بنیادیں تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا اپریل اور مئی کے دوران ابتدائی کام جاری رہا۔لیکن گلیلی کا بطریق اور ربی مسلسل وسوسوں کے شکار تھے۔(4) ان کا کہنا تھا کہ یہ کام صرف اور صرف مسیحا سر انجام دے سکتا ہے۔''بھلا ایک معبد کی تعمیر کسی کافر بادشاہ کے ہاتھوں کیسے ممکن ہے۔خدا کسی کافر کو یہ سعادت کیسے بخش سکتا ہے۔اور اگر جولین ایران سے واپس نہ آ سکا تو پھر کیا ہوگا؟

اب عیسائیوں کی باری تھی کہ وہ ایک ایسے معاندانہ تعمیراتی منصوبے کی راہ میں رکاوٹ بنیں جو مقدس شہر پر انکے دعوے کی نفی کر رہا تھا۔پچھلے پچاس برسوں سے یروشلم کی کلیسیا روز بروز طاقتور ہوتی جا رہی تھی۔لیکن جولین کے ارتداد نے اسے مکمل طور پر خطرے میں ڈال دیا تھا۔پرانا تاریک خیال مذہب ابھی تک زندہ تھا اور گزشتہ کئی برسوں کی دشمنی نے کلیسیا

کے خلاف اصنام پرستوں کو تصادم پر مائل کر دیا تھا۔ پانیاس اور سیباستے میں تو اصنام پرستوں نے شہنشاہ جولین کے نئے احکامات کے بعد عیسائیت کے خلاف ہنگامہ آرائی بھی کر دی تھی۔ جولین کا پرانے مذہب کی بحالی کا منصوبہ کوئی ناممکن خواب نہیں تھا اور عیسائی اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ جس روز کوہ صیہون پر معبد کا کام شروع ہوا۔ یروشلم کے عیسائی ''حیات نو'' کی یادگار میں اکٹھے ہوئے تا کہ خدا سے اس تباہی کو ٹالنے کے لئے دعا کریں۔ پر وہ جلوس کی صورت میں کوہ زیتون پر گئے۔ وہ یہودی مرثیے پڑھ رہے تھے جنہیں اب وہ اپنا قرار دے چکے تھے۔ اس مقام پر آ کر جہاں عیسائیوں کی کئی نسلیں بیٹھ کر یہودیوں کی شکست اور اپنی فتح کے احساس سے سرشار ہو جاتی تھیں، یروشلم کے رنجور عیسائیوں نے کوہ صیہون پر نظریں گاڑ دیں۔ وہاں معبد کی تعمیر کے لئے چبوترے کی صفائی کا کام ہو رہا تھا۔ کوہ زیتون پر کلیسیا کے عروج کا خوش کن تصور مہیا کرتا تھا۔ آج معبد میں کام کرتے ہوئے یہودیوں کو دیکھ کر انہیں ایسا محسوس ہوا کہ کارکن معبد کی تعمیر کا نہیں عیسائیت کے تار پود بکھیرنے کا کام کر رہے ہیں۔ کوہ زیتون پر کھڑے عیسائی بہت آزردہ تھے لیکن بشپ سائرل مطمئن تھا۔ اس نے سب سے کہا۔۔۔ ''مایوس ہونے کی ضرورت نہیں'' سائرل نے پیشین گوئی کے انداز میں اطمینان دلایا۔۔۔ '' نئے معبد کی تعمیر کا کام کبھی بھی مکمل نہیں ہو سکے گا۔۔۔''

27 مئی کو سائرل کی پیشین گوئی پوری ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک زلزلے نے پورے شہر کو بری طرح ہلا کر رکھ تیا۔ عیسائیوں کا دعوی تھا کہ۔۔۔ خدا کا غصہ بھڑک اٹھا ہے۔ معبد کے چبوترے کے نیچے تہہ خانوں اور حجروں میں جمع ہونے والی گیس پھٹ پڑنے سے آگ بھڑک اٹھی۔ اس آگ نے وہاں ذخیرہ کیا گیا تعمیراتی سامان جلا کر راکھ کر دیا۔ ایلی پیئس کی سرکاری رو پورٹ کے مطابق۔۔۔ آگ کے دیو ہیکل گولے زمین سے پھٹ نکلے اور متعدد کارکن جھلس گئے۔(5) ٹھیک ان دنوں شہنشاہ جولین دریائے دجلہ کو عبور کر کے کشتیوں کا پل جلا چکا تھا۔ اب اس کا رابطہ اپنی سلطنت سے ٹوٹ چکا تھا۔ چنانچہ ایلی پیئس نے کام روک دیا اور شہنشاہ کی مہم کے نتائج کا انتظار مناسب سمجھا۔ کچھ ہفتوں بعد جولین ایک لڑائی میں مارا گیا۔ جودیان کو قیصر روم بنا دیا گیا۔ اب تخت پر پھر ایک عیسائی شہنشاہ براجمان تھا۔

اس معجزہ پر عیسائیوں نے اپنے بے پناہ اطمینان و مسرت کو چھپانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ بہت سے افسانے تراشے گئے۔ کہا گیا کہ ایک دیو ہیکل صلیب آسمان پر نمودار ہوئی جو کوہ زیتون سے گلگتا تک پھیل گئی۔ کچھ لوگوں نے دعویٰ کیا کہ یروشلم میں بہت سے یہودیوں اور بت پرستوں کے لبادوں پر پراسرار انداز میں صلیب کے نشانات ابھر آئے تھے۔ صورت حال میں اس رجعت نے یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان دشمنی میں مزید شدت پیدا کر دی۔ جو ویان نے یہودیوں پر پھر یروشلم کے دروازے بند کر دیئے۔ یروشلم کا نواحی علاقہ بھی ان کے لئے ممنوع تھا۔ اس دفعہ جب وہ ایو کی نو تاریخ کو معبد کا سوگ منانے کے لئے آئے تو ان کے غم واندوہ میں ایک نئی شدت آ چکی تھی۔ برقیاہ ربی لکھتا ہے کہ وہ خاموشی سے آئے اور خاموشی سے چلے گئے۔ لیکن ان کے آنسو تھمنے میں نہیں آ رہے تھے۔ انہوں نے روتے ہوئے سوگ

کی تمام رسوم ادا کیں اور پھر شہر کے گرد چکر لگائے بغیر واپس چلے گئے۔(6) عیسائیوں نے ان رسوم کو تضحیک آمیز انداز میں دیکھا۔ بائبل کا ایک عالم جیروم یہ منظر دیکھنے کے بعد لکھتا ہے۔۔۔۔۔''جب میں نے اس 'ذلت کے مارے' ہوئے انبوہ کو معبد کے پہاڑ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو یقین کر لیا کہ ان کے نحیف ونزار جسم اور تار تار لباس اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ خدا نے انہیں واقعی ٹھکرا دیا ہے۔'' جیروم نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ''یہودی رحم کے قابل نہیں ہیں۔''(17) اس کا یہ تبصرہ حضرت عیسیٰ اور سینٹ پال کی تعلیمات کے منافی ہے۔ یہ دونوں بزرگ رحم کو سب سے بڑا مذہبی فریضہ قرار دیتے ہیں۔ جیروم بتاتا ہے کہ چوتھی صدی کے اواخر میں یہودی اپنے اعصاب پر قابو پا چکے تھے۔ان کا دعویٰ تھا کہ قدیم پیشین گوئیاں ضرور پوری ہوں گی۔ وہ یروشلم کی طرف اشارہ کر کے بڑے اعتماد کے ساتھ کہتے ''وہاں خدائے بزرگ و برتر کا معبد ضرور تعمیر ہوگا۔آخری دور میں مسیحا آئے گا اور شہر کو زر د جواہر کے ساتھ تعمیر کرے گا۔''(8)

عیسائی یہ بات نہ بھول سکے کہ ان کا مقدس شہر چھین لئے جانے کے قریب تھا۔ان کا دور اقتدار آئندہ کتنا عرصہ برقرار رہے گا۔اس کے بارے میں کوئی کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ چنانچہ اکابرین نے طے کیا کہ عیسائیوں کی موجودگی فلسطین میں بالعموم اور یروشلم میں بالخصوص اتنی طاقتور بنائی جائے کہ کوئی بھی اسے ختم نہ کر سکے۔شہر کا کردار عیسائیوں کی اکثریت ہو جانے پر بتدریج تبدیل ہو گیا۔390 ء میں شہر راہبوں اور راہباؤں اور راہباؤں سے بھر گیا۔ غیر ملکی سیاحوں کی بڑی تعداد بھی وہاں آنے لگی۔(9) یہ لوگ واپس گھروں کو جا کر شہر مقدس کی شان وشوکت اور مذہبی رسوم کے روح پرور مناظر کی کہانیاں سناتے۔ کچھ راہب اور راہباؤں نے وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ان نئے آبادکاروں میں جیروم بھی شامل تھا وہ چوتھی صدی کے دوسرے نصف میں مغرب سے وہاں آیا تھا۔ کچھ لوگ زائرین کی حیثیت سے آئے تھے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ایک گروہ ایسا بھی تھا جو یورپ میں جرمنوں اور ہنوں کی سلطنت روما کے خلاف کامیاب بغاوتوں کے بعد ان علاقوں سے ہجرت کر کے یہاں آ گیا تھا۔مغرب سے آنے والے افرادی سیلاب میں اس وقت اضافہ ہو گیا جب ایک پر جوش ہسپانوی عیسائی تھیوڈوسیئس دوم

379 ء میں شہنشاہ بن گیا۔ وہ 24 نومبر 380 ء کو قسطنطنیہ میں اپنے پارسا مصاحبوں کے ساتھ آیا جو اس کی راسخ الاعتقادی اور تقلید پسندی کا نفوذ چاہتے تھے۔ 351 ء میں تھیوڈوسیئس نے طویل عرصہ سے چلے آ رہے آرین تنازعہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کرتے ہوئے نیقیہ کی مجلس کے اعلامیہ کو سلطنت روما کا سرکاری مسلک قرار دیدیا۔دس سال کے بعد اس نے کافرانہ رسوم کی قربانیوں پر پابندی عائد کر دی اور تمام قدیم مندر اور عبادت خانے مقفل کر دیئے۔ دربار کی کچھ خواتین نے جن میں ملکہ ایلیا فلیسیلا بھی شامل تھی، مندروں پر حملے کروا کر اور شہدا کی یاد میں شاندار چرچ تعمیر کروا کر روم میں اپنے وقار میں اضافہ کر لیا تھا۔

یروشلم میں تھیوڈوسیئس کے مسلک کے حامی عیسائی کوہ زیتون پر ایک سرائے یا مہمان خانہ تعمیر کرنا چاہتے تھے جس

کی بنیادیں تھیوڈوسیئس کے تخت نشینی کے سال رکھ دی گئیں۔ دو مغربی عیسائیوں روفینس اور میلانیا نے یہ مہمان خانہ تعمیر کروایا۔ روفینس، جیروم کا پرانا دوست اور میلانیا، ہسپانوی اشرافیہ کی ایک نامور خاتون تھی۔ مذکورہ خاتون نے اپنے خاوند کی موت کے بعد رہبانیت اختیار کر لی تھی اور اب ایک بہت بڑی مسیحی سکالر کی حیثیت سے معروف تھی۔ جب اس کے بچے اتنے بڑے ہو گئے کہ اپنا آپ سنبھال سکیں تو وہ یورپ سے نکلی اور مصر اور فلسطین کی نئی خانقاہوں کی زیارت کرتی ہوئی یروشلم پہنچی۔ یہاں اس نے اپنی خانقاہ تعمیر کروائی۔ کوہ زیتون پر مرد اور عورتیں عبادت اور کفارے کی زندگی گزار سکتے تھے۔ کفارے کے عمل میں توبہ، اعتراف گناہ اور عقوبت نفس کی کئی منزلیں طے کر کے معافی حاصل کی جاتی تھی۔ عموماً وہاں کفارہ کے طور پر ریاضت کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ مذہبی تعلیم کی درس و تدریس اور زائرین کے طعام و قیام کا انتظام موجود تھا۔ میلانیا اور روفینس نے خود کو شہر کی مقامی زندگی میں پوری طرح شامل کر لیا۔ ان کے راہب اور راہبائیں عمومی عبادت اور عشائے ربانی میں بھرپور حصہ لیتے اور مغرب سے آنے والے زائرین کے لئے ترجمان کے فرائض سرانجام دیتے کیونکہ مغربی زائرین نہ تو یونانی زبان سمجھتے تھے جو عبادت کے لئے استعمال کی جاتی تھی اور نہ آرامی زبان سمجھتے تھے جو مقامی لوگوں کی عام زبان تھی۔ میلانیا اور روفینس دونوں نیقیہ مسلک کے پرچارک تھے۔ انہوں نے قسطنطنیہ کے دربار اور بیرونی دنیا میں مشنری تحریک کے درمیان قریبی رابطے برقرار رکھے۔

جیروم اور اس کی شاگرد پاؤلا 385ء میں یروشلم کی زیارت کے دوران میلانیا کے مہمان خانے میں ٹھہرے۔ بعد میں بیت لحم میں انہوں نے عیسائی برادری کے لئے ایسی ہی خانقاہ اور مہمان خانے کو مثال بنایا۔ پہلے تو جیروم، میلانیا کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔ لیکن وہ ایک متلون مزاج اور چڑچڑا آدمی تھا چنانچہ بہت جلد عقائد کی بنیاد پر اس سے اختلاف کر بیٹھا۔ پھر اس کے بعد جیروم نے میلانیا کے لئے یا کوہ زیتون پر قائم اس مہمان خانے کی انتظامیہ کے بارے میں کوئی اچھا کلمہ نہیں لکھا۔ وہ ان لوگوں کی پُرآسائش زندگی کو تیکھی نظر سے دیکھتا ہے۔(10) وہ میلانیا کی برادری کی دنیاداری اور دربار سے وابستگی کو برا قرار دیتا ہے۔ اس کے خیال میں یروشلم کی دینوی فضا رہبانیت کے لئے موزوں نہیں تھی۔ چنانچہ وہ بیت لحم کا دنیاوی ہنگاموں سے الگ تھلگ ہونا، اس کام کے لئے مثالی قرار دیتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ یروشلم میں لوگوں کا اژدہام، چھاونی، طوائفیں، اداکار، مسخرے اور وہ سب کچھ ہے جو ہنگامہ پرور شہروں میں ہوتا ہے۔ اس لئے یہ رہبانیت کی زندگی کے لئے کس طرح موزوں ہو سکتا ہے؟(11) بیت لحم میں عیسائی برادری باہم مربوط اور زیادہ مذہبی تھی۔ جیروم اس کی بہت تعریف کرتا ہے۔ اس نے کئی سال تک میلانیا کے خلاف تند و تیز تحریک چلائی لیکن میلانیا کی نیک نامی پہ کوئی حرف نہ آیا بلکہ اس کی شہرت زائرین کے ذریعے مغرب میں بھی پہنچ گئی اور لوگ پارسائی اور مذہبی خدمات کے لئے اس کی مثال پیش کرنے لگے۔

اس کی مدح سرائی کرنے والے زائرین میں سے ایک پومینیا تھی۔ اس کا تعلق بھی شاہی خاندان سے تھا۔ 390ء

میں یروشلم آنے سے پہلے وہ بھی بالائی مصر کی خانقاہوں کی زیارت کی جا چکی تھی۔ پہومینیا نے کوہ زیتون کی چوٹی پر اس جگہ چرچ تعمیر کروایا جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ حضرت عیسیٰ وہاں سے آسمان پہ اٹھائے گئے۔ پومینا کا چرچ جو زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا، اس پر ایک بڑی اور چمکدار صلیب نصب کی گئی جو آسمان سے باتیں کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ یہ چرچ ایک گول عمارت تھا جس میں وہ چٹان محصور تھی جس پر مبینہ طور پر حضرت عیسیٰ کے پاؤں کے نشان تھے۔ کوہ زیتون کے مضافات میں اور بھی عمارتیں وجود میں آ چکی تھیں۔ وادی قدرون کے ایک سرے پہ کنواری مریم کی قبر کے مقام پر بھی ایک چرچ تعمیر کیا گیا۔ راہبوں کا خیال تھا کہ وادی کے دوسرے کنارے پر بنی حضر کی قبر دراصل جیمز زادک کا مدفن ہے چنانچہ اسے چرچ میں تبدیل کر دیا گیا۔ 398ء کے قریب گتسمنے باغ میں ایک چرچ بنایا گیا۔ یہاں اناجیل کے مطابق یسوع نے گرفتاری سے پہلے دعا کی تھی۔ تھیوڈوسئس کی عیسائیت یانیقیہ کا مسلک مقدس عمارتوں پر زیادہ زور دیتا تھا چنانچہ نئے چرچ یروشلم میں نئے حقائق کے عکاس بن کر ابھر آئے۔ شہر کے اصنام پرستوں کو عیسائیت کی بڑھتی ہوئی موجودگی کا سامنا تھا۔ کیونکہ شہر کے اندر اور فصیل شہر کے بارہ چرچوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔

MAP (نقشہ)

قرون وسطیٰ کا ایک نقشہ جس میں عیسائیوں کا مقدس جغرافیہ مرتب کیا گیا ہے۔
یروشلم دنیا کے مرکز میں جبکہ روم، فرانس (گالیہ) اور انگلستان (اینگلیہ) اس مقدس شہر کے قریب لیکن مصر کو دور دراز دکھایا گیا ہے۔ نامعلوم، اجنبی اور بے دین دنیا کو عفریتوں کی صورت میں دنیا کے نقشہ سے باہر رکھا گیا ہے۔

MAP (نقشہ)

قبتہ السلسلہ، گنبد صخرہ کے پہلو میں نظر آ رہا ہے۔ اسلامی دنیا میں گنبد روحانی معراج اور تکمیل کی علامت کے طور پر مساجد اور مزاروں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

MAP (نقشہ)

مسجد اقصیٰ کا ایک اندرونی منظر۔ مسجد اقصیٰ مسلمانوں کے تصور تقدیس وطہارت کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ مسلمانوں کا عبادت خانہ روشن اور سادہ اور بیرونی دنیا کے لئے دعوت عام ہوتا ہے۔۔۔ مساجد پوری کائنات کی تقدیس۔۔۔ ''توحید'' کا مظہر ہیں۔

MAP (نقشہ)

حرم الشریف اور دیوار گریہ (مغربی دیوار) یروشلم کا مقدس ترین اور متنازعہ علاقہ ہے۔ قبتہ الصخرہ اور مسجد تھا۔ دیوار گریہ قدیم معبد کی باقیات میں سے ایک اور اس سے یہودیوں کا آخری تعلق ہے۔ قبت الصخرہ سامنے مغربی محلّہ کو گرا کر بہت بڑا پلازا بنا دیا گیا۔ آثار قدیم کی کھدائی کے لئے مسجد اقصیٰ (نقرئی گنبد) مسلمانوں کے عقائد کے مطابق یوم حساب کو اہل ایمان اکھٹے ہوں گے۔

MAP (نقشہ)

اقصیٰ کوہ صیہون پر اس وسیع وعریض چبوترہ پر تعمیر ہیں جو بادشاہ ہیرود یس نے یہودی معبد کے لئے بنوایا (طلائی گنبد) کے ساتھ ایستادہ مینار مدرسہ تنزیقیہ کی عمارت ہے۔ 1967ء کی جنگ کے بعد دیوار گریہ کے پہلو میں اسرائیلی سیکولر عناصر نے قبضہ کرلیا۔ پس منظر میں کوہ زیتون ہے جہاں یہودیوں عیسائیوں اور

MAP (نقشہ)

مقدس مقامات عموماً تنازعات کو جنم دیتے ہیں لیکن اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی قوت بھی رکھتے ہیں گرجا مزار مقدس میں آرمینیائی، قابطی اور فرانسسکن پادری مزار اقدس کے پہلو میں کھڑے ہیں۔ مختلف مسیحی فرقوں سے تعلق رکھنے والے پادریوں کا ایسا اجتماع بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

MAP (نقشہ)

کٹر تقلید پسند یہودی، اسرائیلی فوجیوں کے شانہ بشانہ دیوار گریہ پہ عبادت میں مصروف ہیں۔ تقلید پسند یہودی اسرائیل کی سیکولر ریاست کے مخالف جب کہ فوجی اس کے محافظ ہیں۔

MAP (نقشہ)

چوتھی صدی عیسوی سے یروشلم کے عیسائی پام سنڈے کے تہوار پر کھجور کی شاخوں سے بنی خوبصورت صلیبیں اٹھائے ہوئے کوہ زیتون سے گرجا مزار مقدس تک جلوس کی صورت میں آتے ہیں اور ''ہوشعنا'' (عبرانی میں تحسین و مسرت) کے نعرے بلند کرتے یں۔

MAP (نقشہ)

کوہ زیتون پر گرجا صعود مسیح میں محفوظ اس چٹان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس پر حضرت عیسیٰ کے بائیں پاؤں کا نقش

ثبت ہے۔ یہ مقدس مقام جہاں سے حضرت عیسیٰ نے آسمانوں کو صعود کیا۔ عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کے لئے محترم و متبرک ہے۔

MAP (نقشہ)

www.HallaGulla.com

نشاۃ ثانیہ کے دور کا یہ نقشہ ظاہر کرتا ہے کہ یورپ کے عیسائی پرانے مقدس مقام سے دور ہوتے جا رہے ہیں فلسطین کی ارض مقدس ابھی تک سنہری اور معلیٰ ہے۔ لیکن اب دنیا سائنسی اور عملی نکتہ نظر سے تبدیل ہو چکی ہے۔ چنانچہ مغرب کے لوگ مقدس مقام کے تصور سے گریزاں ہیں۔

MAP (نقشہ)

بازنطینی (مسیحی) یروشلم

(326-638ء)

ضیافت کے دنوں میں یروشلم پوری طرح عیسائیوں کی گرفت میں ہوتا۔ ان دنوں چرچوں اور خانقاہوں میں سے عیسائیوں کے انبوہ سڑکوں پر امڈ آتے اور پھر شہر کے اندر اور مضافات میں وہی گشت کرتے پھرتے نظر آتے۔ عیسائیت اب کوئی مخفی مذہب نہیں تھا۔ اس کے پیروکاروں کو اپنے مذہبی تہوار منانے کے لئے اب ایک دوسرے کے گھر خاموشی سے نہیں جانا پڑتا تھا۔ انہوں نے عوامی اور اجتماعی عبادت کا اپنا انداز وضع کر لیا تھا۔ وہ روم میں شہدا کے مقابر کے گرد اکٹھے ہو جاتے۔ شہدا کی مذہبی وابستگی اور اذیت ناک اموات کا بیان سنتے اور زور زور سے روتے اور چیختے۔ اپنے بشپ کی قیادت میں گلیوں میں سے جلوس کی صورت میں چلتے ہوئے ایک چرچ سے دوسرے چرچ میں جاتے پھر بتدریج انہوں نے قدیم کافر دارالحکومت پر اپنا مذہبی رنگ چڑھا دیا۔ اسی طرح کی ایک پیش رفت یروشلم میں بھی ہوئی۔ جس میں کافر ایلیا کو مقدس مسیحی شہر بنانے کا آغاز ہوا۔ اس پیش رفت کا احوال ہمیں ایجیریا کی تحریروں میں ملتا ہے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ ہسپانوی

زائر تھی۔ وہ 381ء میں قسطنطنیہ میں پہنچی۔ ان دنوں تمام علاقوں کی کلیسیاؤں کے بشپ کونسل میں شرکت کے لئے وہاں آ رہے تھے۔ انہوں نے اس کونسل میں ایتھاناسیئس کے عقیدہ تجسیم (مسیح کا انسانی شکل اختیار کرنا) کو سرکاری مسلک قرار دیا۔(12)

ایجریا، خانقاہوں اور گرجوں کے لئے تھیوڈوسیئس کے جوش خروش کی حامی تھی۔ اس نے مشرق قریب کا طویل سفر اختیار کیا۔ جہاں کہیں اسے اور اس کے ساتھیوں کو کسی مقدس مقام کا پتہ چلتا۔ وہ بائبل کا متعلقہ صحیفہ پڑھتے ٹھیک مقام کا تعین کرتے اور وہاں پہنچ کر اس کا احوال قلمبند کرتے۔ ایجیریا، زائر بورڈیا کس سے زیادہ پرجوش اور بسیار نویس مورخ ثابت ہوئی۔ وہ ان مقامات پہ بھی جا پہنچی جن کے بارے میں زیادہ تر عیسائی محض سوچ کر رہ جاتے تھے۔ اس کے سامنے بائبل زندہ ہوگئی۔ جس طرح سائرل نے کہا تھا، ان مقامات کا منظر جہاں کوئی معجزہ یا رویت خداوندی ظہور میں آئے تھے، زائر کی نظروں میں ماضی کو زندہ کر کے حال میں لے آتا ہے۔ نئے عیسائی عقائد اور پرانے یہودی معبد کے مذہب میں صرف اتنا فرق تھا کہ موخر الذکر ابتدائے آفرینش کے اساطیری واقعات کی یاد مناتا تھا جب کہ عہد نامہ جدید کے واقعات ماضی قریب سے تعلق رکھتے تھے۔

جب ایجیریا، یروشلم میں پہنچی تو مقدس مقامات کو دیکھنے کی رسم تبدیل ہو کر مقدس واقعات کی یاد میں منعقد ہونے والے مذہبی اجتماعات کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ ان مقدس واقعات میں یسوع کی زندگی، موت اور حیات نو شامل تھی۔ پوری عیسائی برادری اہتمام کے ساتھ متعلقہ واقعہ کے مقام پر جلوسوں اور اجتماعات کا انعقاد کرتی۔ ایجیریا گلگتا کے صحن اور گلیوں میں جمع ہونے والے ایک بے پناہ ہجوم کا تذکرہ کرتی ہے۔ 14 ستمبر کو شہر میسوپوٹیما، شام اور مصر سے آنے والے راہبوں اور راہباؤں کے جم غفیر سے پھٹ پڑنے کو تھا۔ یہ لوگ اینکسینیا کا آٹھ روزہ جشن منانے آئے تھے۔ یہ تہوار قسطنطین کی طرف سے نئے یروشلم کے افتتاح اور ملکہ ہیلنا کی طرف سے اصلی صلیب کی دریافت کی یاد میں منایا جاتا تھا۔ اینکسینیا اتفاق سے سکوتھ کے تہوار کے دنوں میں آتا۔ یہودی سکوتھ کا تہوار جو کبھی ایک فصلی تہوار تھا ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے بعد اس کی یاد میں منعقد کرتے تھے۔ عیسائی زائرین اس موقع پر زرق برق پوشاکیں پہنتے۔ لیکن انہیں بہترین جسمانی حالت میں وہاں آنا ہوتا تھا۔ کیونکہ یروشلم کی یہ مذہبی رسوم محض ہم آہنگ ہو کر مناجات اور مذہبی گیت گانے اور وعظ سننے تک محدود نہیں تھیں۔ شرکاء کو ان تمام دنوں اور راتوں میں اپنے پاؤں پر کھڑے رہنا ہوتا تھا اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانا ہوتا تھا۔ یہ لوگ کرسمس کا ہفتہ بھی منایا کرتے تھے۔ جو 6 جنوری کو شروع ہوتا اور ہر رات ایک جلوس بیت لحم سے یروشلم کو روانہ ہوتا۔ جلوس صبح صادق کے وقت گلگتا کے مقام پر پہنچتا اور پھر چار گھنٹے کی عبادت اور دعا میں شریک ہونے سے پہلے تھوڑا سا آرام کرتا۔ قبر اب اناستاسیس کی مدوّر یادگار میں محفوظ کر دی گئی تھی۔ یہ گول گنبد رکھنے والی عمارت حال ہی میں مکمل ہوئی تھی۔ ''کھجور والی اتوار'' کی سہ پہر کو ہجوم کوہ زیتون پر ایلیونا باسلیق میں پہنچتا۔ نماز اور دعا کے بعد زائرین وادی قدرون

میں اترتے اور جلوس کی شکل میں واپس شہر میں داخل ہوتے جس طرح یسوع مسیح شہر میں داخل ہوا تھا۔ بچے کھجور اور زیتون کی شاخیں ہلا کر جلوس کا استقبال کرتے۔ ہجوم مذہبی گیت گاتا اور وقفے وقفے سے نعرے لگاتا۔۔۔ ''مبارک ہے وہ جو خدا کے نام پر آتا ہے۔'' ایجیریا بتاتی ہے کہ جلوس بہت دھیمی رفتار سے حرکت کرتا تاکہ لوگ تھک نہ جائیں۔ رات گئے یہ معمول کی عشائے ربانی کے بعد بشپ سائرل کی قیادت میں ایک جلوس کوہ زیہون کی باسلیق میں پہنچتا اور روح القدس کے نزول کی یاد مناتا۔ لیکن لوگ اسی پر اکتفا نہ کرتے اور سہ پہر کو کوہ زیتون کی چوٹی پر پہنچ جاتے اور صعود مسیح کی یاد میں وہاں چہل قدمی کرتے رہتے۔ پھر ایک جلوس کی صورت میں آہستہ آہستہ اور خاموشی سے واپس شہر میں آجاتے۔ لیکن راستے میں ایلیونا باسلیق پہ رک کر شام کی عبادت اور قسطنطین کی یادگار میں رات کی عبادت کے بعد آدھی رات کو واپس کوہ زیہون کے باسلیق میں آکر آخری عبادت کرتے۔

MAP (نقشہ)

گرجا مزار مقدس کی چھت پر ایتھوپیائی خانقاہ کی دیوار کے ساتھ رکھی گئی صلیبیں سالانہ جلوس میں استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ جلوس چوتھی صدی عیسوی سے یروشلم کی مذہبی تقریبات کا ایک اہم حصہ ہے۔

ان تہواروں اور تقریبات نے ناگزیر انداز میں عیسائیوں کا مذہبی رویہ تبدیل کر دیا۔ اب یسوع مسیح کی حیات ارضی کے انفرادی واقعات میں ان کی دلچسپی بہت کم ہوگئی۔ یسوع کی موت اور حیات نو کو ایک ہی بھید کے دو روپ کہا جاتا تھا۔ ایک ایسا راز جس نے وہ راستہ منکشف کیا جس پر چل کر بنی نوع انسان کلام مجسم کے ذریعے بذات خود خدا تک پہنچ سکتی ہے۔ لیکن اب راہب، راہباؤں، پادری، غیر کلیسیائی لوگ اور یروشلم کے زائرین، سبھی کو کہا جا رہا تھا کہ وہ مخصوص واقعات پر اپنی توجہ ایک معقول وقت تک مبذول رکھیں۔ اب بنی نوع انسان کو بذات خود انفرادی طور پر خدا تک پہنچنے کی بجائے اجتماعات کی طرف دھکیلا جا رہا تھا۔ مثلاً ایسٹر آنے تک پورا ایک ہفتہ وہ یسوع کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان مقامات پر جا کر انجیل کی تلاوت کرتے جہاں یسوع نے آخری لمحات گزارے۔ مثلاً وہ مقام جہاں آخری مرتبہ رات کا کھانا کھایا گیا ۔۔۔ پھر وہ مقام جہاں یہوداہ اسکریوتی نے دھوکا دیا اور پھر وہ مقام جہاں گرفتاری عمل میں آئی۔ یہ موقع زبردست جذباتی کیفیت پیدا کرتے۔ ایجیریا بتاتی ہے کہ جب ہجوم گتسمنے چرچ میں بیٹھ کر یسوع کی گرفتاری کا انجیل میں درج احوال سنتا تو

شدت جذبات سے نڈھال ہو جاتا۔ تمام لوگ فرط غم سے اس طرح روتے سسکتے اور آہ و بکا کرتے کہ یہ گریہ زاری تقریباً پورے شہر میں سنی جاتی تھی۔(13) انسان یسوع کے لئے اب ایک نئی ہمدردی کا جذبہ بیدار کیا گیا۔ ہجوم کو سکھایا جاتا کہ یسوع کے دکھوں کو محسوس کر کے اس کے ساتھ عقیدت اور وابستگی پیدا کی جائے۔ اس طرح انہیں بتایا جاتا کہ ان دکھوں کے معنی یسوع کے لئے کیا تھے۔ یوزیبئس نے عیسائیوں کو کہا تھا کہ زمین پر یسوع کے عارضی قیام کے دوران بشری حیثیت سے اسل کو پیش آنے والے واقعات کو مطمع نظر نہ بنایا جائے۔ لیکن یروشلم کی رسومات اس کے برعکس تھیں۔ عیسائی اب حضرت عیسیٰ کی بشری حیثیت پر اپنی توجہ مرکوز کر رہے تھے۔ جب سے قسطنطین نے نیا یروشلم تعمیر کیا تھا۔ یعنی قبر اور گلگتا کی چٹان منظر عام پر لائی گئی تھی ہر روز گلگتا کی چٹان کے اردگرد اور اناستاسیس میں الگ الگ عبادات ہو رہی تھیں۔ یوں لوگ مصلوب ہونے کے واقعہ کو ایک عدیم المثال واقعہ کی حیثیت سے زیر غور لانے کے عادی ہو گئے تھے۔ گڈ فرائڈے کو لوگ ایک ایک کر کے چٹان کے پیچھے خانہ کلیسیا میں جاتے اور اصل صلیب کو چومتے۔ یوزیبئس نے سلیب دیئے جانے کے واقعہ میں کبھی زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اب یہ جذباتی تقریبات عیسائیوں کو مجبور کر رہی تھیں کہ وہ یسوع کی موت کے انسانی پہلو کو پیش نظر رکھیں اور غور کریں کہ کلام مجسم کے لئے مرنا کیا معنی رکھتا تھا۔

یہ معاملہ ایسا نہیں تھا کہ اسے نظر انداز کیا جاتا رہے۔ عیسائیوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ یہ طرز عمل انہیں خدا سے مربوط کر دیتا ہے۔ زائرین ایک لمسی روحانیت میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ ان پتھروں کو چھونا، چومنا اور چاٹنا چاہتے تھے جو یسوع کے لمس سے سرفراز ہو چکے تھے۔ جب جیروم کی شاگرد پاؤلا قبر پر آئی تو اس نے سب سے پہلے اس پتھر کو چوما جو ایسٹر کی اتوار کی صبح کو قبر کے منہ سے ہٹایا گیا تھا۔ پھر کسی پیاسے انسان کی طرح جسے طویل انتظار کے بعد پانی نصیب ہو پاؤلا نے گہری عقیدت کی پیاس بجھانے کے لئے اس جگہ کے ایک ایک انچ کو چوما جہاں یسوع کا لٹایا گیا تھا۔ (14) پاؤلا کا ہم عصر پالینس بتاتا ہے: سب سے بڑی کشش جو لوگوں کو یروشلم میں کھینچ لاتی ہے وہ ان مقامات کو دیکھنے اور چھونے کی خواہش ہے جہاں یسوع انسانی پیکر میں موجود تھا۔(15) دنیا کے دوسرے حصوں میں عیسائی مقلدین شہدا کی ہڈیوں کو چھو کر روحانی قوت محسوس کر لیتے تھے کیونکہ یہ ہڈیاں شہدا کی تقدیس و فضیلت رکھتی تھیں۔ عظیم مذہبی سکالر نیساز کا گریگوری (95-338ء) کہتا ہے کہ لمسی روحانیت کے طلب گار زائرین اس موقع پر اپنی آنکھیں، کان، منہ اور تمام حواس بروئے کار لاتے۔(16) چونکہ خدا انسانی پیکر میں زمین پر آیا تھا چنانچہ عیسائیوں نے اس انسانی پیکر سے وابستہ مقامات اور اشیاء کے لمس کو خدا سے رابطہ سمجھنا شروع کر دیا اور انہی کو برکت دینے والی قوت باور کر لیا۔ گریگوری نے فلسطین کا خود دورہ کیا اور اگرچہ وہ زیارتوں کے نئے انداز کے بارے میں تشکیک کا اظہار کرتا ہے لیکن اس نے تسلیم کیا کہ یروشلم کے مقدس مقامات یقیناً مختلف ہیں۔ ''انہوں نے زندگی کے نقش پا خود حاصل کئے ہیں۔(17) خدا نے اپنا سراغ فلسطین میں یوں چھوڑا ہے جیسے معطر لباس والے فرد کے چلے جانے کے بعد بھی کمرے میں دیر تک خوشبو رہتی ہے۔'' زائرین اب مقدس مقامات سے

پتھر، مٹی اور وہاں جلنے والے چراغوں سے تیل اپنے گھروں کو لے جاتے۔ایک زائر نے گڈفرائی ڈے کو صلیب مقدس کا بوسہ لیتے ہوئے واقعتاً صلیب مقدس کا ٹکڑا دانتوں سے کاٹ لیا۔زائرین برکت کے یہ موثر ذرائع اپنے گھروں میں رکھنا چاہتے تھے۔

مسیحی آثار قدیمہ کلکتا کی کھدائی کے ساتھ منظر عام پر آنا شروع ہوئے۔نئی کھدائی میں فلسطین کے مختلف علاقوں سے بزرگ شخصیات اور بائبل میں مذکور نامور افراد کی ہڈیاں برآمد ہوئیں۔جن ہڈیوں کو حضرت یوسف کی باقیات سمجھا گیا، وہ سیکم کے علاقے سے دریافت ہوئیں، اسے اب نیبولیس کہا جاتا تھا۔ان ہڈیوں کو قسطنطنیہ منتقل کر دیا گیا۔جیروم لکھتا ہے کہ جب سیموئیل نبی کی ہڈیاں فلسطین سے شاہی دارالحکومت کو لے جائی جارہی تھیں تو لوگ سڑکوں پر دورویہ کھڑے ہو گئے۔ انہیں محسوس ہورہا تھا کہ سیموئیل نبی زندہ سلامت وہاں سے گزر رہا ہے۔ (18) مقدس ہڈیوں کی منتقلی کا مقصد نئے مسیحی شہر قسطنطنیہ کا تعلق ماضی سے جوڑنا تھا، جس سے وہ بصورت دیگر محروم تھا۔لیکن یہ اقدام یہودی تاریخ کو مسند بنا رہا تھا۔اگر کلیسیا اپنے دعویٰ کے مطابق نیا اسرائیل تھا تو بھی یہ پرانے عہد نامہ کے بزرگوں کی پیروی کر رہا تھا۔415ء میں مشرقی سلطنت کے شہنشاہ تھیوڈوسیئس دوم نے یہودی بطریق گملی ایل دوم کی سرعام بے عزتی کی اور اسے پریفیکٹس پریسٹوریو کے منصب سے معزول کر دیا۔اس طرح شہنشاہ نے ایک ایسا عمل شروع کیا جس کے نتیجہ میں بطریق کا منصب بالاخر 429ء میں ختم ہو گیا۔کلیسیائی رہنماؤں کا خیال تھا کہ اب یہودیت کی ناگزیر موت کا مرحلہ تیزی سے آجائے گا۔(19)

دسمبر 415ء میں ایک کلیسیائی رہنما نے قدیم آثار کے حوالے سے ایک ایسی دریافت دنیا کے سامنے پیش کی جو یہودی بزرگوں کی اہانت سے تعلق رکھتی تھی۔ ساحلی میدانی علاقہ کے گاؤں کفرگمالا کے پریسبیٹر لوسیان نے خواب میں سینٹ پال کے ساتھ ربی گملی ایل اول کو دیکھا۔ اس عظیم فریسی نے لوسیان کو بتایا کہ اس نے مخفی طور پر عیسائیت قبول کر لی تھی۔یہودیوں کے خوف سے کبھی اس کا برملا اظہار نہ کر سکا۔جب پہلے مسیحی شہید ستفنس کو توریت اور ہیکل سلیمان کو توہین کرنے پر یروشلم کی دیواروں کے باہر قتل کیا گیا تو وہ یعنی گملی ایل اول اس کی نعش کو اپنے گاؤں کفرگمالا لے گیا اور وہاں اپنی زمینوں میں اسے دفن کر دیا۔بعد میں اسے بھی شہید نکودیمس کے پہلو میں دفن کیا گیا۔نکودیمس نوجوان یہودی تھا جس نے ایک دفعہ یسوع کے ساتھ رات کو خفیہ ملاقات کی تھی۔اگلے دن لوسیان نے کچھ تحقیق کی تو اسے سراغ مل گیا۔ تینوں قبریں برآمد ہو گئیں۔ان کے ساتھ عبرانی زبان کے وہ کتبے بھی مل گئے۔جن کے بارے میں گملی ایل نے خواب میں لوسیان کو بتایا تھا۔لوسیان نے فوراً اپنے بشپ کو اس حیرت انگیز دریافت سے مطلع کیا۔ان دنوں لیدا کے قریب منعقد چرچ کونسل کی صدارت یروشلم کا بشپ یوحنا کر رہا تھا۔کونسل نے برطانوی راہب پیلاگیئس کے قسمت

کا فیصلہ کرنا تھا جس پر مغربی عیسائیوں نے الزام عائد کر رکھا تھا کہ وہ گناہ آدم کے عقیدہ کو جھٹلاتا ہے۔یوحنا ذاتی طور پر پیلاگیئس کے نکتہ نظر کو نقصان دہ نہیں سمجھتا تھا۔اس نے جونہی لوسیان کی دریافت کے بارے میں سنا وہ یریجو اور سیباستے کے

بشپ کی معیت میں کفر گمالا کو روانہ ہو گیا۔ جب ستفنس کی قبر کھولی گئی تو فضا میں اتنی میٹھی خوشبو پھیل گئی کہ لوسیان بے اختیار چلا اٹھا ''یہ تو جنت کی ہوا ہے۔''(20) شہیدوں کی قبروں پر ایسی ہی کیفیت ہر جگہ محسوس کی گئی۔ ایسے روحانی بزرگ جواب جنت میں تھے ان کے جسم دنیا اور آخرت کے درمیان ایک تعلق تخلیق کرنے کا ذریعہ بن گئے۔ ایسی قبریں نئے مقدس مقامات بن گئے جو خدا کی موجودگی اور تسکین روح کی قوت رکھتے تھے۔ یورپ میں شہدا کی قبروں پر عقیدت مند اس مہک سے شفایاب ہو جاتے تھے جو شہدا کی دین کے لیے جاں نثاری کی کہانی بلند آواز سے پڑھے جانے پر پھیل جایا کرتی تھی۔ رسیلی خوشبو سے فضا معطر ہو جاتی اور لوگ روح القدس کی موجودگی محسوس کر کے چلا اٹھتے۔(21) اب کفر گمالا میں شہید اول کی قبر لوگوں کی توجہ کا مرکز تھی اور پورے فلسطین سے لوگ اس کا رخ کرنے لگے کہتے ہیں کہ ابتدائی چند دنوں میں 73 بیمار آدمی وہاں آ کر صحت مند ہو گئے۔

بشپ یوحنا چاہتا تھا کہ کفر گمالا زیارت کا مقام نہ بنے لیکن اس معجزہ کو اپنی پوزیشن بہتر بنانے کے لیے استعمال بھی کرنا چاہتا تھا۔ اپنے پیشروؤں کی طرح وہ بھی یروشلم کی مذہبی حیثیت کو بلند تر رکھنے کا خواہش مند تھا۔ اس نے حال ہی میں کوہ زیہون پر موجود باسلیق کی تعمیر نو کا کام سرانجام دیا تھا۔ وہ مادر کلیسیا کا درجہ برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ ستفنس کی تدفین نئے باسلیق میں کی جائے تا کہ کفر گمالا عیسائیوں کا نیا مرکز عقیدت نہ بن سکے۔ 26 دسمبر کو ستفنس کی ہڈیاں یروشلم منتقل کر دی گئیں۔ اگر چہ یہ دریافت عیسائیوں کے لیے تسکین روح و قلب تھی اور لوگ اس کی زیارت سے شفا پا رہے تھے لیکن یہودیت

کے لیے سوہان روح تھی۔ ستفنس کو اس لیے قتل کیا گیا تھا کہ اس نے توریت اور ہیکل کی توہین کی تھی چنانچہ یہودیوں کا مجرم تھا اور پھر یہ انکشاف کی عظیم ربی گملی ایل موجودہ بطریق کا ہم نام اور جدا امجد در پردہ عیسائی تھا بطریق کے منصب کے لیے یہودیوں کی وابستگی کو تباہ کر سکتا تھا۔ ابھی تک عیسائیت کا فروغ آبائی مذہب کے استرداد کی بنیاد پر تھا۔

تھیوڈوسیئس کا دربار رہبانیت کے جذبے سے سرشار تھا۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ وہ دربار کی بجائے کوئی خانقاہ لگتا تھا۔ شہنشاہ کی بہن پلچیہر یا دربار میں ایک مقدس کنواری کی طرح رہتی تھی۔ اس صورت حال میں یروشلم کے اندر اور ارد گرد رہبانیت اور خانقاہی زندگی کو عروج حاصل ہونا ایک ناگزیر نتیجہ تھا۔ جیروم کی مخالفت نے بالآخر میلا نیا اور روفینس کا تاثر یروشلم میں مجروح کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہیں 399ء میں واپس یورپ کا رخ کرنا پڑا۔ تاہم میلا نیا کی واپسی میں اس کے خاندانی امور نے بھی کچھ کردار ضرور ادا کیا۔ لیکن 417ء میں اس کی پوتی جسے میلا نیا جونیئر کے نام سے جانا جاتا تھا، اپنے خاوند پاویونیئس کے

ساتھ یروشلم میں آ گئی۔ ان دونوں نے کوہ زیتون پر ایک بہت بڑی خانقاہ تعمیر کروائی جس میں 180 راہب اور راہبائیں رہ سکتی تھیں۔ میلا نیا نے پوئے مینیا کے چرچ کے آگے برزگوں کے تبرکات کے لیے ایک درگاہ اور ایک مشہد بھی

بنوایا۔بیس برس بعد سلطنت آئبیریا کا شہزادہ پیٹر، یروشلم میں آیا۔(22) اس نے نام نہاد مینار داؤد کے مقام پر ایک خانقاہ تعمیر کروائی۔ یہ مقام دراصل ہیرودیس کے برج ہپی کس کا ایک حصہ تھا۔ وہ میلانیا کے لیے تبرکات کا ایک تحفہ بھی لایا جنہیں کوہ زیتون کے مشہد میں رکھا گیا۔

اب مسیحی دنیا کے تمام حصوں سے راہب صحرائے یہودیہ میں آباد ہونے کے لیے آ رہے تھے۔ انہیں یروشلم کا تقدس اس خوبصورت مگر بے آباد خطے میں کھینچ رہا تھا۔ ان ابتدائی راہب آبادکاروں میں ایک آرمینیا کا راہب یوتھیمئس (وفات 478ء) تھا۔ اس نے مصادا سے بیت لحم تک قابل دید مقامات پر پندرہ خانقاہیں بنوائیں۔ اسے اس کے ہم عصر آدم ثانی کہتے تھے۔(23) راہبوں نے ان خانقاہوں میں باغات اور پھلوں کے درخت لگائے۔ یہ علاقہ صحرا سے گلستان میں تبدیل ہو گیا۔ راہب اسے خدا کی سلطنت کہتے۔ ہر بستی یا خانقاہ ایک نیا باغ عدن تھا۔ ایک نئی شروعات۔ یہاں راہب خدا سے قرب حاصل کر کے جنت کی زندگی گزار سکتے تھے جس طرح پہلا آدم جنت میں رہتا تھا۔ یوں خانقاہیں بھی ایک نئی قسم کے مقدس مقامات تھے۔ تاریکی کی قوتوں کے خلاف ایسے مسیحی دفاعی حصار جن میں لوگ راہبانہ زندگی اختیار کر کے اس ابتدائی ہم آہنگی اور اطمینان کے طرف لوٹ سکتے تھے جس کے لیے نوع انسانی جدوجہد میں مصروف ہے۔ بہت جلد لاطینی، ایرانی، ہندوستانی، ایتھوپیائی اور آرمینیائی لوگ گروہ در گروہ صحرائے یہودیہ کی خانقاہوں میں آ گئے۔ یوتھیمئس کے بارسوخ شاگردوں میں سے ایک سباس (531-439ء) خاصی شہرت پائی۔ سباس نے دانستہ صحرائے یہودیہ میں آباد ہونے کا فیصلہ کیا۔ تمام مقدس مقامات کی طرح ایک خانقاہ کے لیے سباس کو خواب میں خدائی اشارہ ملا۔ وہ پانچ سال تک وہاں اکیلا رہا یہ خانقاہ یروشلم سے نو میل دور جنوب میں قدرون چشمہ کے سامنے ایک اونچی چٹان پر تھی۔

پھر اس کے شاگرد بھی اُسی مقام پہ آ گئے۔ لیکن ہر ایک الگ الگ خانقاہ میں رہتا تھا۔ شاگردوں کی تعداد بڑھتی گئی اور پھر صحرا میں خانقاہوں کا ایک نیا شہر ابھرا آیا۔ دنیا سے الگ تھلگ رہ کر، بھوک، نیند، جنس اور سماجی اختلاط کی فطری ضروریات کو رد کرتے ہوئے راہب سمجھتے تھے کہ وہ اپنے لیے ایسی انسانی قوتیں دریافت کر لیں گے جو خدا نے جنت میں آدم کو عطا کی تھیں۔ اس طرح وہ گناہ کے اثرات کو ختم کرنا اور خدا کی پاکیزگی میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ لیکن سباس کے پیش نظر ایک اور مقصد بھی تھا۔ اس کا سوانح نگار بتاتا ہے کہ۔۔۔ صحرا کو آباد کرنا اس لیے ضروری تھا کہ یسیعاہ نبی کی پیشین گوئیاں پوری ہو سکیں۔(24) یسیعاہ ثانی نے کہا تھا کہ ''۔۔۔ صحرا پھولوں سے لد جائے گا اور ایک نئے باغ عدن میں تبدیل ہو جائے گا۔'' اب سباس اور اس کے شاگرد راہبوں کو یقین تھا کہ ان مقدس آبادیوں کی وجہ سے انبیاء کی پیشین گوئیوں کے مطابق آخری و حتمی نجات کا مرحلہ قریب تر ہو گیا ہے لیکن اس کو حاصل کرنے والے اب یہودی نہیں بلکہ عیسائی ہوں گے۔

مسیحی یروشلم کے متعدد اداروں کی طرح، صحرائے یہودیہ میں نئی خانقاہوں نے بھی یہودیوں کے خلاف ایک محاذ

تشکیل دے دیا۔ اس کا المناک اظہار ملکہ یودوکیاہ (تھیوڈوسیئس کی بیوی) کے 438ء میں زیارات کے سفر کے دوران ہوا۔ یودوکیاہ نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ وہ ایتھنز کے معروف دانشور کی بیٹی اور خود ایک پڑھی لکھی خاتون تھی۔ اس کے لیے یہ بات ناقابل فہم تھی کہ یہودیوں کو ماہ ایو کی نو تاریخ کی عبادت کے علاوہ ہیکل کے مقام پر عبادت کی اجازت کیوں نہیں دی جاتی۔ بہت سے یہودیوں کو ملکہ یودوکیاہ کے ان خیالات نے خوفزدہ کر دیا۔ ملکہ کے اعلیٰ رتبہ نے عیسائیوں کو احتجاج کرنے سے روکے رکھا لیکن اضطراب پھیلتا رہا۔ یودوکیاہ کے خیالات نے البتہ یہودیوں کو نجات کی امید دلا دی۔ کہا جاتا ہے کہ فسلطین کے علاقوں میں ایک مراسلہ بھجوایا گیا جس میں یہودیوں پر زور دیا گیا کہ وہ سکوتھ کا تہوار منانے کے لیے یروشلم میں آیا کریں۔(25) اتفاق سے سکوتھ کا اگلا تہوار انہی دنوں میں تھا جب ملکہ نے یروشلم کا دورہ کرنا تھا۔ سکوتھ کے پہلے دن یودوکیاہ بیت لحم میں تھی۔ یہودی بڑی تعداد میں ہیکل کے پہاڑ پر جمع ہو گئے۔

لیکن وہاں صرف یہودی نہیں تھے۔ شام کا راہب برصعومہ جو یہودیوں کے خلاف ہنگامہ آرائی میں مشہور تھا، سکوتھ کا تہوار منانے کے لیے پہنچ چکا تھا۔ وہ خود تو پرامن انداز میں اپنی خانقاہ میں ٹھہرا رہا لیکن دوسرے راہب چبوترے پہ گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ کھنڈر کے اردگرد کھجور کی شاخیں ہلاتے ہوئے یہودی کئی صدیوں کے بعد پہلی دفعہ کوہ صیہون پر موجود تھے۔ برصعومہ کا سوانح نگار بتاتا ہے کہ اچانک آسمان سے پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ بہت سے یہودی پہاڑ پر ہی ہلاک ہو گئے۔ کچھ بھاگ نکلنے کی کوشش میں مارے گئے۔ ان کی نعشیں شہر کی گلیوں اور میدانوں میں پھیل گئیں۔ لیکن بچ رہنے والوں نے فوری کارروائی کی، برصعومہ کے اٹھارہ شاگردوں کو پکڑ لیا اور کھجور کی شاخیں ہلاتے ہوئے انہیں لیکر بیت لحم چلے گئے۔ ان شر پسند راہبوں کو ثبوت کے ساتھ ملکہ یودوکیاہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ دریں اثنا یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ راہب صحرائی خانقاہوں سے نکل دوڑے۔ یروشلم اور بیت لحم کی گلیاں راہبوں سے بھر گئیں۔ یودوکیاہ خطرے میں گھر گئی۔ راہبوں نے دھمکی دی کہ اگر پکڑے جانے والے راہبوں کو سزا دی گئی تو وہ یودوکیاہ کو زندہ جلا دیں گے۔ جب چھ دن بعد شاہی حاکم قیصریہ سے وہاں پہنچا تو یروشلم میں داخل ہوتے ہوئے خوف زدہ تھا۔ اسے قیدیوں کو صرف برصعومہ کی موجودگی میں ملنے کی اجازت دی گئی۔ مصالحت اس وقت ممکن ہوئی جب رومی گورنر نے رپورٹ دی کہ المناک واقعہ کی رات مرنے والے یہودی کسی قدرتی آفت سے ہلاک ہوئے تھے۔ برصعومہ نے ایک نقیب بھجوایا جو گلیوں میں اعلان کرتا رہا کہ ''صلیب جیت گئی۔'' لوگ اس اعلان پر خوشی سے پھٹ پڑے۔ برصعومہ کی ایک جلوس کی صورت میں کوہ زیہون پر لایا گیا اور وہاں پر موجود باسلیق میں فتح کی خوشی منائی گئی۔

یودوکیاہ کا دورہ ایک خوشگوار اقدام کے ساتھ مکمل ہوا۔ 15 مئی 439ء کو اس نے پہلے مسیحی شہید ستفنس کی یاد میں شہر سے باہر اس مقام پر ایک چھوٹی سی درگاہ کی رسم تقدیس ادا کی جہاں مبینہ طور پر اسے سنگسار کیا گیا تھا۔ اگلے روز وہ شہید کا ایک تبرک لیکر میلانیا کے مشہد میں کوہ زیتون پر پہنچی اور پھر واپس قسطنطنیہ روانہ ہو گئی۔ ناخوشگوار واقعہ کے باوجود وہ فلسطین سے

بہت خوش واپس گئی۔ 444ء میں جب خاندانی تنازعہ میں شہنشاہ کی پارسا بہن پلچیریا کے ساتھ اس کے اختلافات میں تندی آ گئی تو اسے یروشلم بھجوا دیا گیا۔ اپنی اعلیٰ تر حیثیت کی بدولت وہ فلسطین کی حکمران بن گئی۔ اس نے یروشلم کے اندر اور اردگرد بہت سے چرچ اور مہمان خانے تعمیر کروائے۔ ان میں سے ایک اس مقام پر بنوایا گیا جہاں حضرت عیسیٰ نے ایک نابینا کو بصارت بخشی تھی۔ یہاں سلعوم کا تالاب ہوا کرتا تھا۔ ایک چرچ کائفا کاہن کی رہائش گاہ کے مقام پر سینٹ پیٹر (پطرس رسول) کی یاد میں بنایا گیا۔ یہ مقام کوہ زیہون پر تھا۔ ایک عمارت ''مقدس دانش'' کی نسبت سے بنائی گئی۔ اس مقام کو غلطی سے پیلاطس کے پریٹر (پریتورین) کا مقام سمجھ لیا گیا۔ پریٹر، رومی حاکم کے محافظوں کی عمارت تھی جسے یوحنا کی انجیل میں قلعہ کہا گیا۔ یہ عمارت ہیکل کے پہاڑ کے مغرب میں وادی میں پائی جاتی تھی۔ یودوکیہ نے اپنے لیے ایک محل، ہیکل کے کلس کے سایہ میں بنوایا۔ بعد میں یہ عمارت چھ سو راہباؤں کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال میں لائی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یودوکیہ نے شہر کی ایک نئی فصیل بھی بنوائی۔ اس کے اندر شہر کی حدود جنوب کی طرف پھیل گئیں۔ ان مین کوہ اوفیل جس پر ''داؤد کا شہر'' آباد تھا اور کوہ زیہون بھی شامل تھے۔ (26)

یروشلم پہ فرمانروائی کے دوران یودوکیہ، یسوع مسیح کے بارے میں عقیدہ بشریت کے تنازعہ میں ملوث ہوگئی۔ 431ء میں ایفی سس کی کونسل نے قسطنطنیہ کے اقف اعظم نسطوریئس کے اس عقیدہ کی مذمت کر دی کہ مسیح دو حیثیتوں کا مالک تھا۔ ایک حیثیت میں بشر اور دوسری حیثیت میں خدا۔ بی بی مریم تھیوٹوکس یعنی خدا کو جنم دینے والی خاتون نہیں بلکہ بشر مسیح کی ماں تھی۔ کونسل برخاست ہونے کے بعد نسطوریئس کے حامیوں نے شام کے شمال میں اپنا الگ چرچ بنا لیا۔ کچھ اور عیسائی بھی تقلید پسند کونسل کے فتویٰ سے خوش نہیں تھے۔

قسطنطنیہ کے قریب ایک خانقاہ کے معمر صدر راہب یوٹانیکس نے نیا راستہ اختیار کر لیا۔ اس نے دعویٰ کر دیا کہ یسوع کی طرف ایک ہی حیثیت تھی۔ وہ کلام الٰہی تھا جو کنواری مریم کے بطن سے پیدا ہوا اور صلیب پر مارا گیا۔ اس عقیدہ نے تقلید پسندوں کو مشتعل کر دیا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ مسیح کو 'یک حیثیتی' کے قائل ان کی بشری حیثیت کو نظر انداز کر رہے ہیں جو الوہی حیثیت میں ضم ہو چکی تھی۔ شام، فسلطین اور مصر کے بہت سے بشپ اور راہب یک حیثیتی کے حامی تھے۔ انہوں نے قسطنطنیہ کی کلیسیا سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے یروشلم میں علیحدگی پسندوں کے چرچ تعمیر کر لیے۔ انہیں آج قبطیوں، ایتھوپیائیوں، آرمینیوں اور شامی یعقوبیوں کے چرچ کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ نہ صرف قومی خودمختاری کے حامیوں کی مدد کرتے تھے بلکہ مرکزی مذہبی سوال کا حل بھی چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ عالم بالا کو منتقال ہو جانے والی الوہیت انسانوں کی دنیا سے کیسے تعلق قائم کرتے ہیں۔ عیسائی البتہ ایک حیرت انگیز نتیجہ پر پہنچے تھے کہ خدا نے یسوع مسیح کے بشری روپ میں اپنے آپ کو بنی نوع انسان سے ہمیشہ کے لیے وابستہ کر لیا ہے۔

یودوکیہ جزوی طور پر، پلچیریا اور شاہی خاندان سے تنازعہ کی وجہ سے یروشلم کے عقیدہ یک حیثیتی رکھنے والے

عیسائیوں کی حامی تھی۔شہر کا نوجوان بشپ جوونیل بھی اسی عقیدہ کا مالک تھا۔روم کا بشپ، پوپ لیودی گریٹ، البتہ اس بات پر برہم تھا۔اس کا کہنا تھا کہ مقدس مقامات کے متولی، بشپ جوونیل کو ایسی تعلیمات کی نشر واشاعت سے گریز کرنا چاہیے جو یسوع مسیح کی بشریت کو رد کرتی ہیں۔حضرت عیسیٰ کے محبوب ترین شاگرد، سینٹ پیٹر کے جانشین کی حیثیت سے روم کے بشپ کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔اب پوپ لیو نے اپنے مقام ومرتبہ کا وزن عقیدہ تجسیم کے پلڑے میں ڈال دیا۔اس نے کلیسیا کی طرف سے سرکاری رسالہ ''ٹوم'' تحریر کیا جس میں دلیل دی گئی کہ اناجیل یسوع مسیح کی بیک وقت دونوں حیثیتوں، بشریت اور الوہیت پر زور دیتی ہیں۔اس نے دعویٰ کیا کہ یروشلم کے مقدس مقامات اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہیں کہ ''خدا نے اپنے آپ کو مادی دنیا سے مربوط کرلیا ہے۔ایک سو برس سے زیادہ عرصہ تک عیسائیوں نے مشاہدہ کیا تھا کہ یہ مقدس مقامات غیر متنازعہ انداز میں اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ مادی چیزیں جن کا تعلق یسوع مسیح سے رہا تھا انسانوں کو خدا سے متعارف کرنے کی قوت رکھتی ہیں۔یہ سب یسوع مسیح کی بشریت کی ٹھوس حقیقت یاد دلاتی ہیں۔لیو کے رسالے ٹوم نے کلیسیائی کونسل کو وہ متن مہیا کردیا جو 451ء کے اجلاس میں استعمال کیا گیا۔یہ اجلاس شہنشاہ کی بہن پلچیریا نے ایشیائے کوچک میں منعقد کیا۔اس کونسل میں بشپ جوونیل نے اپنی وفاداریاں تبدیل کر کے تقلید پسندوں کا ساتھ دیا۔صلے میں اسے وہ انعام دیا گیا جو میکاریوس کے دور سے یروشلم کے بشپ تمنا کیا کرتے تھے۔یروشلم کلیسیا کی مزہبی حیثیت کا درجہ بڑھا کر اسے اسقف اعظم کا درجہ اور پوپ کا منصب دے دیا گیا۔اسے اب قیصریہ، بیت شان اور پیتر اپر تفوق حاصل ہوگیا۔

جب یودوکیہ اور یروشلم کے عیسائیوں نے جوونیل کی بے وفائی اور انحراف کی خبر سنی تو ان کا ردعمل فطری تھا۔انہوں نے ایک نسطوری عیسائی (یک حیثیتی عقیدہ رکھنے والے) تھیوڈوسیئس کو اپنا نیا بشپ بنالیا۔جوونیل جب حفاظتی دستے کے ساتھ واپس گھر پہنچا تو ناراض راہبوں کے ہجوم صحرا کی خانقاہوں سے یروشلم میں امڈنے لگے۔جوونیل صحرا کو فرار ہوگیا اور قامران کے مغرب میں روبرا کے علاقے میں روپوش ہوگیا۔لیکن چرچ کی الجھن نے یودوکیہ کو اس وقت پریشانی میں مبتلا کردیا جب تھیوڈوسیئس 457ء میں انتقال کرگیا۔اس نے معروف شامی تارک الدنیا سائمن سے مشورہ مانگا۔سائمن نے مشورہ دیا کہ آرمینیائی راہب یوتھائمیئس سے رابطہ کیا جائے۔یوتھائمیئس کے دلائل سے یودوکیہ اتنی متاثر ہوئی کہ اس نے تقلید پسندوں کا عقیدہ تسلیم کرلیا۔اناستاسیئس، ایک تقلید پسند بشپ تھا اسے جوونیل کی جگہ اسقف اعظم مقرر کیا گیا تھا۔اس نے ''حیات نو'' چرچ کے قریب یودوکیہ کے بنائے گئے محل میں رہائش اختیار کرلی۔یودوکیہ کا آخری پراجیکٹ شہید ستفنس کے سادہ سے مزار کے ساتھ ایک چرچ اور خانقاہ کی تعمیر تھا۔جس کی رسم تقدیس اس نے 439ء میں ادا کی تھی۔ستفنس کی ہڈیاں 15 جون 460ء میں وہاں لائی گئیں۔چار ماہ بعد یودوکیہ خود بھی مرگئی۔اسے اسی چرچ میں دفن کیا گیا۔

یروشلم اب نیقیہ تقلید پسند مسلک کا مرکز تھا۔لیکن عقیدے کی مناقشت دوسرے کلیساؤں کے ساتھ ابھی جاری

تھی۔ بہت سے مشرقی عیسائی ایشائے کوچک میں منعقد ہونے والی کونسل کے فیصلوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ وہ مسلک کے معاملے میں دربار کے جبر کو بھی ناپسند دیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اگلے شہنشاہوں مثلاً زینو (91---474ء) اور اناستاسیئس (518---491ء) نے سلطنت میں انتشار کے خوف سے ان غیر مقلدوں اور قومی کلیسیا کے مخالفوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے گروہ بھی بازنطینی حکومت سے نالاں تھے۔ 485ء میں سامریہ کے لوگوں نے قسطنطنیہ سے علیحدگی اور خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ شہنشاہ زینو نے سفاکی کے ساتھ ان کی بغاوت کو کچل دیا۔ اس نے کوہ گرزیم پر ان کی قربان گاہ کو منہدم کر کے وہاں مقدس مری کے نام کا چرچ تعمیر کر دیا۔

عیسائی شہنشاہوں کے استبدادی ہتھکنڈوں سے محکوم علاقوں میں اجنبیت کا احساس تیز تر ہو گیا۔ انجام کار اس نے سلطنت کو شدید نقصان پہنچایا۔ شہنشاہ جسٹینین (65---527ء) ایک پرجوش تقلید پسند تھا۔ اس کی یک حیثیتی عقیدہ کے پیروکاروں کو مشرقی صوبوں میں دبانے کی پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں عوام کے سبھی حلقے حکومت سے متنفر ہو گئے۔ اس نے یہودیوں کے لئے بھی یہ بات ناممکن بنا دی کہ وہ سلطنت کی حمایت کریں۔ جیسٹینین کی تقلید پسندی کا تقاضا تھا کہ یہودیت کو پوری طرح پامال کر دیا جائے۔ چنانچہ اس نے ایسے احکامات جاری کئے جن کے نتیجہ میں یہودی متعدد حقوق سے محروم کر دیئے گئے۔ انہیں سول اور فوجی مناصب سے الگ کر دیا گیا۔ آئندہ ان کے تقرر پر پابندی عائد کر دی گئی۔ یہ پابندی طبریس اور سیفورس جیسے شہروں میں بھی رکھی گئی جہاں ان کی اکثریت تھی۔ ان کی عبادت گاہوں میں عبرانی زبان کا استعمال ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اگر عید فسح، ایسٹر سے پہلے آ جاتی تو یہودیوں کو اپنا یہ تہوار درست تاریخ پر منانے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن یہودی سرکش اور نافرمان رہے۔ بیت الفا کنشت تقریباً اسی دور میں گلیلی میں تعمیر کیا گیا۔ اس کی تعمیر ظاہر کرتی ہے کہ یہودیوں میں یروشلم کی بحالی کی امید ابھی تک زندہ تھی۔ کنشت کے فرش کی پچی کاری حضرت اسحاق علیہ السلام کو قربانی کے وقت باندھنے کا منظر پیش کرتی تھی۔ اسی طرح سکوتھ کے تہوار سے منسلک ترش پھلوں اور معبد کی مذہبی رسوم میں استعمال ہونے والی چیزوں کی شبیہیں فرش کے نقش و نگار میں شامل تھیں۔ سکوتھ کے تہوار کو کچھ یہودیوں نے میسحا سے وابستہ کر دیا تھا۔

شہنشاہ جسٹینین کی طرف سے مخالفین کو دبانے کی حکمت عملی کا ایک حصہ یروشلم کے اندر اور اردگرد عمارتوں کی تعمیر تھی۔ اس نے کوہ گرزیم پر شہنشاہ زینو کی فتح کا یادگار چرچ بحال کیا اور بیت لحم میں ولادت مسیح کا باسلیق دوبارہ تعمیر کیا جو ملکہ ہیلینا نے پہلی مرتبہ تعمیر کروایا تھا اور سامریہ کی بغاوت کے دوران اسے بری طرح نقصان پہنچا تھا۔۔۔ جسٹینین کی سب سے شاندار عمارت یروشلم میں مغربی پہاڑ کی جنوبی ڈھلوان پر مقدس مریم کا چرچ تھی۔ اس چرچ کی تعمیر کا منصوبہ راہب سباس اور اسقف اعظم الیاس نے شہنشاہ اناستاسیئس کے دور میں تقلید پسند مسلک کی ایک عمارت کے طور پر بنایا تھا۔۔۔ نے آ کے نام سے بننے والی یہ عمارت فن تعمیر کا ایک شاندار نمونہ تھی۔ جسٹینین نے اس کی ہیئت اور جسامت کے بارے میں واضح قسم کی

ہدایات دے رکھی تھیں۔اس کا حکم تھا کہ اگر پہاڑ پر مطلوبہ جگہ میسر نہ ہوتو پہاڑ کے پہلوؤں میں بڑے بڑے حجرے بنا کر چرچ، خانقاہ اور تین ہزار مریضوں کے لئے شفا خانہ کی عمارتیں ان پر تعمیر کی جائیں۔ نے آ، ایک منفرد عمارت تھی۔اس کی انفرادیت کا ایک پہلو یہ تھا کہ اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے کسی واقع ہکی نسبت سے نہیں بلکہ ایک عقیدے کی سر بلندی کے لئے تعمیر کیا گیا۔لیکن یہ عمارت شہر کے عیسائیوں کی مرکز نگاہ کبھی بھی نہ بن سکی۔ چناچہ جب یہ 746ء کے زلزلہ میں تباہ ہوئی تو کسی نے اس کی بحالی یا تعمیر نو کے بارے میں نہ سوچا۔۔۔تحریروں کے علاوہ اب یہ صرف یروشلم کے موزیک (پچی کاری) نقشے میں نظر آتی ہے۔ یہ مزیک شہنشاہ جسٹینن کے دور کے یروشلم کا خاکہ پیش کرتا ہے۔موجودہ اردن کے قصبہ مضابہ کے ایک چرچ سے یہ نقشہ 1884ء میں ملا تھا۔

مضابہ موزیک نقشہ میں دوستون نما گلیاں اور شہر کی مغربی معاون دیوار نمایاں ہیں۔ان کے علاوہ کوہ زیہون کا با سلیق اور مقدس دانش کا چرچ جو یودوکیہ نے بنوایا تھا۔(26) یہ پیلاطیس کے پریتورین کے مقام پر تھا۔ یہ نقشہ مسیحی شہر کے وہ خدوخال دکھاتا ہے جو قسطنطین کے دور سے ابھر رہے تھے۔فلسطین کو بائبل میں مقدس سرزمین کہا گیا ہے۔نقشہ میں نہ صرف بائبل کے مزکورہ مقامات دکھائے گئے ہیں بلکہ وہ نئی عمارتیں، یادگاریں اور خانقاہیں بھی شامل کی گئی ہیں جو یروشلم کی عیسائی دنیا کا مذہبی مرکز بناتی تھیں۔ یروشلم کا مقدس شہر نقشہ کے مرکز میں ہے۔حضرت عیسیٰ کی قبر کی دریافت سے پہلے عیسائیوں کو سکھایا جاتا تھا کہ زمین سے تعلق قائم نہ کیا جائے، ارضی زندگی کو کوئی اہمیت نہ دی جائے صرف اور صرف آسمانی یروشلم پر توجہ دی جائے۔لیکن چوتھی صدی عیسوی کے اختتام تک نئے مسیحی تصورات تشکیل پا گئے۔ان تصورات کی ایک جھلک روم کے سینٹ پوڈینزیانا کے چرچ میں موجود موزیک نقشے میں دیکھی جاسکتی ہے۔اس میں ''یسوع مسیح کو جنت میں اپنے شاگردوں کو وعظ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔پس منظر میں گلگتا کے مقام پر بنائی گئی قسطنطین کی نئے عمارتیں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔'' یوں یروشلم ایک مقدس مسیحی شہر بن چکا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ کبھی بھی امن وآشتی کا شہر نہ بن سکا۔شہر کی مقدس نوعیت کے ساتھ ساتھ عیسائی فرقوں کی داخلی کشمکش حریف مسلک کو دبانے اور اقتدار کے کھیل کی منفی روایات بھی موجود رہی ہیں۔

جب شہنشاہ جسٹینن اور زینو نے تقلید پسند عیسائیت کی طاقت کا زوردار اظہار کرنے کے لیے مقدس مریم کے نام پر چرچ تعمیر کئے۔یسوع خدا کی ماں اور اس کی گود میں شیر خوار یسوع۔۔۔۔۔کی تصویر تقلید پسندوں کی محبوب ترین چیز تھی کیونکہ یہ تجسیم کے مرکزی تناقض کو ظاہر کرتی تھی۔ یہ ظاہر کرتی تھی کو کلام الٰہی نے مجسم ہوکر دنیا کی محبت میں شیر خواری کے سنگین خطرات کو قبول کیا تھا۔کنواری مریم اور اس کے بیٹے کے درمیان رشتے کی نزاکت بنی نوع انسان کے لئے خدا کی حسیات محبت کی آئینہ دار تھی۔

'' اس نے اپنا دایاں بازو پھیلایا ۔۔۔ اور مقدس کنواری ماں نے اسے
اٹھایا اور اپنے بائیں بازو پر لٹالیا۔ پھر ماں نے اپنی گردن جھکائی اور
اپنے بالوں کو اس پر گرنے دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ پھیلائے، ماں کی
چھاتی کو تھام لیا اور دودھ پینے لگا جو ''من'' سے زیادہ میٹھا تھا۔''(26)

MAP (نقشہ)

تفصیل

MAP (نقشہ)

تفصیل (۱نمبر سے۱۲نمبر تک)

اسی انداز میں عیسائی زائرین پیار اور عقیدت کے ساتھ ان پتھروں اور لکڑیوں پر ہاتھ پھیرتے اور چومتے جن کو کبھی کلام مجسم نے چھوا تھا۔ اس انداز کی لمسی روحانیت ظاہر کرتی تھی کہ کس طرح تجسیم اور یروشلم کی مذہبی رسوم نے عیسائیوں کو اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ انسانی محبت کو معراج کا ایک ذریعہ سمجھ سکیں۔ لیکن یہ بات عیسائی روایت میں شامل نہ ہوسکی۔ یہ صورت حال بھی ایک المیہ ہے کہ الوہی دکھ کا دلدوز تصور عیسائیوں کو انسانی برادری کے لئے رحم و محبت کے جذبات سے سرشار نہ کرسکا۔ بدقسمتی سے کلام مجسم کے دکھوں نے یروشلم کے عیسائیوں کو اقتدار و اختیار کے لئے اپنی انا پرستی کو خود سے دور رکھنے میں مدد نہ دی۔
لیکن روحانیت کے لئے جسمانی اور حسیاتی ذریعہ نے بہت سے عیسائی زائرین کو ایک گہرا مذہبی احساس دیا۔ اس

نے یروشلم کو نیقیائی تقلید پسندی کا ایک قدرتی مرکز بنا دیا حالانکہ ابتدا میں یہ ایک حیثیتی مسلک کا مرکز تھا۔ 511ء میں جب شہنشاہ اناستاسیئس یروشلم کی کلیسیا پر یک حیثیتی مسلک کے اسقف اعظم کو مسلط کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو راہب سباس نے وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ مقدس شہر میں رہنے کا تجربہ راہبوں اور عام لوگوں کے لئے یہ بات ناممکن بنا چکا ہے کہ وہ یسوع مسیح کی بشری حیثیت کو نظر انداز کر دیں: ہم یروشلم کے باشندے اپنے ہاتھوں سے روزانہ ان مقامات کو چھو کر اس حقیقت کو محسوس کرتے ہیں جو ہمارے خدا اور نجات دہندہ نے یہاں چھوڑی۔(30) کچھ مقامات کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہاں حضرت عیسیٰ نے ٹھوس نشانات چھوڑے ہیں۔''اس نے واقعتاً پتھروں پر اپنی موجودگی ثبت کر دی ہے۔'' مثلاً اس کے پاؤں کے نقش اس چٹان پر دیکھے جا سکتے ہیں جو''صعود مسیح'' نامی چرچ میں موجود ہے۔اسی طرح ایک پتھر یودوکیہ کے چرچ میں موجود ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پیلاطس کے روبرو یسوع اسی پر کھڑے ہوئے تھے۔ (31) 530ء میں مغرب سے آنے والے ایک زائر تھوڈوسیئس نے یروشلم میں کوہ زیہون کے ایک ستون پر یسوع کے جسم کا نقش دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔

''۔۔۔۔(یسع) اس ستون سے چمٹ گیا جب اسے کوڑے مارے
گئے۔اس کے بازو، ہاتھ اور انگلیاں اس میں اس طرح ڈوب گئیں
جیسے یہ پتھر نہیں موم کا بنا ہوا تھا، یہ نشانات آج تک
محفوظ ہیں۔اس کا تمام بشرہ، اس کی تھوڑی، ناک اور
آنکھوں کے خطوط اس پر نقش ہو گئے۔۔۔''(32)

ستون سے چمٹ کر یسوع نے اپنی تدبیر میں خدا کی انسانوں کے ساتھ مادی دنیا میں بشری حیثیت سے دائمی مواصلت کا مستقل تاثر چھوڑا تھا۔یروشلم کا ارضی شہر اب الوہی قوت سے لبریز محسوس ہوتا تھا۔اور یہ سب کچھ یسوع کی یہاں مقدس سرگرمیوں کی بدولت تھا۔''یہاں پڑنے والی شبنم میں شفا بخش اثرات تھے۔'' قدیم زائر اینٹونینس جس نے 570ء کے قریب یروشلم میں قیام کیا، بتاتا ہے کہ'' عیسائی سلعوم اور بیت حصدا تالابوں میں غسل کیا کرتے تھے۔ان شفا بخش پانیوں میں نہا کر بہت سے مریض صحت مند ہو جایا کرتے تھے۔'' (33)

مقدس مقامات ایسے بت اور مورتیاں تھے جنہیں ملکوتی دنیا سے ایک اور رابطے کا ذریعہ سمجھنے کا آغاز ہو رہا تھا۔ رابطے کے ذریعے محض یسوع مسیح یا بزرگان عیسائیت کی تصاویر نہیں تھیں۔کسی بھی مذہبی علامت کی طرح یہ پراسرار انداز میں ایسی ملکوتی چیزیں تھیں جو زمین پر موجود تھیں۔آٹھویں صدی عیسوی کا راہب تھیوڈور (آف سٹوڈیوز) کہتا ہے۔۔۔''ہر

مصنوعی شبیہ۔۔۔اپنی صورت میں ۔۔۔نقل ہونے کی وجہ سے ۔۔۔اصل چیز کا نمونہ ہوتی ہے ۔۔۔ (34) چناچہ اسی طرح جو زائرین ۔۔۔یسوع کی نقل کرتے ہوئے شہر کے گرد عظیم جلوسوں میں اس کے نقش قادم پر چلتے تھے۔وہ خود بھی زندہ مورتیاں بن جاتے تھے۔عارضی طور پر ہر ایک بذات خود کلام مجسم بن جاتا تھا۔چنانچہ مقدس مقامات بھی محض یادگاریں اور نشان نہیں تھے۔بلکہ آسمانی چیزوں کی زمینی نقل تھے۔اسی دور کے ایک زائر کی امپولا (صراحی جو مقدس کام کے لئے استعمال میں لائی جاتی تھی) کے نقش ونگار میں گلگتا کی چٹان دکھائی گئی ہے جس پر جواہرات سے مرصع صلیب نصب ہے۔یہ صلیب تھیوڈوسیئس دوم نے عطیہ کی تھی۔صراحی پر چٹان اور صلیب کے ساتھ جنت کے چار دریا بھی چٹان سے پھوٹتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔جب زائرین گلگتا کی زیارت کو آتے تو انہیں وہ مقام دکھایا جاتا جہاں خدا نے آدم کو تخلیق کیا تھا۔گلگتا کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ جنت کا ایک حصہ ہے۔یہ زائرین کو جنت واپسی کا احساس بخشتا تھا۔اس دور میں زائرین قبر اور گلگتا کی زیارت جدید سیاحوں کی طرح نہیں کرتے تھے جو انہیں تاریخی مقامات کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ زمین پر یسوع کے عارضی قیام کے یہ تبرکات انہیں روحانی معراج بخشتے تھے۔

مسیحی یروشلم کی تخلیق نے شہر کے مقدس مرکز کو بدل دیا تھا۔پہلے یہ مرکز کوہ صیہون اور کوہ زیہون تھا۔جب زائر بورڈیاکس نے یروشلم کی زیارت کی تو اس نے زیارتوں کا آغاز ان پہاڑوں سے کیا اور پھر نئی عیسائی درگاہوں اور خانقاہوں پر گیا۔چھٹی صدی عیسوی میں عیسائی معبد کے چبوترے کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔وہ تمام ابتدائی واقعات جن کے بارے میں پہلے کہا جاتا تھا کہ کوہ صیہون پر رونما ہوئے تھے۔اب گلگتا کے مقام سے منسوب ہو چکے تھے۔یہی نیا یروشلم تھا۔زائر یاکس نے ہیکل کے پہاڑ پر زکریا نبی کا مقتل بھی دیکھا تھا اور فرش پر خون کے دھبے بھی۔اب زائرین کو بتایا جاتا تھا کہ زکریا نبی کا مقتل وہی مقام ہے جہاں پر قسطنطین کا مشہد ہے۔وہ قربان گاہ جہاں حضرت ابراہیم نے حضرت اسحاق کو باندھا اور جہاں ملک صدق نے قربانی پیش کی، یہودی کوہ صیہون پر بتاتے تھے لیکن اب کہا جاتا تھا کہ یہ مقام گلگتا ہے۔یہاں وہ سینگ بھی موجود تھا جس میں سے مقدس تیل لے کر حضرت داؤد اور حجرت سلیمان نے بپتسمہ لیا تھا۔یہیں حجرت سلیمان کی انگوٹھی (شاہی مہر) بھی رکھی ہوئی تھی۔(35) یہ تبدل وتغیر عیسائیوں کی طرف سے یہودیوں کی روایات پر ایک اور قبضہ تھا۔لیکن اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نئے یروشلم کا تقدس اتنا طاقتور تھا کہ اس نے پرانے یروشلم کی روایات اپنے مدار میں کھینچ لیں۔

لیکن مقدس شہر کی طاقت اپنے زمینی دشمنوں کو دور نہ رکھ سکی۔بازنطینی سلطنت کمزور اور داخلی انتشار کا شکار ہو چکی تھی۔اس کے محکوم علاقے قسطنطنیہ کی غلامی سے آزاد ہونے کے لئے بے تاب تھے۔610ء میں ایران کے بادشاہ خسرو روم نے بھانپ لیا کہ بازنطینی علاقوں پر حملہ کرنے کا یہ مناسب ترین وقت ہے۔اس نے بتدریج سلطنت کو نکلنا شروع کر دیا۔611ء میں انطاکیہ کا سقوط ہوا۔دو سال بعد دمشق بھی ہاتھ سے نکل گیا۔614ء کے موسم بہار میں ایرانی جرنیل شہر بار

نے فلسطین پر حملہ کر دیا۔ دیہات میں لوٹ مار کے ساتھ ساتھ ان کے چرچ جلا دیئے گئے۔ فلسطین کے یہودیوں کے پاس رومنوں کی بجائے ایرانیوں کی خوشگوار یادیں تھیں۔ وہ ایرانیوں کی مدد کے لئے آگے بڑھے۔ 15 اپریل 614 کو ایرانی فوج یروشلم کی دیواروں کے باہر خیمہ زن ہوگئی۔ اسقف اعظم زکریا ہتھیار ڈالنے پر تیار تھا لیکن نوجوان عیسائیوں کے ایک گروہ نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ انہیں یقین تھا کہ خدا انہیں کسی معجزے کے ذریعے بچالے گا۔ محاصرہ تین ہفتے تک جاری رہا۔ اس دوران ایرانیوں نے منظّم انداز میں بیرون شہر موجود تمام خانقاہیں، چرچ اور مزار منہدم کر دیئے۔ ان میں شہید ستفنس کا چرچ، ایلیونا باسلیق، اور صعود مسیح کا چرچ شامل تھا۔ مئی کے آخر میں یروشلم سرنگوں ہوگیا۔ قتل عام کے خوفناک مناظر دیکھنے میں آئے۔ اپنے چشم دید واقعات لکھتے ہوئے راہب انطیوکس سٹریطیوکس بتاتا ہے۔ کہ ایرانی سپاہی وحشی سوروں کی طرح غراتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے جو بھی ان کے سامنے آیا اسے قتل کر دیا گیا۔ عورتوں اور بچوں کو بھی نہ چھوڑا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق 66,555 عیسائی ہلاک ہوئے۔ شہر کو بدترین غارت گری کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کے تمام چرچ، خانقاہیں اور مشہد نزر آتش کر دیئے گئے۔ زندہ بچ رہنے والوں کو گھیر لیا گیا ان میں سے جو ہنر مند تھے یا اعلیٰ مناصب پر فائز تھے انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ ان میں اسقف اعظم زکریا بھی شامل تھا۔

جب شہر بدر کئے جانے والے لوگ کوہ زیتون پر پہنچے اور انہوں نے مڑ کر جلے ہوئے شہر کو دیکھا تو غم واندوہ سے پاگل ہوگئے۔ انہوں نے رونا اور ماتم کرنا شروع کر دیا۔ کچھ لوگوں نے سر پر خاک ڈال لی۔ اب حالات نے عیسائیوں کو وہ سب کچھ کرنے پر مجبور کر دیا تھا جو یہودی اپنی ماتم کی رسوم میں کیا کرتے تھے اور عیسائی انہیں تضحیک آمیز نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ زکیریا نے انہیں خاموش کرنے کے لئے مقدس مسیحی شہر کے لئے ایک نوحہ پڑھا جواب خدا کے تصور اور تاثر سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

اوصیہون۔۔۔ مجھے، اپنے خادم کو بھول نہ جانا
تمہارا خالق تمہیں کبھی نہ بھولے۔
اگر میں تمہیں بھول جاؤں۔۔۔ اے یروشلم
تو میرا دایاں ہاتھ مفلوج ہو جائے
اگر میں تمہیں یاد نہ رکھوں تو میری زبان
تالو سے چپک جائے
اے صیہون میں تیری پرستش کرتا ہوں
میں اس کی بھی پرستش کرتا ہوں جو تم میں مکین رہا۔(36)

عیسائیوں نے یروشلم میں اپنے تجربے کو یہودیوں سے بالکل مختلف رکھا تھا لیکن اب جب وہ اپنی باری پہ جلاوطن ہوئے تو فطری طور پر انہی حرکات وسکنات اور گریہ زاری پر اتر آئے جوان کے پیشرو کیا کرتے تھے۔ یہودیوں کی طرح وہ بھی ایک ہی سانس میں خدا اور صیہون کا ذکر کرتے۔ جلاوطنوں کے ساتھ وہ تبرکات بھی تھے جو مشہد (یادگار) میں رکھے ہوئے تھے۔ ان میں اصلی صلیب، وہ نیزہ جس کی انی مصلوب یسوع کی پسلی میں چبھوئی گئی تھی۔ سنگ سلیمانی کا پیالہ اور اسفنج جو مبینہ طور پر یسوع نے آخری رات کے کھانے میں استعمال کئے تھے۔ یہ سب کچھ ایران کی ملکہ مریم کی تحویل میں دے دیا گیا۔ وہ ایک نسطوری عیسائی تھی۔

اپنی پیش قدمی جاری رکھنے کے لئے جب ایرانی یروشلم سے نکلے تو شہر کو انہوں نے فلسطین میں اپنے حامی یہودیوں کے سپرد کر دیا۔ مسیحا کی امیدیں عروج پر پہنچ گئیں۔ یہودی چشم تصور سے اپنی سرزمین کو مسیحا کے ذریعے تطہیر کے مرحلے سے گزرتے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر نو دیکھنے لگے۔ اس دور کے کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ کوہ صیہون پر قربانی کی رسم انہی دنوں شروع ہو گئی تھی۔ سکوتھ کے دنوں میں ایک بار پھر جھونپڑیاں بنائی گئیں اور کھنڈر شہر کے دروازوں پر کھڑے ہو کر دعائیں مانگی گئیں۔(37) لیکن 616ء میں جب ایرانی واپس فلسطین میں آئے تو انہوں نے شہر کا انتظام خود سنبھال لیا۔ انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ اگر امن وامان قائم رکھنا ہے تو عیسائی اکثریت کو کچھ مراعات دینا پڑیں گی۔ ایرانیوں کی حمایت ختم ہونے پر یہودیوں کے لئے یروشلم کی بحالی کی امیدیں بھی ختم ہو گئیں۔

622ء میں بازنطینی شہنشاہ ہرقل نے ایرانیوں کے خلاف معرکہ آرائی شروع کر دی۔ چھ سال تک ایرانی علاقوں کو میدان جنگ بنائے رکھنے کے بعد بالاخر ہرقل ایرانی دارالحکومت کے مضافات میں پہنچ گیا۔ انہی دنوں خسرو ثانی ایک محلاتی سازش میں قاتل ہو گیا۔ ایران اور بازنطین میں مصالحت ہو گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے مفتوحہ علاقے واگزار کر دیئے۔ دونوں سلطنتیں طویل جنگ وجدل کے نتیجہ میں نڈھال ہو چکی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پھر کبھی نہ سنبھل سکیں۔ یروشلم کے عیسائی نہایت مسرور تھے۔ 21 مارچ 629ء کو ہرقل ایک شاندار جلوس کے ساتھ یروشلم میں داخل ہوا۔ یہ جلوس اصلی صلیب کو سربلند کئے شہر میں پہنچا۔ کوہ صیہون کی مشرقی دیوار میں ''گولڈن گیٹ'' ''فاتحانہ'' داخلے کے لئے بنایا جا چکا تھا۔ شہنشاہ شہر کی گلیوں میں سے گزرتا ہوا ''حیات نو'' تک گیا اور صلیب کو اس کے مناسب ترین مقام پر رکھ دیا گیا۔ ''قبر'' کے اردگرد مدور مزار اور مشہد دونوں کو 614ء میں شدید نقصان پہنچا تھا۔ لیکن عمارتیں ابھی ایستادہ تھیں۔ صحرائے یہودیہ کے ایک راہب موڈیسٹوس نے مرمت کا کام سنبھال لیا۔ اسقف اعظم زکریا چونکہ جلاوطنی کے دوران مر گیا تھا چنانچہ ہرقل نے موڈیسٹوس کو یروشلم کا اسقف اعظم مقرر کر دیا۔ ہرقل نے ایک فرمان کے ذریعے یہودیوں کو ایرانیوں سے تعاون کرنے پر سزا کی بجائے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ لیکن اسے محسوس ہوا کہ اب عیسائیوں کو مطمئن کرنے کے لئے کچھ اور

اقدامات کرنا پڑیں گے۔ چنانچہ ایک اور فرمان کے ذریعے یہودیوں پر ایک بار پھر یروشلم کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ کچھ یہودیوں پر عیسائیوں کے قتل کا الزام عائد کیا گیا۔ کچھ یہودی ایرانیوں کے قبضہ کے دنوں میں عیسائی عمارتوں اور عبادت گاہوں کو جلانے کے مجرم قرار پائے۔ انہیں سزائے موت دے دی گئی۔ بقیہ یہودی صحرا، مصر اور ایران کی طرف فرار ہو گئے۔ جو یہودی گلیلی میں مقیم رہے ان پر توریت کی سر عام تلاوت اور کنشت میں ہفتہ میں ایک سے زیادہ مرتبہ عبادت کی پابندی عائد کر دی گئی۔ 634ء میں شہنشاہ ہرقل نے اپنی سلطنت کے تمام یہودیوں کو حکم دیا کہ وہ بپتسمہ لیں۔ ایک بار پھر ایک عیسائی شہنشاہ نے اپنی یہودی رعایا کو مکمل طور پر دشمن بنا لیا۔ چنانچہ تین سال بعد سلطنت جب ایک بار پھر خطرے سے دوچار ہوئی تو ہرقل کے لئے یہودیوں کا تعاون حاصل کرنا ناممکن تھا۔

عیسائی فرط انبساط سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ جس طرح کافر شہنشاہ جولین کے اقتدار کے بعد ہوا تھا۔ ان کا مقدس شہر انہیں پھر واپس مل گیا۔ وہ دعوے کر رہے تھے کہ اب وہ اسے کسی قیمت پر اپنے ہاتھوں سے نہیں نکلنے دیں گے۔ پُر جوش تقلید پسند راہب صفرونیئس نے 633ء میں یروشلم کا اسقف اعظم بننے کے بعد شہر کی محبت میں دو نظمیں لکھیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اس کے پتھروں کو چومتا ہے اور مقدس مقامات پر بیٹھ کر روتا ہے۔ صفرونیس قابر یعنی مزار مقدس کو جنت ارضی قرار دیتا ہے۔

اے، ضوفشاں مزار،

تم دائمی زندگی کی ندی اور عالم اسفال کے سچے دریا ہو

میں سربسجود ہو کر اس پتھر کو چوموں گا

جو دنیا کا مقدس مرکز ہے

اس میں وہ درخت لگایا گیا

جس نے (آدم کے) درخت کی لعنت کو دور کر دیا

مبارک ہے صیہون۔۔۔ دنیا کا پرشکوہ سورج

جس کی تمنا میں، میں دن رات تڑپتا رہا۔(38)

یروشلم میں رہنے اور پھر جلاوطن ہونے کے تجربے نے عیسائیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ ایک بھرپور مذہبی جغرافیہ تشکیل دیں جو اس قسم کی اساطیر پر مبنی ہو جسے وہ ماضی میں حقیر سمجھتے رہے ہیں۔ اب وہ یروشلم کو دنیا کے مرکز کی حیثیت سے دیکھتے تھے جو زندگی، زرخیزی، نجات اور روشنی کا منبع ہے۔ اب چونکہ وہ اپنے مقدس شہر کے لئے ہزاروں جانوں کی

قربانی دے چکے تھے۔ چنانچہ یہ انہیں ماضی کے مقابلے میں بہت عزیز اور محبوب ہو گیا تھا۔ عیسائی شہنشاہ کو یروشلم کی بازیابی۔۔ایک خدائی کام سمجھا جا رہا تھا۔لیکن 632ء میں صفرونیئس کے اسقف اعظم بننے سے پہلے ایک پیغمبر جو یروشلم میں ہونے والے واقعات کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔۔عرب نو آبادی یثرب میں انتقال کر گیا۔ پانچ سال بعد اس کے دوستوں اور پیروکاروں پر مشتمل ایک فوج یروشلم کی دیواروں کے باہر فلک شگاف نعرے لگا رہی تھی۔

==========

حوالہ جات

1. John Chrysostom, Against the Jews 5: 11
2. Quoted in Yohan (Hans) Lewy, "Julian the Apostate and the Building of the Temp," in L. I. Levine, ed., The Jerusalem Cathedra: Studies in the History, Geography and Ethnography of the Land of Israel, 3 vols. (Jerusalem, 1921-83), 3:86. The other main account of this strange episode is in Michael Avi-Yonah, The Jews of Palestine: A Political History (Oxford, 1976), pp. 185-204.
3. Rufinus, Ecclesiastical History 10:38.
4۔ تالمود میں جولین کے منصوبہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔
5. Ammianus Macellinus, Perum Gestarum 28:1-2.
6. Lamentation Rabbah, 1:17-19 A.
7. Commentary on Zephaniah 1:15.
8. Commentary on Jermiah 31:38-40

9. Jerome, Epistle. 46:10, 108:33

مکتوب جیروم

10. .....do..... 54:12:5

11. .....do..... 58:4:4

12. Fro Egeria's Pilgramage, See the Pilgramage of St. Silvia of Aquitania to the Holy Places, Trans. John M. Bernard (London, 1891, New York 1971) pp. 11-77.

13. .....do..... p. 62.

14. Jerome, Epistle 108:6.

15. Paulinus of Nala, Epistle 49: 402.

16. Gregory of Nyssa, Encomium on St. Theodore.

17. Gregory of Nyssa, Epistle. 3:4.

18. Jerome, Against Vigilantius 5.

19. Avi-Yonah, Jews of Palestine, pp. 225-29.

20. Epistle of Lucian 8.

21. Peter Brown, the Cult of the Saints: Its Rise and Function in Classical Antiquity (London, 1981), pp. 81-82.

22۔ یہ علاقہ ہسپانیہ (سپین) نہیں بلکہ شمالی آرمینیا ہے۔

23. Cyril of Scythopolis, Lives of the Monks 24-5.

24. Life of Saba 90:50-10.

25. F. Nau, "Deux episodes de I' histoirejuive sous Theodose II (423 et 438) d'apres la vie de Barsauma le Syrien, "Revue des etudes juives 83 (1927).

26۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ''دیواریں'' دراصل یودوکیہ کے چرچ کی عمارت تھی۔
لیکن ابہام زبور کے گیت نمبر 51:18 سے پیدا ہوتا ہے۔''اس کی خوشنودی

کے لیے یروشلم کی فصیل کو تعمیر کر۔''

27۔ مکتوبات حواری 123 ,113 (Epistles)-

28. Michael Avi-Yonah, The Madaba Mosaic Map with Introduction and Commentary (Jerusalem, 1954).

29. Cyril of Jerusalem, Discourse on the Theotokos.

30. Robert L wilken, the Land Called Holy (New haven & London 1992) pp. 168-69.

31. Antoninus Martyre, On the Holy Places Visited trans. Aubrey Stewart, ed. C. W. (London, 1896), p. 23.

32. Theodosius, on the Topography of the Holy Land. (London, 1893) p. 45

33. Antoninus, On the Holy Places. pp. 24-27.

34. Cyril Mango, The Art of the Bysantine Empire, 312-1453: Sources and Documents (Englewood Cliffs, N.J.,1972), p. 173.

35. The Breviary or Short Description of Jerusaalem C. 530m trans. Aubrey Stewart, with notes by C. W. Wilson (London, 1890) pp. 14-15. Theodosius, Topography. p. 40 Antoninus, On the Holy Places- p. 19.

36. Strategos, Conquest of Jerusalem 14:14-16.

37. Book of Zerubbabel 11:69-71; Mishna Geul 78:1-69.

38. Anacreontics, Canto 20, PPTs, Vol. 11, p. 30.

=========

گیارھواں باب

بیت المقدس

حضرت محمد ﷺ بن عبداللہ، حجاز کے شہر مکہ کے نئے پیغمبر تھے۔ 610ء میں جب ان پر پہلی وحی نازل ہوئی تو کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ ایک عالمگیر مذہب کی بنیاد رکھنے والے ہیں۔ اسی سال خسرو ثانی علاقے پر حملہ کیا۔ حضرت محمد ﷺ مکہ کے تاجر تھے اور اپنی دیانت داری کے لئے بہت مشہور تھے۔ وہ شہر کی اخلاقی ابتری دیکھتے اور مضطرب اور پریشان رہتے۔ ان دنوں مکہ اپنی تاریخ کے ایک خوشحال دور سے گزر رہا تھا۔ لیکن اس مادی آسودگی کے براہ راست نتیجہ میں پرانی قبائلی اقدار پامال ہو رہی تھیں۔ معاشرے کے کمزور ارکان کی اعانت کی بجائے لوگ ذاتی مفادات کو ترجیح دیتے تھے۔ کچھ لوگ عرب میں رائج بت پرستی پر بھی عدم اطمینان کا اظہار کر رہے تھے۔ دنیا اب نئے دور میں داخل ہو رہی تھی چنانچہ انہیں بت پرستی مناسب معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اگرچہ وسیع طور پر سب کو معلوم تھا کہ اللہ۔۔۔ عرب قبائل کا خدائے بزرگ۔۔۔ وہی معبود ہے جس کی عبادت یہودی اور عیسائی کرتے ہیں لیکن وہ دوسرے دیوی دیوتاؤں کی پرستش میں اطمینان محسوس کرتے تھے۔ یہودی اور عیسائی لوگ عربوں کو طعنہ دیا کرتے تھے۔ کہ اللہ نے کبھی ان کو مخاطب نہیں کیا اور ان کا اپنا کوئی پیغمبر نہیں ہے۔

یہ صورت حال 610ء کے ماہ رمضان میں ہمیشہ کے لئے تبدیل ہوگئی جب حضرت محمد ﷺ نے خود کو مبہوت کر دینے والی الوہی موجودگی سے مغلوب پایا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک الہامی صحیفہ کے الفاظ ان کے ہونٹوں سے از خود ادا ہو رہے ہیں۔ پھر اگلے بائیس برس تک حضرت محمد ﷺ پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی رہی۔ ان کے پیروکاروں نے اس عربی صحیفہ کو جمع کر لیا جسے دنیا ''قرآن''۔۔۔ خوش خوانی کے نام سے جانتی ہے۔ بالآخر خدا عربوں سے ان کی زبان میں مخاطب ہو گیا تھا۔ خدا نے انہیں اپنے سچے ماننے والوں کی برادری میں شامل کر لیا۔ حضرت محمد ﷺ نازل ہونے والی وحی کو کوئی نئی چیز نہیں سمجھتے تھے۔ جو کچھ ان کے ذریعے منکشف کیا گیا وہ اسی ایک خدا کا مذہب تھا جس کی عبادت یہودی اور عیسائی کرتے آ رہے تھے۔ مکہ کے لوگوں کو کہا گیا کہ وہ اپنی زندگیاں خدا کی تسلیم و رضا (اسلام) کے سپرد کر دیں۔ اگر وہ اس

راستہ پر چلیں گے اور ایک منصفانہ اور شائستہ معاشرہ تشکیل دیں گے تو وہ آسودہ ہو جائیں گے اور ان خدائی قوانین کے تحت امن وسلامتی میں رہیں گے جو بقا کے لئے ضروری ہیں۔

اسلام کا مطلب کسی نامانوس کی اطاعت نہیں تھا۔ قرآن کے تناظر میں یہ ایک فطری عمل تھا۔ خدا نے روئے زمین پر موجود تمام قوموں میں اپنے پیغمبر بھیجے تھے تا کہ انہیں بتایا جائے کہ زندگی کس طرح بسر کرنا درست ہے۔ صرف اور صرف خدائی احکامات کے سامنے سر تسلیم خم کر کے لوگ انسانیت کے تقاضے پورے کر سکتے تھے۔ اس کے برعکس زندگی خدا سے بغاوت (کفر)، فطرت سے انکار، ناشکری اور بے راہ روی تھی۔ یہ دراصل حقیقت کی تکزیب تھی۔ اس کا انجام افراد اور معاشروں کی زندگیوں میں بدنظمی اور عدم اطمینان کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ ایک مسلمان جو خود کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے، اپنی زندگی میں اطمینان، مقصد اور درست سمت پا لیتا ہے۔ اس طرح وہ (مرد یا عورت) کم از کم اس ترتیب سے ہم آہنگ رہتا ہے جس ترتیب میں چیزوں کو ہونا چاہیے۔ اس طرح مسلمان اس حقیقی تکمیل کی طرف لوٹ رہے تھے جو خدا نے کائنات تخلیق کرتے ہوئے مردوں اور عورتوں کے لئے پسند کی تھی۔

ہم پورے اسلام کو، کامل انسان بنانے کی جدوجہد کے طور پر بھی دیکھ سکتے ہیں جو صرف جنت میں ممکن ہے۔ یوں یہ جدوجہد اس جنت کے حصول کے لئے ہے جو بنی آدم گنوا چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن یا اس کے پیغمبر ﷺ کا دنیا سے فرار یا خبطی ہونا سامنے نہیں آتا۔ حضرت محمد ﷺ نہ صرف ایک روحانی پیشوا تھے بلکہ اعلیٰ درجہ کی سیاسی بصیرت بھی رکھتے تھے۔ قرآن میں خدا بڑے واضح اور ٹھوس قسم کے قوانین دیتا ہے۔ مثلاً ذاتی مفادات کو مقدم رکھنا بدی اور دولت کی مساوی تقسیم کو نیکی قرار دیا گیا۔ سب سے پہلا مذہبی فریضہ ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کو قرار دیا گیا جہاں غریبوں اور ناداروں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ عبرانی انبیاء کی طرح حضرت محمد ﷺ عملی طور پر انسانی ہمدردی کے اولین فریضہ پر زور دیتے تھے۔ ''غریبوں، یتیموں، بیواؤں اور مظلوموں کی مدد ایک مسلمان کی بنیادی ذمہ داری ہے۔'' قرآن مذہبی عقائد کے کسی پیچیدہ قسم کے مجموعہ کو تسلیم کر لینے کا تقاضا نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایسے معاملات کے لئے مذہبی غور وفکر کی گنجائش ہی نہیں جنہیں کوئی بھی شخص کسی بھی طرح ثابت نہیں کر سکتا۔ یہودیت کی طرح اسلام میں خدا کی موجودگی راسخ الاعتقادی یا تقلید پسندی میں نہیں بلکہ اخلاقی احکام کی بجا آوری میں محسوس کی جاتی ہے۔

قرآن کے پیغام کی فوری مناسبت مکہ سے تھی اور پھر (جیسا کہ دیکھنے میں آیا) اس سرمایہ دارانہ انقلاب کی کشمکش میں تھی جس میں حضرت محمد ﷺ کے قبیلہ قریش کے کمزور افراد دولت کے حصول کی دھکم پیل میں ایک طرف دھکیل دیئے گئے تھے۔ اسلام کو قبول کرنے والے ابتدائی لوگ غلام، عورتیں اور غیر مراعات یافتہ افراد تھے جو بالخصوص غریب اور نسبتاً کم کامیاب طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ مکہ کی اشرافیہ بہر طور صورت حال کو جوں کی توں رکھنا چاہتی تھی۔ اس کے ارکان اس وقت خوفزدہ ہو گئے جب حضرت محمد ﷺ نے بتوں کی بجائے خدائے واحد کی عبادت کا حکم سنایا۔ اکابرین مکہ کے نزدیک

یہ اقدام آبا واجداد کی روایات سے ناپاک انحراف اور عرب کے قدیم مذہب سے برگشتہ ہونے کا عمل تھا۔ مکہ کی اشرافیہ نے مختصر سی مسلمان برادری کو جبر وتشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ 622ء میں پیغمبر اسلام ﷺ تقریباً ستر مسلمانوں کے ساتھ مکہ سے 250 میل دور جنوب میں یثرب کی بستی میں منتقل ہو گئے۔ اس ہجرت (نقل مکانی) کیساتھ ہی مسلمانوں کا اپنا دور شروع ہوا۔ اس مرحلہ پر حضرت محمد ﷺ اس حیثیت میں آ گئے تھے کہ اپنے نصب العین کو زیر عمل لا سکیں اور وہ پہلی برادری (امہ) تشکیل دے سکیں جس کا سماجی نظام اور روحانیت، قرآنی تعلیمات کی عملی تعبیر ہو۔

اگلے دس برس مسلمانوں کے لئے مشکل اور خطرناک تھے۔ ابھرتی ہوئی امہ کی ایسے خطرات درپیش تھے جس میں دشمن انہیں نیست و نابود کر سکتے تھے۔ ہجرت عربوں کے لئے ایک تکلیف دہ بلکہ توہین آمیز اقدام تھا۔ اپنے قبائل سے قطع تعلق کر کے مسلمانوں نے عربوں کی انتہائی مقدس روایات میں سے ایک کو توڑا تھا۔ یہ روایت خون کے رشتے کا تقدس تھی۔ انہوں نے خون کے رشتے توڑ کر یعنی دنیا میں اپنے حقیقی مقام کو چھوڑ کر ایک معاندانہ دنیا سے ناتا جوڑ لیا تھا۔ اس میں فرد اپنے قبیلے کی پشت پناہی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ امہ اب مکہ جیسے طاقتور شہر کے ساتھ جنگ کے مستقل خطرے سے دو چار تھی۔ اس بیرونی خطرے کے علاوہ انہیں یثرب کے یہودیوں اور بت پرستوں کی ریشہ دوانیوں کا بھی سامنا تھا۔ یہ لوگ مسلمانوں کے انقلابی معاشرے کا حصہ بننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ جس کی بنیادیں خاندانی رشتوں کی بجائے نظریات پر رکھی جا رہی تھیں۔ کچھ یہودیوں اور بت پرستوں نے حضرت محمد ﷺ کو قتل کرنے کی بھی سازشیں کی۔ بقیہ انہیں دھوکہ دے کر مکہ والوں کا ساتھ دینا چاہتے تھے۔ اگر یہ لوگ کامیاب ہو جاتے تو تمام مسلمان یقینی طور پر مکہ والوں کے نفرت آمیز انتقام میں ہلاک کر دیئے جاتے۔ خون ریزی اور ہلاکت کے واقعات بہر حال رونما ہوئے۔ مسلمانوں کو مکہ کے خلاف جنگوں میں کشت وخون سے گزرنا پڑا۔ پھر انہیں اپنی بقا کے لئے یہودیوں کے تین اہم قبائل کو شہر بدر یا تہتیغ کرنا پڑا۔ بلآخر پیغمبر ﷺ اسلام عرب دنیا میں امن لانے میں کامیاب ہو گئے جواب تک قبائلی تعصب اور انتقام کے لامتناہی سلسلے کو جاری رکھے ہوئے تھی۔ لیکن اب صورت حال بدل گئی۔ ایک کے بعد دوسرا قبیلہ حضرت محمد ﷺ کی امامہ میں شامل ہونے لگا۔ 630ء میں متکبر قریشیوں کا شہر مکہ بھی رضا کارانہ طور پر مسلمانوں کے آگے سرنگوں ہو گیا۔ حضرت محمد ﷺ اور ان کی فوج نے کسی خون ریزی کے بغیر اپنے آبائی شہر پر قبضہ کر لیا۔

اسلام کی پیدائش ہنگامہ خیز تھی لیکن قرآن کی تعلیمات امن وسلامتی اور اتحاد کا درس دیتی تھیں۔ لفظ اسلام سلم یعنی ''امن'' سے ماخوذ ہے۔ قرآن کا عظیم ترین نظریہ، توحید یعنی وحدت پیدا کرنا ہے۔ مسلمانوں کو اپنی انفرادی زندگیاں بھی اس طرح مرتب کرنا ہوتی ہیں کہ ان کی اولین ترجیح خدا بن جائے۔ جب انہیں یہ ذاتی تکمیل حاصل ہو جاتی ہے تو پھر انہیں اس میں وہ وحدت ملتی ہے جو خود خدا ہے۔ پورے انسانی معاشرے کو بھی یہ وحدت اور توازن حاصل کرنا اور اپنی تمام تر سرگرمیاں خدا کی سرپرستی میں لانا تھیں۔ یوں مسلمان ایک کبھی نہ ختم ہونے والی جدوجہد (جہاد) میں مصروف کر دیئے گئے جو

انسانی اور فطری دنیا میں چیزوں کو اس طرح بحال اور مرتب کرتی ہے جس طرح خدا نے تخلیق کے وقت انسانوں کے لئے چاہا تھا۔ نتیجتہً مذہب میں تقسیم پیدا کرنے والی کوئی فرقہ پسندی نہیں ہوتی چاہیے۔ ابتدا میں پیغمبر اسلام ﷺ سمجھتے تھے کہ یہودی اور عیسائی بھی اسی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں لیکن انہیں یہ جان کر صدمہ ہوا کہ وہ ایسے عقائد کے لئے لڑتے جھگڑتے ہیں جنہیں کوئی بھی فرد کسی طرح ثابت نہیں کر سکتا۔ یثرب کے یہودیوں نے انہیں مستند پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا اور اپنے دروازے مسلمانوں پر بند کر دیئے چنانچہ قرآن نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت ابراہیم کے حقیقی اور خالص مذہب کی طرف رجوع کر لیں۔ وہ مذہب جو توریت اور انا جیل سے پہلے پایا جاتا تھا اور حضرت ابراہیم یہودی یا عیسائی نہیں بلکہ صرف اور صرف مسلمان تھے۔ جنہوں نے اپنی پوری زندگی خدا کی تسلیم و رضا کے سپرد کر دی۔ (1) انہیں یثرب کے دوست یہودیوں سے معلوم ہوا کہ عربوں کو حضرت ابراہیم کے بیٹے حضرت اسماعیل کی اولاد سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ بھی یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح خود کو اولاد ابراہیم کہہ سکتے ہیں۔

MAP (نقشہ)

اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ اسرائیلی مقبوضہ مغربی کنارے میں زیتا کے مقام پر دو مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھ چوم رہے ہیں۔ امت مسلمہ میں یہ رسم پیغمبر اسلام ﷺ کے وقت سے چلی آ رہی ہے۔

پیغمبر اسلام کو علم تھا کہ تمام یہودی اور عیسائی فرقہ پرستی کے قائل نہیں چنانچہ یہودیوں اور عیسائیوں سے مخاصمت کے باوجود انہوں نے اپنے پیروکاروں پر زور دیا کہ وہ اہل کتاب، سابقہ الہامی صحیفوں کے ماننے والوں کا احترام کریں۔

''ان لوگوں سے جھگڑا مت کرو جو پہلی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں
بلکہ ان سے نرمی کے ساتھ پیش آؤ۔۔۔ان سے کہو کہ ہم اسی میں
ایمان رکھتے ہیں جو خدا نے ہمیں عطا کیا جس طرح تمہیں عطا کیا
گیا۔ ہمارا اور تمہارا خدا ایک اور وہی ہے۔ ہم سب اسی کے سامنے

جھکتے ہیں۔'(2)

قرآن بار بار اصرار کرتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے اس نے سابقہ پیغمبروں کی تعلیمات کو منسوخ نہیں کیا۔ ان میں حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت اسمایعل، حضرت ایوب، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حجرت سلیمان اور حضرت عیسیٰؑ شامل ہیں۔(3) قرآن محض اسی ایک پیغام کا اعادہ اور یاددہانی ہے جو خدا نے اپنے بندوں پر ماضی میں نازل کیا گیا۔ کسی ایک مسلک یا دستور کو خدا کی ترجیح قرار دے دینا بت پرستی کے مترادف ہے کیونکہ خدا تو تمام انسانی دساتیر سے بالا تر ہے۔ حضرت ابراہیم کے حقیقی مذہب کی طرف مراجعت کر کے مسلمان خدا کو ایک مذہبی ادارہ نہیں بلکہ زندگی کی منزل بنا رہے تھے۔

انسانوں کی مذہبی جد و جہد کے لئے ضروری وحدت کے اس خواب نے یروشلم میں مسلمانوں کی پالیسی متشکل کی۔ مسلمانوں کا مقدس جغرافیہ اپنے پیش روؤں سے بالکل مختلف تھا۔ ان کے ہاں تقدس کی تدریج نہیں تھی۔ چونکہ ہر چیز خدا کی طرف سے آئی تھی۔ اس لئے بنیادی طور پر اچھی تھی۔ یہودیوں کی طرح پاک اور ناپاک کی تقسیم بین الاثنین ضروری نہیں تھی۔ امہ کے پیش نظر خدا اور انسانوں کے درمیان یعنی داخلی اور خارجی دنیا، کے درمیان ایسی یک جہتی اور توازن پیدا کرنا تھا کہ ہر طرح کا امتیاز غیر ضروری ہو جائے۔ مسلمانوں کے ہاں نہ تو انسان کے گناہ گار ہونے کا تصور تھا اور نہ کسی شیطانی اقلیم کا جو خدا کے مد مقابل کھڑی ہو۔ یہاں تک کہ شیطان کو بھی روز حساب معاف کر دیا جائے گا۔ ہر چیز مقدس (مفید) تھی اور اس کی مقدس قوت (افادیت) کو ظاہر کرنے کے لئے اسے بنایا گیا تھا۔ اسی طرح ہر جگہ مقدس تھی اور کوئی ایک مقام دوسرے سے زیادہ مقدس نہ تھا۔ اگر چہ اسلام ایک حقیقت پسند مذہب تھا لیکن پیغمبرؐ اسلام جانتے تھے کہ انسانوں کو ایسی علامات کی ضرورت ہے جن کو وہ مقدس قرار دیکر ان پر توجہ مرکوز کر سکیں۔ چنانچہ ابتدائی دنوں ہی سے مسلمانوں کو سکھایا گیا تھا کہ تین مقامات کو دنیا کے مقدس مراکز کا احترام دینا ضروری ہے۔

ان میں سے پہلا مقام مکہ تھا۔ مکہ شہر کے عین وسط میں ایک قدیم مربع نما

سیاہ درگاہ ہے جسے خانہ کعبہ کہا جاتا ہے۔ اسے تمام عرب میں مقدس ترین مقام سمجھا جاتا تھا۔ ہر سال جزیرہ نما عرب سے تمام قبائل کے لوگ یہاں جمع ہوتے اور حج کی پیچیدہ اور محنت طلب رسوم ادا کرتے۔ ان میں عیسائی اور بت پرست بھی شامل ہوتے تھے۔ حضرت محمد صلی للہ علیہ وآلہ وسلم کے دنوں میں (فتح مکہ سے پہلے) کعبہ نبطی دیوتا ہبل کے لئے مخصوص تھا کعبہ میں اس بت کے ارد گرد عرب قبائل کے دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں بھی رکھی گئی تھیں لیکن یہ اصل میں بیت اللہ۔۔۔۔۔ عربوں کے خدائے بزرگ و برتر۔۔۔۔۔ کا گھر، تھا۔ دنیا میں پائی جانے والی مقدس جگہوں کی طرح کعبہ کے بارے میں بھی سمجھا جاتا تھا کہ یہ زمین کا مرکز ہے۔ جنت کا دروازہ اس کے بالکل اوپر پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں

عالم بالا نے خود کو انسانوں کی رسائی میں دیا ہوا تھا۔ کعبہ کی دیوار میں ایک سیاہ پتھر، شہاب ثاقب ۔۔۔نصب ہے۔ یہ ایک دفعہ آسمان سے گرا اور زمین اور آسمان کے درمیان تعلق کا ذریعہ بن گیا۔ یروشلم میں ہیرودیس کے معبد کے طرح مکہ کا مقدس مقام (حرم) حقیقت مطلق کے نمائندگی کرتا تھا۔ صندوق نما درگاہ زمین کی

علامت تھی۔ اس کے چاروں کونے ایک مرکزی مقام سے پھوٹتے تھے۔ عبادت گزار

خانہ کعبہ کے اردگرد دائرہ کی صورت میں ایک متوازن چال کے ساتھ طواف کرتے۔ طواف کے سات پھیرے سورج کی سمت میں رکھے جاتے۔ اس طرح عبادت گزار علامتی انداز میں خود کو کائنات کی حرکت اور آہنگ کی مطابقت میں رکھتے۔ یعنی درست سمت اور درست راستہ اپنانے کی سوچ پیدا کی جاتی۔ تقریباً تمام تہذیبوں میں دائرہ، تکمیل اور ابدیت کی علامت ہے۔ طواف کے پھیروں کے ذریعے عرب ارضی حقیقت سے نکل کر حقیقت مطلق میں مدغم ہونے کی کیفیت سے سرشار ہو جاتے۔ طواف ایک استغراقی عمل تھا۔ ایک ساکن چیز کے گرد متحرک ہونا۔۔۔ گھومتی ہوئی کائنات کا چھوٹا سا نکتہ۔۔۔ اس عمل سے گزرتے ہوئے حجاج اپنی سمت کا تعین کرنا سیکھتے ہیں۔ اپنا مرکز اور اپنی ترجیحات مرتب کرتے ہیں۔ آج بھی زائرین بتاتے ہیں کہ وہ جب دوسرے حجاج کے ساتھ مل کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں تو وہ اپنی ذات کو بھول جاتے ہیں۔ اپنی انا کے بندھن تحلیل کر کے دوسروں کے ساتھ ایک وحدت میں جذب ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ سب ایک ہیں۔ ایک قوم ہیں۔ کعبہ کی تقدیس کو بائیس میل پر محیط ایک نصف قطر کیے مقدس دائرہ میں تحفظ دیا گیا ہے۔ اس مقدس علاقہ میں ہر طرح کی ہنگامہ آرائی اور خون ریزی منع ہے۔ قبائلی جنگ وجدل کے وسیع میدان میں یہ امن وسلامتی کی جگہ تھی۔ یہی علاقہ مکہ کی کامیاب تجارت کا ذریعہ بنا۔ عرب یہاں پورے اطمینان کے ساتھ مل بیٹھتے اور دشمن کے حملہ سے بے نیاز ہو کر تجارت کر سکتے تھے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبہ سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ وہ حرم میں نماز پڑھنا، وہاں قرآن کی تلاوت کرنا اور طواف کرنا پسند کرتے تھے۔ عربوں کی روایات اور داستانوں میں کہا جاتا تھا کہ یہ ''مقدس گھر'' حضرت آدم نے تعمیر کیا تھا۔ چنانچہ خدا کی عبادت کے لئے دنیا میں بننے والا یہ سب سے پہلا معبد تھا۔ مکہ کا حرم باغ عدن تھا۔ یہاں (حضرت) آدم کو تخلیق کیا گیا۔ اس نے جانوروں کے نام رکھے۔ اور فرشتوں نے اسے سجدہ کیا۔ (4) چنانچہ مکہ گم گشتہ جنت کی نمائندگی کرتا تھا اور یہاں عبادت کرنے والوں کو لحاتی طور پر یہ جنت مل جاتی تھی۔ بعد میں معبد کی تعمیر نو حضرت شیث، حضرت آدم کے بیٹے نے کی۔ پھر حضرت نوح نے سیلاب عظیم کے بعد اسے تعمیر کیا۔ پھر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے اس کی تعمیر نو کا فریضہ سرانجام دیا۔ (5) آخری مرتبہ اسے مکہ کے قبیلہ قریش کے جدِ امجد قصی بن کلاب نے تعمیر کیا۔ عربوں کے نزدیک کعبہ حال کو ماضی سے مربوط کرتا تھا۔ انسان کو خدا سے ملاتا تھا۔ داخلی دنیا کو خارجی دنیا سے متصل کرتا تھا۔

لیکن جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اولین مسلمانوں کو خدا کی عبادت کا حکم دیا تو انہیں کہا گیا کہ وہ نماز

کے وقت اپنا رخ کعبہ کی بجائے یروشلم کی طرف کرلیا کریں۔خانہ کعبہ میں ابھی بت موجود تھے۔مسلمانوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ ایسے روحانی مرکز کی طرف اپنا رخ رکھیں جو صرف ایک اللہ سے نسبت رکھتا تھا۔یہودیوں اور عیسائیوں کا روحانی مرکز بھی یہی تھا جو صرف ایک اللہ کی عبادت کرتے تھے۔اس قبلہ (نماز کی سمت) نے مسلمانوں کو اپنے قبائل کے رشتوں سے نکال کر بنی نوع انسان کے ابتدائی مذہب کے بندھن میں باندھ دیا۔یہ اقدام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اہل کتاب کے ساتھ یک جہتی اور تسلسل کا اظہار بھی تھا۔جب جنوری 624ء میں یہ بات واضح ہوگئی کہ یثرب کے یہودیوں کی اکثریت حضرت محمد ﷺ کو قبول نہیں کرے گی تو امہ کو پرانی روایات سے آزاد کردیا گیا۔چنانچہ عبادت کے وقت مسلمانوں کو اپنا رخ یروشلم کی بجائے مکہ کی طرف رکھنے کا حکم دے دیا گیا۔قبلہ کی تبدیلی کو حضرت محمد ﷺ کے انتہائی مثبت اور تخلیقی اقدامات میں سے ایک قرار دیا جاتا ہے۔اس اقدام نے مسلمانوں کو حضرت ابراہیم کے اس ابتدائی اور اصلی مذہب کی طرف موڑ دیا جو یہودیوں اور عیسائیوں کے متحارب فرقوں میں بٹ جانے سے پہلے موجود تھا۔یہ ایک گم گشتہ اتحاد کی تلاش کا اقدام تھا جس کی نمائندگی قدیم خانہ کعبہ کرتا تھا۔یہ وہی کعبہ تھا جسے حقیقی مسلمان حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دوبارہ تعمیر کیا تھا۔چونکہ کعبہ سے یہودیوں یا عیسائیوں کی کوئی وابستگی نہ تھی چنانچہ مسلمان خاموشی سے یہ اعلان کررہے تھے کہ وہ کسی اور مذہب کے سامنے نہیں جھکیں گے بلکہ صرف اور صرف خدا کے سامنے سربسجود ہوں گے۔

> ''جن لوگوں نے اپنے دین کے اتحاد کو توڑا اور فرقوں میں بٹ
> گئے۔۔۔یقیناً تمہیں ان سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔۔۔
> کہہ دو۔۔۔میرے مالک نے مجھے ایک دائمی سچے دین کے
> ذریعے سیدھا راستہ دکھایا اور میری رہنمائی کی۔یہ راستہ
> ابراہیمؑ کا ہے جس نے تمام برائیوں سے منہ موڑ لیا اور وہ ان میں
> سے نہیں تھا جو شرک کرتے ہیں۔۔۔کہہ دو۔۔۔میری نماز،
> میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ
> اللہ کے لئے ہے۔''(96

قبلہ کی تبدیلی، مکہ کے مسلمانوں کے لئے تسکین کا سبب بھی تی جنہوں نے ہجرت کی اور اب یثرب میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔اس اقدام نے انہیں اپنی جڑیں کٹ جانے کے احساس سے نکال لیا اور انہیں اپنے گھر سے مقدس وابستگی کا برملا اظہار مل گیا۔

جب حضرت محمد ﷺ 630ء میں فتح کے بعد مکہ میں داخل ہوئے تو ان کا سب سے پہلا اقدام کعبہ کی تطہیر تھا۔ انہوں نے وہاں پڑے تمام بت ہبل سمیت توڑ دیئے اور خانہ کعبہ کو ان سے پاک کر دیا۔ اپنے انتقال سے دو سال پلے حضرت محمد ﷺ نے حج کا فریضہ ادا کیا۔ لیکن انہوں نے تمام پرانی رسموں کی تطہیر کر کے انہیں توحید پرستوں کے شایان شان بنایا۔ اب یہ رسمیں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ کے اس واقعہ کی یاد تازہ کرنے کے لئے تھیں جب حضرت ابراہیم انہیں بیابان میں چھوڑ گئے تھے۔ مکہ اب عالم اسلام کا مقدس ترین مقام اور حرم ان کے مذہبی تجربے کا علامتی اظہار تھا۔ قرآن مسلسل مسلمانوں کو یاد دلاتا ہے کہ ہم خدا کو صرف اس کی نشانیوں اور علامتوں (آیات) میں دیکھ سکتے ہیں۔ قرآن کے ہر جملہ کو ''آیت'' کہا جاتا ہے۔ آیت سے مراد جیتی جاگتی تصویر ہے۔ جنت اور روز حساب بھی علامتی اظہار ہے کیونکہ خدا اور اس کے کاموں کو انسان مجسم صورت میں ہی سمجھ سکتے ہیں۔ چنانچہ مسلمان علامتی انداز میں سوچنے کے عادی ہیں اور مکہ کی تقدیس کو اولین مقدس مقام کی حیثیت سے اسلام کے تصور کی مکمل قوت متحرکہ کا عکاس سمجھتے ہیں۔ جس طرح ایک خدا اور ایک مذہب نے اپنا ظہور مختلف صورتوں میں کیا۔ اسی طرح ایک ہی مقدس مقام ۔۔۔ مکہ ۔۔۔ کثیر الوجود تھا۔ اسلامی دنیا کے تمام ضمنی مقدس مقامات اپنی تقدیس مکہ سے حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ انہیں مرکزی مقام مقدس کی توسیع سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح کائنات خدا کی ایک آیت (نشانی) ہے اور اس کی موجودگی کا اظہار ایک مخصوص صورت میں کرتی ہے۔ اسلامی دنیا کے تمام دیگر مقدس مقام مکہ کے نمونہ پر بنے جو الوہیت کی تعمیراتی علامت ہے۔ یہ توحید، تقدیس اور کائنات کی وحدت کا علامتی اظہار ہے۔

مسلمانوں کے دیگر مقدس ترین مقامات میں سے ایک یروشلم ہے۔ وہ اس بات کو کبھی نہیں بھولتے کہ اہل کتاب کا یہ مقدس شہر ان کا قبلہ اول رہا ہے۔ یہ شہر ایک ایسی علامت رہا ہے جس نے انہیں اپنے اباواجداد کی کافرانہ رسوم نے منہ موڑ کر ایک نئے مذہبی خاندان کی تلاش اور ایک ممتاز اسلامی شناخت بنانے میں مدد کی تھی۔ یروشلم نے مسلمانوں کی علیحدگی کے تکلیف دہ عمل میں تسکین بخش مدد کی تھی چنانچہ یہ ان کے روحانی منظر میں ہمیشہ ایک اہم مقام کے طور پر موجود رہے گا۔ یہ اہل کتاب کے ساتھ اسلام کی قرابت اور تسلسل کی علامت رہا ہے لیکن یہودی اور عیسائی اس بات کو قبول کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوئے۔ مسلمان اسے مدینہ بیت المقدس ۔۔۔۔۔ معبد کا شہر کہتے ہیں۔ یہ ان کے توحید پرست پیشرووں کا ایک طویل عرصہ سے روحانی مرکز تھا۔ عظیم پیغمبروں، حضرت داؤد اور حضرت سلیمانؑ نے یہاں حکومت اور عبادت کی۔ حضرت سلیمان نے یہاں ایک مقدس مسجد بنائی۔ اس شہر کو متعدد عظیم پیغمبروں سے نسبت رہی ہے جن میں حضرت عیسیٰ بھی شامل ہیں۔ انہیں مسلمان بے پناہ عقیدت واحترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ البتہ انہیں خدا نہیں سمجھتے۔

بعد میں مسلمانوں نے دعویٰ کیا کہ حضرت محمد ﷺ بھی یروشلم میں گئے تھے۔ ان کا یہ سفر ایک ہی رات میں مکہ سے وہاں تک خدا نے معجزے کی صورت میں مکمل کیا۔

''پاک ہے وہ ذات، جس نے اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام
(قابل حرمت عبادت گاہ) سے مسجد الاقصیٰ (دور دراز واقع مقام
عبادت) تک پہنچا دیا، جس کے مضافات کو ہم نے برکت دی ہے۔
تا کہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔''(7)

مسجد حرام سے مراد تو یقیناً خانہ کعبہ ہے۔لیکن قرآن پاک میں دور دراز مقام، یعنی مسجد اقصیٰ سے مراد یروشلم کی وضاحت نہیں ہے۔ممکن ہے حضرت محمد ﷺ کے بعد کچھ عرصہ گزرنے پر مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ کو یروشلم قرار دے دیا ہو۔ ان مسلمانوں کا کہنا ہے کہ 620ء میں ہجرت سے ڈیڑھ سال پہلے، حضرت محمد ﷺ خانہ کعبہ کے سائے میں عبادت کر رہے تھے تو انہیں حضرت جبرائیل (فرشتہ) یروشلم لے گئے۔انہوں نے ایک پردار گھوڑے، براق پر سفر کیا اور یروشلم میں کوہ معبد پر اترے۔وہاں انہیں ان کے پیشرو انبیاء کے ہجوم نے مبارک باد دی۔پھر حضرت جبرائیل اور حضرت محمد ﷺ ایک سیڑھی (معراج) کے ذریعے سات آسمانوں پر چڑھے۔ہر آسمان پر ایک عظیم پیغمبر موجود تھے۔مثلاً حضرت آدم پہلے آسمان پر تھے۔پھر حضرت عیسیٰ، حضرت یوحنا، حضرت یوسف، حضرت نوح، حضرت ہارون، حضرت موسیٰ اور سب سے آخر میں خدائی سلطنت کی دہلیز پر حضرت ابراہیم تھے۔یہاں حضرت محمد ﷺ کو حتمی وحی موصول ہوئی جو انہیں انسانی ادراک کی حدوں سے بہت آگے لے گئی۔ان کا سب سے اونچے آسمان پر جانا، اسلام کا حتمی عمل تھا۔۔۔ایسی وحدت کو واپسی جہاں سے ہر وجود استخراج کرتا ہے۔حضرت محمد ﷺ کے رات کے سفر (الاسرا) اور آسمان پر جانے (معراج) کی داستان واضح طور پر یہودی انبیاء کے رویا کی یاد دلاتی ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ۔۔۔یہ مسلمانوں کے عقائد کو پرانے مذاہب سے یک جہتی اور تسلسل مہیا کرتی ہے۔ان کے پیغمبر کی کعبہ سے کوہ معبد تک پرواز مکہ کی تقدیس کو یروشلم، مسجد الاقصیٰ میں منتقل کرنے کی عکاس ہے۔ان دونوں شہروں کے درمیان ایک مقدس تعلق قائم ہوتا ہے۔

لیکن یروشلم کو اسلامی دنیا کے تیسرے مقدس ترین مقام کی حیثیت حاصل ہے۔دوسرا مقدس مقام، یثرب ہے جو پہلی امہ کا گھر ہے۔اسے مسلمان المدینہ کہتے ہیں۔مدینہ کا مطلب شہر ہے لیکن اسلامی اصطلاح میں المدینہ، نبی کا شہر ہے۔جب حضرت محمد ﷺ از پنے پیروکاروں کے چھوٹے سے گروہ کو مدینہ میں لے گئے تو مکہ یعنی اولین مقدس مقام کی تقدیس اس شہر کو بھی حاصل ہوگئی۔حضرت محمد ﷺ کے انتقال کے بعد مسلمانوں نے انہیں ایک کامل انسان کا محترم درجہ دیا۔ مسلمانوں نے کبھی انہیں خدا نہیں کہا۔حضرت محمد ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو ہمیشہ متنبہ کیا تھا کہ انہیں دیوتا اور معبود نہ بنا دیا جائے جس طرح عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کو معبود بنا لیا۔لیکن ان کا ایمان، پارسائی اور خدا کی اطاعت اتنی مثالی تھی کہ ان

کی ذات کو زمین اور آسمان کے درمیان ایک زندہ رابطہ (قطب) بنا دیا گیا۔ مسلمانوں نے مقدس مقام کی قرانی علامت پسندی کو مقدس انسانوں کے جدید مذہبی رجحان میں شامل کر دیا۔ یوں نیا تصور وضع ہوا کہ مقدس انسان اور مقدس مقامات عالم بالا اور عالم ارضی کے درمیان تعلق بن سکتے ہیں۔ مدینہ چونکہ نبی کا گھر تھا اس لئے یہ ایسا مقام بن گیا۔ جہاں آسمان زمین کو چھوتا ہے۔ خصوصاً روضۂ اقدس آسمانی رابطہ قرار دے دیا گیا۔ کیونکہ یہاں مقدس انسان کامل کا جسد خاکی موجود ہے۔ مدینہ اس لئے بھی متبرک تھا کہ یہاں امہ وجود میں آئی۔ توحید کے اصول کی طرح مستقبل کے تمام اسلامی شہر اور ریاستیں مدینہ کی ابتدائی تقدیس کی حصہ دار ٹھہریں۔ جو تمام انسانی زندگی کو اللہ کی حاکمیت کے تحت لانے کی کوشش کی ایک علامت بن چکا ہے۔

اسی طرح مستقبل میں عالم اسلام میں بننے والی تمام مساجد اسی پہلی مقدس مسجد کی نقل ٹھہریں جو پیغمبرؐ اسلام نے مدینہ میں بنائی تھی۔ یہ ایک سادہ اور کھردری سی عمارت تھی جو اسلام کے سادہ اور غیر مصنوعی رویہ کی ایک مثال تھی۔ تین ستونوں پر چھت ڈالی گئی۔ قبلہ رخ نشاندھی کے لئے ایک پتھر کے ساتھ ایک سادہ س منبر تھا جس پر کھڑے ہو کر حضرت محمد ﷺ لوگوں کے اجتماع سے خطاب کرتے۔ بعد میں بننے والی تمام مساجد میں چھتوں کا سہارا دینے والے ستون، محراب (قبلہ کا رخ متعین کرنے والا طاقچہ)، منبر (واعظ کے بیٹھنے یا کھڑے ہونے کا مقام) اس کے ضروری اجزا قرار پائے۔ مساجد میں صحن بھی رکھے جاتے ہیں جس طرح مدینہ والی مسجد میں ایک صحن تھا۔ اس صحن نے امہ کی ابتدائی زندگی میں اہم کردار ادا کیا۔ حضرت محمد ﷺ اور ان کی بیویاں صحن سے متصل چھوٹے چھوٹے کمروں (حجروں) میں رہتے تھے۔ شہر کے غریب اور نادار لوگ کھانا، خیرات اور ضروریات زندگی کے حصول کے لئے مسجد کے صحن میں اکٹھے ہو جاتے۔ مسجد کے صحن میں مذہبی، سماجی، سیاسی اور عسکری امور زیر بحث لانے کے لئے عوامی اجتماعات ہوتے۔ بالکل اسی طرح آج بھی مسلمان برادری میں مساجد محض مزہبی فرائض کیلئے مخصوص نہیں بلکہ ان میں سماجی و سیاسی اجتماعات بھی ہوتے ہیں۔

یہ بات یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے حیرت انگیز بلکہ پریشان کن بھی ہوتی ہے کہ مساجد کا استعمال مذہب کے لئے مخصوص نہیں۔ وہ اپنی عبادت گاہوں کو تقدس اس میں سمجھتے ہیں کہ انہیں دنیاوی سرگرمیوں کا مرکز نہ بنایا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ مسلمان اپنی مساجد اور مقدس مقامات کو واقعتاً مقدس نہیں سمجھتے کیونکہ مسلمان ان مقامات پر دوستوں سے گفتگو بھی کر لیتے ہیں اور سیاسی اجتماعات بھی منعقد کر لیتے ہیں۔ دراصل یہودی اور عیسائی، مسلمانوں کے تصور تقدیس کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ جب حضرت محمد ﷺ نے مسجد کے صحن میں اپنی بیویوں کے لئے حجرے تعمیر کئے تو دنیا کو یہ سمجھایا کہ خانگی، عائلی اور سماجی شعبے بھی دین کا ضروری حصہ ہیں۔ اسی طرح سیاسی، فلاحی اور اقتصادی امور کو بھی تقدس کے دائرہ کار اور خدا کی حاکمیت میں لانا ضروری ہے۔ چنانچہ اسلام میں پاکیزگی اور تقدس الگ تھلگ مقام کے لئے مخصوص نہیں بلکہ زندگی کے تمام امور کے لئے ہیں، مدینہ کے عیسائیوں کو مسجد میں عبادت کی اجازت تھی۔ یہ اسلامی روایت کا انجیل سے

تسلسل کا ایک مظاہرہ تھا۔ مساجد کثیر نوعی استعمال توحید کا مظہر تھا۔ تمام تر انسانی زندگی کے طیف کو مقدس بنانے کا عمل۔

(8) چونکہ ہر جگہ بنیادی طور پر مقدس ہے چنانچہ مساجد کو اپنے ماحول سے کاٹنے یا محصور کرنے کی ضرورت نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پیغمبرؐ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو نصیحت کی تھی۔۔۔ دنیا کو برا بھلا مت کہو۔۔۔ دنیا خدا ہے۔۔۔ اسی طرح قرآن بار بار مسلمانوں پر زور دیتا ہے کہ ''خوبصورتی کا احترام کرو اور دنیا کے نظام کو آیات سمجھو۔'' یہودی معبد کے پہاڑ پر درخت لگانا خلاف مذہب سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کو درخت لگانے اور دیکھ بھال کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ مساجد کے صحنوں میں فوارے لگانے اور خوب روشنی کے اہتمام کو پسندیدہ قرار دیا گیا۔ جمعہ کی نماز کے دوران پرندے مساجد کے ارد گرد اور اندر اڑتے پھرتے ہیں۔ دنیا کو مسجد کے اندر آنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اسے مسجد سے باہر نہیں رکھا جاتا۔ مدینہ کے اصول اور انداز یروشلم میں بھی پہنچے جو اسلام دنیا کا تیسرا مقدس ترین مقام ہے۔

حضرت محمد ﷺ کا انتقال 6 جون 632ء کو ہوا۔ تو وہ اپنی قیادت میں تقریباً پورے جزیرہ نما عرب کو متحد کر چکے تھے، لیکن اس خطے کے قبائل کا باہمی جنگ و جدل اس طرح مختص القوم تھا کہ پیغمبرؐ اسلام کی وفات کے بعد امہ کے بکھر جانے کا سنگین خطرہ موجود تھا۔ بہت سے قبائل جنہوں نے خود کو مدینہ (ریاست) سے وابستہ کیا تھا وہ مذہب سے زیادہ پیغمبرؐ اسلام کی ذات سے وابستہ تھے۔ چنانچہ ان کی وفات کے بعد ایسے قبائل نے ان کے جانشین (خلیفہ) حضرت ابوبکر کی اطاعت کرنا یا ''اسلامی خزانے'' کے لئے مذہبی ٹیکس (زکواۃ) ادا کرنا ضروری نہ سمجھا۔ کچھ ''مقامی نبی'' پیغمبرؐ اسلام کے حریف بن کر سامنے آ گئے۔ انہوں نے امہ (امت مسلمہ) سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ (حضرت) ابوبکر کو بنو اسد، بنی تمیم، بنو غطفان اور بنو حنیفہ جیسے باغی قبائل کے خلاف ایک سخت جوابی کارروائی کرنا پڑی۔ بغاوتوں پر کامیابی سے قابو پا لینے کے بعد (حضرت) ابوبکر نے ایک دانشمندانہ فیصلہ کیا۔ انہوں نے اسلامی ریاست کا داخلی تناؤ دور کرنے کے لئے امہ کی سرکش توانائیوں کو بیرونی دشمنوں کے ساتھ محاذ آرائی میں مصروف کر دیا۔ چنانچہ 633ء میں اسلامی افواج عراق، شام اور ایران میں عسکری کارروائیوں میں ایک دفعہ پھر مشغول ہو گئیں۔ 634ء میں (حضرت) ابوبکر کا انتقال ہو گیا۔ ایک اسلامی لشکر نے اس دوران ایرانیوں کو بحرین سے نکال دیا جب کہ دوسرے لشکر نے غزہ فتح کرنے کے بعد فلسطین کی سرزمین میں پیش قدمی شروع کر دی۔

یہ عسکری مہمیں کسی حد تک مذہبی مقاصد کے لئے نہیں تھیں۔ قرآن میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ اسلام کے لئے دنیا کو فتح کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ البتہ اس طرح کے اشارے ملتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں مزید عربوں کو امہ میں شامل کرنے کا کوئی منصوبہ بنایا تھا۔ 630ء میں انہوں نے جزیرہ نما عرب کے شمالی علاقوں میں عسکری مہمیں روانہ کی تھیں اس مرحلہ پر بہر حال اسلام ابھی عیسائیت کی طرح کوئی مشنری مذہب نہیں تھا۔ لیکن حضرت محمد ﷺ نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا کہ یہودیوں یا عیسائیوں کو زبردستی حلقہ بگوش اسلام کیا جائے۔ ان مذاہب سے تعلق رکھنے

والے لوگ اگر اپنی مرضی سے ایسا کرنا چاہتے تو اور بات تھی۔ کیونکہ وہ (حضرت محمد ﷺ) سمجھتے تھے کہ ان مذاہب کے پاس اپنی الہامی کتابیں موجود ہیں۔ ابتدائی دنوں میں مسلمان اسلام کو صرف عربوں کے لئے مخصوص مذہب قرار دیتے تھے۔ عرب حضرت اسماعیل کی اولاد تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جس طرح یہودیت حضرت اسحاق کی اولاد کے لئے مخصوص ہے اسی طرح اسلام حضرت اسماعیل کی اولاد کے لئے ہے۔ جدید مورخین نے اس تصور کو غلط قرار دے دیا ہے کہ اسلام قبول کرتے ہی بدوی عرب بیرونی دنیا پر اسلام مسلط کرنے کے لئے چڑھ دوڑے تھے۔ بہت سے مسلم جرنیل شائد دنیاوی مقاصد رکھتے تھے۔ دراصل صدیوں سے عرب صحراؤں میں بھٹکنے والے خانہ بدوش باہر نکل کر زرخیز وادیوں اور چراگاہوں تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اب تک انہیں پڑوس کی دو طاقتوں ایران اور روم نے روک رکھا تھا۔ لیکن جب طاقت کا خلا پیدا ہوا تو مسلمان اس خلا کو پورا کرنے کے لئے 633ء میں خرجی مہموں پر نکل کھڑے ہوئے۔ ایران اور روم (بازنطین) کی سلطنتیں کئی برسوں کی محاذ آرائی کے بعد نڈھال ہو چکی تھیں۔ ان دونوں سلطنتوں کی طرف سے ملازمت میں لئے گئے عرب سپاہی واپس آ کر مسلمان لشکروں میں سے شامل ہو چکے تھے۔ انہیں غیر ملکی حکومتوں کے لئے لڑنے کی بجائے اپنے بھائی بندوں کے ساتھ مہم جوئی کرنا زیادہ اچھا محسوس ہوا۔ مثلاً عرب سرحد پر قبیلہ غسان ایک عرصہ سے قسطنطنیہ کا کلائنٹ تھا۔ اس کی ذمہ داری یہی تھی کہ عرب خانہ بدوشوں کو بازنطینی سرحدوں سے دور رکھے۔ لیکن قبیلہ غسان اب قسطنطنیہ سے نالاں تھا۔ اس نے بازنطین سے اپنے تعلقات منقطع کر لئے تھے۔ چنانچہ اب وہ اپنے آپ کو عرب افواج کے ساتھ وابستہ کرنے پر تیار بیٹھے تھے۔ لیکن اس وابستگی کے پس منظر میں کسی قسم کی مذہبی دلچسپی نہیں تھی بلکہ عرب یک جہتی تھی۔ عراق اور شام میں آرامی اور سامی لوگ بھی عرب حملوں کو لاتعلقی سے دیکھتے تھے یا پھر ان کے حق میں جوش وخروش کا مظاہرہ کرتے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بازنطینی سلطنت کی استبدادی پالیسیوں نے حضرت عیسیٰ کی وحدت فطرت (یک حیثیتی عقیدہ) کے قائل عیسائیوں اور یہودیوں کی بہت بڑی آبادی کو سلطنت سے بیزار کر رکھا تھا۔ وہ بازنطینیوں کی مدد کرنے پر تیار نہیں تھے۔ یہودیوں نے تو بالخصوص مسلمان افواج کا فلسطین میں خیر مقدم کیا۔ ان بہت سے عوامل نے عرب لشکر کو اس قابل کر دیا تھا کہ وہ پرانی سلطنتوں کے ایک بہت بڑے علاقے کو نسبتاً آسانی سے تسخیر کر لیں۔

(حضرت) ابوبکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ بنے۔ وہ پیغمبرؐ اسلام کے پرجوش اور کٹر قسم کے ساتھی تھے۔ انہوں نے ایران اور بازنطینی سلطنتوں کے خلاف مسلمانوں کی عسکری مہمیں جاری رکھیں۔ اب مسلمان اگرچہ آسودہ حال ہو رہے تھے لیکن حضرت عمرؓ نے اسی طرح سادگی سے زندگی بسر کرنا جاری رکھا جس طرح پیغمبر اسلام کی زندگی تھی۔ وہ ہمیشہ ایک پرانا پیوند شدہ اون کا لمبا کرتا پہنتے تھے۔ اپنا سامان خود اٹھاتے۔ وہ چاہتے تھے کہ عام سپاہیوں کی طرح فوجی افسران بھی اپنا سامان خود اٹھایا کریں۔ یوں اسلام فلسطین میں ایک توانا مذہب کی حیثیت سے اپنے ابتدائی پُرجوش بہاؤ کے ساتھ پہنچا۔ بزنطینی شہنشاہ ہرقل اس کے برعکس اپنی زیادہ تر رعایا کو خود سے دور، مذہبی بحران سے افسردہ اور استبدادی طرز حکومت سے

مایوس کر چکا تھا۔لوگ خوف زدہ تھے کہ مسلمانوں کے حملے خدا کی برہمی کا نتیجہ ہیں۔عرب افواج نے فلسطین میں اپنی پیش قدمی برقرار رکھی۔ 20 اگست 636ء کو مسلمانوں نے جنگ یرموک میں بازنطینی فوج کو شکست دے دی۔ جنگ کے دوران غسانی قبیلہ بازنطینیوں سے الگ ہوکر اپنے ہم وطن عربوں سے آملا۔ یہودیوں کی مدد سے مسلمانوں نے بقیہ ملک کو تسخیر کرنا شروع کر دیا۔ ہرقل کچھ دیر کے لئے یروشلم میں رکا۔صلیب مقدس اٹھائی اور پھر فلسطین کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا۔ جولائی 637ء میں مسلمان فوج نے یروشلم کی دیواروں کے باہر اپنے خیمے نصب کر لئے۔

اسقف اعظم صفرونیئس نے دلیری کے ساتھ بازنطینی سپاہیوں کی مدد سے شہر کا دفاع کیا لیکن فروی 638ء میں عیسائی ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔(9) ایک روایت یہ ہے کہ اسقف اعظم نے خلیفہ (حضرت) عمرؓ کے علاوہ کسی اور کو شہر کی چابیاں دینے سے انکار کر دیا۔مسلمانوں کے ابتدائی ذرائع کا دعویٰ ہے کہ اس موقع پر (حضرت) عمر ذاتی طور پر موجود نہیں تھے۔انہوں نے بعد میں یروشلم کا دورہ کیا لیکن زیادہ تر مورخین کا کہنا ہے کہ شہر کی تحویل کے لیے حضرت عمرؓ خود آئے۔وہ اس وقت شام میں تھے اور چونکہ اسلام میں یروشلم کو ایک مقدس درجہ حاصل تھا اس لیے شہر کی تحویل کے تاریخی موقع پر انہوں نے خود وہاں آنا پسند کیا۔مورخین کا کہنا ہے کہ صفرونیئس گھوڑے پر سوار شہر سے باہر آیا۔ حضرت عمرؓ سے ملاقات کی اور خلیفہ کی پیش وائی کرتے ہوئے انہیں شہر میں لایا۔شاندار پوشاکوں میں ملبوس بازنطینیوں کے درمیان حضرت عمرؓ یقیناً ''بے جوڑ'' دکھائی دے رہے ہوں گے۔کیونکہ جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو اپنے معمول کا ادنیٰ ادنی لباس پہنے ہوئے سفید اونٹ پر سوار تھے۔عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے انہیں لباس تبدیل کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور شہر کی تحویل کی تقریب میں اسی طرح جانا پسند کیا۔کچھ عیسائی مبصرین کا خیال ہے کہ خلیفہ نے ریا کاری سے کام لیا۔وہ اس بات کو آسانی سے سمجھنے سے قاصر تھے کہ خلیفہ عمر مسیحی تصور ''مقدس غربت'' پر عیسائی منصب داروں سے زیادہ ایمانداری کے ساتھ کس طرح عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے بادشاہ داؤد کے علاوہ یروشلم کے کسی بھی فاتح کے برعکس توحید پرستوں کے نصب العین رحم و مروت کا بھرپور مظاہر کیا۔انہوں نے کسی خون ریزی کے بغیر جس طرح پرامن طریقے سے شہر کی تسخیر کا مرحلہ طے کیا،اس کی مثال شہر نے اپنی طویل اور المناک تاریخ میں نہ پہلے دیکھی تھی اور نہ دوبارہ دیکھ سکا۔جب عیسائیوں نے ہتھیار ڈال دیئے تو کوئی کشت وخون ہوا اور نہ غارت گری، مذہبی مقامات کو جلایا گیا اور نہ کسی کو جلاوطن کیا گیا۔لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں زبردستی مسلمان بنایا جائے گا لیکن ایسا کوئی فرمان بھی سامنے نہ آیا۔اگر شہر کے سابق قابضین کے لیے احترام کا مظاہرہ توحید پرست طاقت کے ساتھ یک جہتی کا اشارہ تھا تو بلاشبہ اسلام نے یروشلم میں ایک طویل دور کا آغاز بہت اچھے انداز میں کیا تھا۔

حضرت عمر نے مقدس مقامات دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو صفرونیئس انہیں لے کر سیدھا اناستاسیس (حیات نو) کے مقام پر پہنچا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی موت اور حیات نو کے مقام پر یادگار کی صورت میں موجود

عالیشان عمارت دیکھ کر مسلمان خلیفہ خوش نہ ہوئے۔قرآن،حضرت عیسیٰ کو عظیم ترین پیغمبروں میں سے ایک قرار دیتا ہے لیکن صلیب پر ان کی موت کو درست نہیں سمجھتا۔حضرت عیسیٰ کے برعکس،حضرت محمد ﷺ نے اپنی زندگی میں خیرہ کن کامیابی حاصل کی تھی۔چنانچہ مسلمانوں کے لئے اس بات کو تسلیم کرنا بہت مشکل تھا کہ خدا اپنے کسی پیغمبر کو ایسی رسوا کن موت مرنے کی اجازت دے سکتا ہے؟ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عرب مشرق قریب میں پائے جانے والے مانوی اور دوکیتی عقائد سے متاثر تھے جن کے مطابق یسوع محض مردہ نظر آیا تھا۔صلیب پر موجود پیکر محض ایک سایہ تھا۔ ورنہ خنوک اور ایلیا کی طرح یسوع اپنی دنیاوی زندگی کے اختتام پر جنت کو صعود کر گیا تھا۔دوسرا عقیدہ رکھنے والے لوگ کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ کا جسم مادی نہیں تھا۔وہ ایک نور تھے جنہیں صلیب کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔بعد میں مسلمانوں نے عیسائی کے عقیدہ صلیب پر موت کی تضحیک میں اناستاسیس (حیات نو) کو ''القیامہ'' (حیات نو) کی بجائے ''القمامہ'' (گوبر کا ڈھیر) کہنا شروع کر دیا۔لیکن حضرت عمرؓ نے اس طرح کی جارحیت کا مظاہرہ نہ کیا۔ورنہ فاتح حکمران ایسے مواقع پر تضحیک آمیز جارحیت کا ارتکاب ضرور کیا کرتے ہیں۔حضرت عمرؓ اناستاسیس میں ''قبر'' کے پاس کھڑے تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا۔صفرونیئس نے خلیفہ سے کہا کہ یہیں اپنی نماز پڑھ لیں انہوں نے شائستگی سے انکار کر دیا کہ وہ قسطنطین کے مشہد میں نماز نہیں پڑھیں گے۔وہ گرجا سے باہر نکلے اور اس کی سیڑھیوں پر مصروف شاہراہ کاردو میکسی مس میں نماز ادا کی۔بعد میں انہوں نے اسقف اعظم کو وضاحت سے بتایا کہ اگر میں نے کسی مسیحی مزار یا گرجا میں نماز پڑھ لی تو مسلمان اس پر قبضہ کر لیں گے اور اس بنیاد پر اسے اپنی عبادت گاہ بنا لیں گے کہ ان کے خلیفہ نے یہاں نماز ادا کی تھی۔حضرت عمرؓ نے اسی وقت ایک فرمان جاری کیا اور مسلمانوں کو منع کر دیا گیا کہ اس مشہد (گرجا حیات نو) کی سیڑھیوں پر آئندہ نماز نہیں پڑھی جائے گی اور نہ ہی یہاں کوئی مسجد تعمیر کی جائے گی۔(10) بعد میں انہوں نے ''نے آ'' میں نماز پڑھی اور

اس کے لئے بھی مسلمانوں کو پہلے جیسا فرمان جاری کر دیا گیا اور انہیں پابند کر دیا گیا کہ اس عمارت کو عیسائیوں کے ہاتھوں میں رہنے دیا جائے۔

مسلمانوں کو ایک ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں وہ کسی عیسائی املاک پر قبضہ کئے بغیر اپنی مسجد تعمیر کر سکیں۔حضرت عمرؓ مشہور معبد سلیمانی دیکھنے کے متمنی تھے۔الولید بن مسلم کی روایت ہے کہ صفرونیئس نے کوشش کی کہ مشہد (گرجا حیات نو) اور مقدس زیہون کے باسلیق کو '' مسجد

داؤد'' کے طور پر پیش کر دے لیکن پھر وہ حضرت عمرؓ اور ان کے ساتھیوں کو لے کر کوہ معبد پر چلا گیا۔ماضی قریب میں شہر پر ایرانیوں کے قبضہ کے بعد سے یہودیوں نے معبد کے چبوترے پر عبادت شروع کر دی تھی۔لیکن عیسائی معبد کے کھنڈر کو شہر کا کوڑا کرکٹ ڈھیر کرنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔مسلمان مورخ مجیرالدین کا کہنا ہے کہ جب حضرت عمرؓ معبد کے تباہ شدہ دروازوں پر پہنچے تو غلاظت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔کوڑے کے ڈھیر پورے معبد میں پھیلے ہوئے تھے۔معبد کے

دروازوں میں اس کے انبار دروازے کی چھت تک پہنچ چکے تھے۔ (11) معبد کے چبوترے تک پہنچنے کے لیے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل رینگنے کی ضرورت تھی۔ سب سے پہلے اسقف اعظم صفرونیئس آگے بڑھا اور پھر مسلمانوں نے اس کی تقلید کی۔ معبد کے وسیع وعریض لیکن اجڑے ہوئے چبوترے، کو دیکھ کر مسلمانوں کو سخت صدمہ ہوا۔ ایک پیغمبر سے منسوب مقدس مقام جس کی شہرت عرب کے دور دراز مقامات تک پہنچی ہوئی تھی، انتہائی افسوسناک حالت میں تھا۔ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے معبد سلیمانی کی حالت زار دیکھ کر انتقاماً ''حیات نو'' کی یادگار کو القمامہ (گوبر کا ڈھیر) کہنا شروع کیا تھا۔

حضرت عمرؓ اس موقعہ پر محض کھنڈروں کا معائنہ کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتے تھے۔ یہ صورت حال ان کے لئے نا قابل برداشت تھی۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے کوڑے کا ایک ڈھیر اپنی جھولی میں ڈالا اور شہر کی دیوار سے وادی حنوم میں پھینک دیا۔ ان کے ساتھیوں نے بھی فوراً تقلید کی۔ (12) صفائی کا یہ عمل قسطنطین کے دور میں گلگتا کی کھدائی سے مختلف نہ تھا۔ ایک بار پھر، ایک نیا فاتح مذہب یروشلم میں اپنے قیام کے لئے سابقہ قابضین کے ناپاک ملبے کی کھدائی کر کے پرانی بنیادیں تلاش کر رہا تھا۔

یروشلم میں مسلمانوں کی آمد زبردست اہمیت رکھنے والا ایک تاریخی موقع تھا۔ ہجرت کے موقع پر اولین مسلمانوں نے بڑے دکھ کے ساتھ اپنے گھروں اور مقدس مقام سے ناطہ توڑا تھا۔ اب مسلمان فوجوں نے ایک ایسی دنیا میں داخل ہونا شروع کیا تھا، جس کی تہذیب وتمدن عربوں سے بہت مختلف تھے۔ عرب ابھی جدید تہذیب سے بہت دور تھے انہیں اب ایسی اساطیر، مذاہب اور سیاسی روایات کا مقابلہ کرنا تھا جو ان کے مذہب کے لئے چیلنج بن سکتی تھیں۔ اسلامی فوجیں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں لیکن اس پیش قدمی کی وجہ سے وہ اپنی جڑوں سے دور ہوتے جا رہے تھے البتہ اب ان کے قبضہ میں بیت المقدس تھا جو ان کا پہلا قبلہ اور کچھ عظیم انبیاء کا شہر تھا۔ یہ ایک قسم کی ''گھر واپسی'' تھی۔ اپنے مذہبی آباواجداد کے شہر میں جسمانی واپسی۔ اسلام اب یہاں قدیم روایات سے اپنی پیوندکاری کر سکتا تھا جو ایک طرح سے قرآنی بصیرت کی وحدت اور تسلسل کی علامت تھیں۔ دنیا کو تقدیس دیں جو خوفناک حد تک ناپاک کیا جا چکا تھا۔

جب چبوترہ صاف ہو گیا تو حضرت عمرؓ نے کعب ابن احبار کو طلب کیا۔ یہ یہودی النسل نومسلم یہودی علوم ''اسرائیلیات'' کا ماہر تھا۔ فطری بات ہے کہ مسلمانوں کو یہودی اکابرین سے منسوب مقام کی ترتیب وآرائش کے لئے یہودیوں سے ہی مشورہ کرنا چاہیئے تھا۔ یہودی اور مسلمان دونوں ذرائع اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہودیوں نے معبد کے مقام کو آراستہ کرنے میں بھرپور حصہ لیا۔ دسویں صدی عیسوی کا ممتاز مورخ ابوجعفر الطبری بتاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کعب کے ساتھ اپنی گفتگو کا آغاز قرآن کی سترہویں اور اٹھارویں سورتیں تلاوت کر کے کیا۔ ان سورتوں میں حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور معبد کے واقعات شامل ہیں۔ پھر انہوں نے کعب سے کہا کہ کہو معبد پر وہ اس بہترین مقام کی نشاندہی کرے جہاں عبادت کی جا سکے۔ کعب نے پہاڑ کے شمال میں ایک مقام تجویز کیا جس کے بارے میں سمجھا جاتا ہے اور یہ

یقیناً غلط طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہ خانہ اقدس یعنی دیور کا مقام تھا۔ اگر مسلمان وہاں پر عبادت کرتے تو ان کا رخ مکہ کے ساتھ ساتھ یہودیوں کے مقدسوں کے مقدس کی طرف بھی رہتا۔(13) لیکن یہ روایت من گھڑت ہے کیونکہ اس واقعہ کے پچاس سال بعد مسلمانوں نے سنجیدگی کے ساتھ اس چٹان میں دلچسپی لینا شروع کی لیکن یہ روایت اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ مسلمان پرانے مذاہب یا عقائد کے بارے میں اسلام کے آزادانہ نکتہ نظر پر قائم تھے۔ حضرت عمرؓ نے کعب کی تجویز مسترد کر دی اور چبوترے کے جنوب میں ہیرودیس کی شاہی بالکنی کے مقام پر اپنی مسجد تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ موجودہ مسجد الاقصیٰ اسی مقام پر ہے۔ یہاں نماز پڑھتے ہوئے مسلمانوں کا رخ صرف مکہ کی طرف رہتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے وقت بننے والی مسجد لکڑی کی سادہ سی عمارت تھی۔ جو اسلام کی ابتدائی سادگی پسند روایت کا مظہر تھی۔ سب سے پہلے اس کا ذکر کرنے والا مورخ ایک عیسائی زائر آرکلف تھا۔ اس نے 670ء میں یروشلم کی زیارت کی اور اس سادہ سی عبادت گاہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا جو ماضی کے عالیشان معبد کی جگہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے لکھا:

''مسلمان ایک چوکور عبادت گاہ میں بار بار آتے ہیں۔ یہ عبادت گاہ
انہوں نے تختوں اور بڑے بڑے ستونوں کی مدد سے کھنڈر کی باقیات
پر بھدے طریقہ سے بنائی ہے۔ یہ اس قدر وسیع ہے کہ تین ہزار
عبادت گزار بیک وقت وہاں جمع ہو سکتے ہیں۔''(14)

وقت کے ساتھ ساتھ علاقے کے عربوں نے اسلام قبول کر لیا اور مسجد عمر میں جمعہ کی نماز کے لئے آنے لگے۔ شہر کے کسی عیسائی باشندے کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا گیا۔ آٹھویں صدی عیسوی تک لوگوں کو مسلمان بنانے کی کوئی تحریک موجود نہیں تھی۔ طبری اپنی تاریخ میں اس معاہدے کا ایک اقتباس درج کرتا ہے جو حضرت عمرؓ اور یروشلم کے عیسائیوں کے درمیان طے پایا۔ بلاشبہ یہ غیر مستند نہیں ہے اور مفتوحہ علاقہ کے لوگوں کے لئے مسلمانوں کی پالیسی کا مکمل آئینہ دار ہے۔

''عمرؓ کی طرف سے ضمانت دی جاتی ہے کہ عیسائیوں کا ہر فرد اور ان
کی املاک محفوظ رہیں گی۔ ان کے گرجاؤں اور صلیبوں کو نقصان
نہیں پہنچایا جائے گا۔ ان کے بیماروں اور صحت مندوں اور انکے مذہب
سے وابستہ کسی فرد کو گزند نہیں پہنچے گا۔ ہم ان کے گرجاؤں

میں مسلمان سپاہیوں کو تعینات نہیں کریں گے۔ ہم ان کے گرجاؤں کو
نہ تو مسمار کریں گے اور نہ ان سے متعلقہ اشیاء یا املاک یا صلیبوں یا
کسی اور چیز کو نقصان پہنچائیں گے۔ ہم یروشلم کے لوگوں کو مجبور
نہیں کریں گے کہ اپنے عقائد سے دستبردار ہو جائیں۔
ہم انہیں کوئی اذیت نہیں دیں گے۔''(15)

اسلامی سلطنت کی دیگر محکوم رعایا کی طرح فلسطین کے یہودی اور عیسائی بھی محفوظ از قلیت ۔۔۔۔۔ذمی، بن گئے۔ انہیں اپنے ذاتی دفاع کے لئے ہر ذریعہ سے دستبردار ہونا تھا۔ وہ کسی قسم کا ہتھیار نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس کے برعکس مسلمان انہیں عسکری تحفظ فراہم کرتے۔ بدلے میں ذمیوں کو ایک یکساں نفری محصول، جزیہ دینا ہوتا تھا۔ عیسائی زائرین اگر اسلامی ریاست کے باشندے نہ ہوتے تو انہیں داخلہ فیس کے طور پر ایک دینار ادا کرنا ہوتا تھا۔ اس ادائیگی کے بعد وہ اپنے قیام کے دوران ذمی بن جاتے۔(16) ذمی نظام نقائص سے پاک نہیں تھا۔ بعد میں اسلامی قوانین میں کچھ تضحیک آمیز نکات شامل کر دیئے گئے۔ مثلاً ذمی سرکاری اجازت کے بغیر کچھ تعمیر نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی عبادت گاہوں کو مساجد سے اونچا کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ جزیہ ادا کرتے وقت انہیں کورنش بجالانا پڑتی۔ انہیں گھوڑوں پر بیٹھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ ایسے ملبوسات پہننے کا پابند بنا دیا گیا جس سے ان کی شناخت ہوتی رہی۔ اگرچہ ان قوانین کو کبھی سختی سے نافذ نہ کیا گیا لیکن ان کی نوعیت امتیازی تھی۔ یہ نظام ذمیوں کو مذہبی آزادی تو دیتا تھا۔ لیکن مساوات نہیں دیتا تھا۔ وہ مسلمان کے محکوم تھے چنانچہ مسلمانوں کی بالاتری تسلیم کرنا انکے لئے ضروری تھا۔ لیکن یہ نظام مختلف مذاہب کے لوگوں کو اس قابل بناتا تھا کہ ہم آہنگی کے ساتھ بقائے باہمی کو ممکن بنا سکیں۔ نمایاں ترین بات یہ تھی کہ محکوم عوام کے ساتھ عمدہ اور منصفانہ سلوک کو یقینی بناتا تھا۔ بازنطینی قوانین کے مقابلے میں یہ قوانین بہت بہتر تھے۔ بازنطینی قوانین، اقلیتوں مثلاً یک حیثیتی مسلک کے عیسائیوں، یہودیوں اور سامریہ کے لوگوں کے لئے بتدریج اذیت رساں بنتے جا رہے تھے۔

چنانچہ نسطوری اور مسیح کی یک حیثیتی فطرت کے قائل عیسائیوں نے مسلمان کا خیر مقدم کیا اور بازنطینیوں کے مقابلے میں اسلام کو بہتر محسوس کیا۔ بارھویں صدی کا مورخ مائیکل شامی کہتا ہے کہ:

'' ان لوگوں کے اس ردعمل میں حیرت کی کوئی بات نہیں کیونکہ
مسلمان کسی سے نہیں پوچھتے تھے کہ اس کا مزہب یا مسلک کیا ہے؟
بدعتی اور بداعمال یونانیوں کی طرح وہ کسی کو اس کے مذہب کی وجہ

سے اذیت بھی نہیں دیتے تھے۔'' (17)

تقلید پسند عیسائیوں کو ظاہر ہے ایک ''مشکل'' مصالحت کرنا پڑی۔ صفرونیئس، حضرت عمر کو کوہ معبد پر کھڑے دیکھ کر رو پڑا۔ اسے دانیال نبی کی بربادی کی پیشنگوئی یاد آ گئی۔ کہا جاتا ہے کہ دل شکستہ سفرونیئس چند ہفتوں کے اندر مر گیا۔ کچھ عیسائیوں نے ''الہامی داستانیں'' پھیلا دیں کہ ''عنقریب ایک یونانی شہنشاہ یروشلم کو آزاد کرالے گا اور یسوع کی دوسری آمد کے لئے راہ تیار کرے گا۔'' (18) یروشلم کے عیسائیوں نے خود کو قسطنطنیہ سے کٹا ہوا محسوس کیا۔ ایسا لگتا تھا کہ قسطنطنیہ والے یروشلم کو بھول چکے ہیں۔ 691ء تک کوئی اسقف اعظم، صفرونیئس کی جگہ مقرر نہ کیا گیا، دراصل انہیں مسلمانوں کے کسی اگلے اقدام کا انتظار تھا جو مسیحی مقامات کے مستقبل کا تعین کرتا۔ اس سے بھی زیادہ انہیں اس بات کا انتظار تھا کہ کوہ معبد کے ساتھ مسلمان کیا سلوک کرتے ہیں۔ ان کے لئے معبد کے مقام کی آلودگی اور بے حرمتی زیادہ اہم تھی۔ غالباً بہت عیسائی عام لوگوں کے نفسیاتی استرداد کے انتظار میں تھے۔ آرکلف جیسے عیسائی زائرین اپنے مقدس شہر میں مسلمانوں کی موجودگی کا ذکر خاصی نفرت کے ساتھ کرتے تھے۔ شاید عیسائیوں کو لاشعوری طور پر یقین تھا کہ اگر انہوں نے مسلمانوں کو نظر انداز کر دیا تو ان کا خاتمہ از خود ہو جائے گا۔ (19) لیکن ایسا کرنا ان کے لئے بہت مشکل تھا۔ شہر میں عیسائیوں کی اکثریت موجود رہی۔ خود مسلمان بھی تسلیم کرتے تھے کہ یروشلم ذمیوں کا شہر ہے۔ عیسائیوں کے مقدس مقامات تقریباً سبھی مغربی پہاڑی پر تھے۔ یہ علاقہ کلی طور پر عیسائیوں کا رہا۔ مسلمان فاتحین نے اس علاقہ میں رہنے کی بجائے ''حرم'' مسجد عمر کے پاس رہنے کا انتخاب کیا حالانکہ مغربی پہاڑی کا علاقہ زیادہ ٹھنڈا اور صحت بخش سمجھا جاتا تھا۔ مسلمانوں کو ان گرجوں میں جانے کی بھی ممانعت تھی جو ابھی تک کوہ زیتون اور وادی قدرون میں تھے۔ بالخصوص انہیں گرجا صعود مسیح اور مزار مقدسہ مریم میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مسلمان ان مقامات اور واقعات کا خود بھی احترام کرتے تھے۔ عیسائیوں کو اپنے چرچ تعمیر کرنے اور بحال کرنے کی کھلی آزادی تھی۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی کے دوران شام اور فلسطین کے علاقے میں گرجوں کا سیلاب آ گیا تھا۔ عیسائیوں کو مسلسل اپنے مذہبی جلوسوں اور تقریبات کی اجازت تھی۔ اکلوتا مقام جہاں مسلمان زیادہ تعداد میں اکٹھے ہوتے وہ حرم یعنی قدیم کوہ معبد تھا۔ (20) اس مقام سے عیسائی روحانیت کو کوئی تعلق نہیں تھا۔

یروشلم کی تسخیر کے فوراً بعد حضرت عمرؓ نے اسقف اعظم صفرونیئس کی اس بات سے اتفاق کر لیا تھا کہ یہودیوں کو یروشلم میں رہنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ کسی بھی نئے شہر کے مفتوح ہونے پر حضرت عمرؓ صورت حال کو پہلے کی طرح رکھا کرتے تھے، یہاں بھی ابتدا میں ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن یہودی ایک طویل عرصہ سے یروشلم میں اور اس کے اردگرد مستقل رہائش رکھنے کے مجاز نہیں تھے۔ مسلمانوں نے یروشلم میں یہودیوں پر پابندی کا معاہدہ جلد ہی منسوخ کر دیا۔ یہودیوں کو ''شہر داؤد'' میں رہنے کی اجازت نہ دینا کسی بھی طرح منصفانہ نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے طبریس سے ستر یہودی خاندانوں کو مدعو

کر کے یروشلم میں آباد کیا۔ انہیں حرم کے جنوب مغرب میں سلعوم کے تالاب کے اردگرد کا علاقہ دے دیا گیا۔ یہ مضافاتی علاقہ 614ء میں ایرانی حملہ کے وقت تباہ ہو گیا تھا اور اب تک وہاں ملبے کے ڈھیر پڑے تھے۔ یہودیوں نے ملبہ صاف کر کے نئے پتھروں سے اپنے گھر بنائے۔ انہیں ایک کنشت بنانے کی بھی اجازت دے دی گئی۔ یہ کنشت معبد کے چبوترے کے نیچے حجروں یا تہہ خانوں میں ہیرودیس کی مغربی معاون دیوار کے پاس بنایا گیا۔(21) کچھ تاریخی ذرائع کا کہنا ہے کہ یہودیوں کو چبوترے پر عبادت کی اجازت تھی۔ جس طرح مدینہ کی مسجد میں عیسائیوں کع عبادت کی اجازت تھی اسی طرح یہودیوں کو چبوتے پر عبادت کی اجازت تھی حالانکہ اب یہ چبوترہ مسجد عمر سے ملحقہ تھا۔ کچھ ذمی، یہودی اور عیسائی حرم کے چوکیدار اور خادموں کی حیثیت سے ملازم تھے۔ اس ملازمت کی وجہ سے وہ جزیہ دینے سے مستثنیٰ تھے۔ یہودی ایسا کرنے پر رضا کارانہ طور پر تیار ہو گئے۔ (22) کیونکہ مسلمان فاتحین نے انہیں امید کی ایک نئی کرن دکھائی تھی۔ بازنطینی شہنشاہوں نے یہودیت کو غیر قانونی قرار دے دیا تھا اور ہرقل نے تو یہودیوں کو بالجبر بپتسمہ کا پابند کر دیا تھا۔ یہودی اسی طرح مسلمانوں سے تعاون پر تیار تھے جس طرح انہوں نے ایرانیوں سے کیا تھا۔ ان کے تعاون کا ایک محرک توحید پرستی کی وہ قسم بھی تھی جو انہیں عیسائیوں کی بنائے مسلمانوں میں نظر آتی تھی۔ کچھ یہودیوں کا خیال تھا کہ اسلام دراصل اسماعیلیوں کی طرف سے یہودیت قبول کرنے کا عبوری مرحلہ ہے۔ مسلمانوں نے نہ صرف انہیں بازنطینی جبر سے نجات دلائی ہے بلکہ انہں مقدس شہر میں مستقل سکونت رکھنے کے حقوق بھی بحال کر دیئے ہیں۔ صورت حال میں اس بہتری نے الہامی خوابوں کا دروازہ کھول دیا۔ خوش فہمیوں کو اس وقت تقویت ملی جب مسلمانوں نے کوہ معبد کی تطہیر شروع کر دی۔ کیا وہ مسیحا کی طرف سے نئے اور حتمی معبد کی تعمیر کے لئے رستہ صاف کر رہے ہیں؟ ساتویں صدی کے آخر میں لکھی جانے والی ایک عبرانی نظم میں عربوں کو مسیحا کا نقیب قرار دے کر ان کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ اس نظم میں جلاوطن یہودیوں کی واپسی اور معبد کی بحالی کی جلد توقع موجود ہے۔(23) اور جب مسیحا آنے میں ناکام رہا تو یہودیوں نے یروشلم میں اسلامی اقتدار کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ گیارھویں صدی عیسوی میں لکھے گئے ایک خط میں یروشلم کے ربی خدا کے اس رحم کو یاد کرتے ہیں جو اس نے اپنی قوم پر کرتے ہوئے ''اسماعیلیوں کی سلطنت'' کو فلسطین فتح کرنے کی اجازت دے دی۔ انہیں یہ بات بہت مسرور کرتی تھی کہ جب مسلمان یروشلم میں داخل ہوئے تو ان کے ساتھ اسرائیل کے بیٹے تھے جنہوں نے معبد کا مقام بتایا اور پھر وہ ان کے ساتھ آج تک وہیں آباد ہیں۔(24)

فلسطین کی تسخیر کوئی سیدھا سادہ واقعہ نہیں تھا کہ مسلمان حجاز سے دوڑتے ہوئے آئے اور پورے ملک پر قبضہ کر لیا۔ نسلی اعتبار سے فلسطین کی آبادی ہمیشہ کی طرح مختلف لوگوں پر مشتمل تھی۔ مسلمان فاتحین کو اپنے نئے علاقوں میں آباد ہونے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ وہ ایک مختصر عسکری طبقے کی طرح مقامی لوگوں سے الگ تھلگ چھاونیوں میں رہے یا خصوصی عسکری عمارتوں میں۔ کچھ جرنیلوں کو جاگیریں بنانے کی اجازت تھی لیکن وہ بھی بے آباد علاقوں میں۔ ہم دیکھ چکے

ہیں کہ یروشلم میں مسلمانوں نے شہر کے زیادہ صحت بخش علاقے میں رہنے کی کوشش نہ کی اس کی بجائے انہوں نے حرم کے نیچے ایسے علاقے میں رہنا قبول کرلیا جس کے ساتھ یہودی بستی تھی۔ یروشلم عیسائی اکثریت کا شہر رہا جس میں صرف ایک مقدس مقام مسلمانوں کا تھا۔ حضرت محمد ﷺ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ کوئی بھی شخص جو عربی بولتا ہے وہ عرب ہے۔ اسی طرح یونانی بولنے والوں کو یونانی تسلیم کیا جاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مقامی باشندوں نے عربی بولنا سیکھ لیا اور پھر عربی ہی ان کی روزمرہ کی زبان بن گئی۔ چنانچہ ان لوگوں کی اولاد کو عرب مسلم اور عرب عیسائی کہا جاتا ہے۔

فلستیوں کی سرزمین فیلستین کو عربی میں فلسطین کہا جاتا ہے۔۔۔۔ فلسطین کو زیرنگیں بنانے کے بعد یہاں اپنی انتظامیہ قائم کرنے کے لئے مسلمانوں نے بازنطینی نظام سے استفادہ کیا۔ انہوں نے ملک کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اب یروشلم کو ''جند فلسطین'' میں شامل کرلیا گیا۔ اس حصہ میں ساحلی علاقہ اور یہودیہ اور سامریہ کا کوہستانی علاقہ شامل تھا۔ ''جند اردن'' میں گلیلی اور پیرایہ کا علاقہ جب کہ ''جند دمشق'' میں قدیم مواب اور ادوم کے علاقے تھے۔ عربوں نے یروشلم کو بیت المقدس یا ایلیا پکارنا جاری رکھا۔ شہر کے لئے ان کے احترام کا اندازہ ان لوگوں کے مقام و مرتبہ سے لگایا جاسکتا ہے جنہیں یہاں حکومت کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ مثلاً معاویہ بن ابی سفیان جو بعد میں خلیفہ بنا اسے فلسطین اور شام کا گورنر بنایا گیا۔ اس پورے علاقے کو عرب ''الشام'' کہتے تھے۔ عمیر ابن سعد، ایک اہم ترین جرنیل تھا۔ اسے جند فلسطین کا حاکم بنایا گیا۔ ابن سعد ذمیوں سے اپنے اعلیٰ ترین سلوک کی وجہ سے بہت مقبول ہوا۔ عبیدہ ابن السمیع، قرآن کے پانچ ممتاز ترین ماہرین میں سے ایک تھا۔ اسے یروشلم کا پہلا قاضی مقرر کیا گیا۔ یہ سب پیغمبرؐ اسلام کے صحابہ یعنی ساتھی تھے۔ کچھ اور ممتاز صحابہ مثلاً فیروز الدیمی اور شداد ابن اوس شہر کے تقدس میں کھنچے چلے آئے اور پھر وہیں آباد ہوگئے۔

اسلامی سلطنت ایک خوبصورت آغاز کے بعد اس وقت خطرے سے دوچار ہوگئی جب حضرت عمرؓ کو 644ء میں ایک ایرانی جنگی قیدی نے قتل کر دیا۔ مذہب کے المیوں میں سے ایک یہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے انمول نصب العین کے مطابق زندہ رہنے میں مسلسل ناکام رہتا ہے۔ عیسائیت جو محبت کا مذہب تھا اس نے یروشلم میں کئی مرتبہ نفرت و اھانت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسی طرح اسلام جو اتحاد اور یک جہتی کا مذہب تھا، انتشار اور گروہ بندی کا شکار ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ پیغمبرؐ اسلام کی وفات کے ساتھ ہی امہ کی قیادت کا تنازعہ کھڑا ہوگیا جو بعد میں خلفاء اور پیغمبر ﷺ کے خاندان کے درمیان تنا آ کا سبب بنا۔ بعد میں یہی تنازعہ شیعہ سنی تقسیم کی صورت اختیار کر گیا۔ حضرت عمرؓ کے بعد مسلمانوں کا خلیفہ حضرت عثمانؓ بن عفان کو بنایا گیا۔ یہ پیغمبر ﷺ کے قریبی ساتھیوں میں سے ایک اور امیہ قبیلہ کی اشرافیہ کے رکن تھے۔ حضرت عثمانؓ بن عفان کی یروشلم کے لئے خدمات میں سے ایک سلعوم کے تالاب کے پاس شہر کے غریبوں کے لئے ایک بہت بڑے عوامی باغ کا قیام ہے۔ حضرت عثمانؓ ایک پارسا لیکن غیر موثر قائد ثابت ہوئے۔ جسے فوجی افسروں کے گروہ نے 656ء میں انہیں قتل کیا اور حضرت علیؓ ابن ابی طالب کو چوتھا خلیفہ بنانے کا اعلان کر دیا۔ حضرت علیؓ پیغمبرؐ السلام کے قریب ترین مرد رشتہ دار تھے۔ اس

موقعہ پر فوراً خانہ جنگی چھڑ گئی، علیؓ اور معاویہ متحارب گروہوں کے قائد تھے۔ حضرت معاویہ شام کے گورنر اور قبیلہ بنوامیہ کے سربراہ تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ حضرت عثمانؓ کے قاتل کو سزا کے لئے ان کے حوالے کیا جائے۔ خانہ جنگی چلتی رہی یہاں تک حضرت علیؓ کو 661ء کو ایک نئے جنونی فرقے کے رکن نے قتل کر دیا۔ چھ ماہ بعد حضرت معاویہ نے یروشلم میں اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ وہ امیہ خاندان کے پہلے حکمران تھے۔ اس خاندان یعنی بنوامیہ یا امویوں نے تقریباً 90 برس تک مسلمان پر حکومت کی۔

خلیفہ معاویہ نے سب سے پہلے کام یہ کیا کہ دارالحکومت مدینہ سے دمشق میں منتقل کر دیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے پرانی مذہبی روایات ترک کر دیں۔ کچھ مبصرین ان کے بارے میں یہی کہتے ہیں۔ مسلمان اب ایک ایسی سلطنت کے حکمران تھے جو مشرق میں خراسان سے شمال میں موجودہ لیبیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ امیہ خاندان کے دور اقتدار کا خاتمہ جب ہوا تو اسلامی سلطنت جبرالٹر (سپین) سے ہمالیہ (ہندوستان) تک وسعت اختیار کر چکی تھی۔ یہ بات بہت ضروری تھی کہ دارالحکومت، سلطنت کے مرکز میں ہو اور مسلمان مفتوحہ علاقوں کی سلامتی برقرار رکھیں۔ دنیا کو مقدس بنانا مسلمان کے مشن کا ایک حصہ تھا۔ ''مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے مقدس مقامات سے نہ چمٹے رہیں بلکہ باہر نکلیں اور خدا کی 'پاکیزگی' کو سلطنت کے دور دراز علاقوں تک پہنچائیں۔'' دارالحکومت کا دمشق کو منتقل ہونا، فلسطین کے لئے سودمند ثابت ہوا جو اقتدار کے مرکز کے قریب تھا۔ چنانچہ وہاں ثقافتی اور اقتصادی ترقی کا نیا دور شروع ہو گیا۔ حضرت معاویہ خلیفہ بننے سے پہلے بیس برس تک شام کے گورنر رہ چکے تھے۔ انہوں نے یروشلم سے محبت کرنا سیکھ لیا تھا۔ وہ جب بھی فلسطین میں آتے، یروشلم کا دورہ بھی ضرور کرتے۔ حالانکہ ایک دفعہ ان پر قاتلانہ حملہ بھی ہوا۔ مسلمانوں کو بیت المقدس کے لئے ان کی توصیف وتحسین یاد رہتی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یروشلم کی محبت میں مسلمان، ذمیوں سے بہت آگے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ

''یہ شہر وہ مقام ہے جہاں یوم حساب کو انسان جمع کئے جائیں گے۔''

یہ ایسی جگہ تھی جو اپنے باشندوں کو متبرک بنا دیتی تھی۔ شام کا پورا علاقہ، اللہ کی منتخب کردہ سرزمین تھی جہاں وہ اپنے بہترین بندوں کی قیادت کرے گا۔ حرم میں خطاب کرتے ہوئے ایک دفعہ خلیفہ معاویہ نے کہا تھا کہ ''خدا اس مسجد کی در دیواروں کے درمیان پائی جانے والی جگہ کو دنیا کے دیگر مقامات سے زیادہ پیار کرتا ہے۔'' (25) اس جگہ عبادت کرنے والے مسلمان اگرچہ مکہ سے دور ہوتے تھے لیکن وہ مکہ کی تقدیس یروشلم کے حرم میں محسوس کر سکتے تھے۔

حضرت معاویہ کے انتقال کے بعد سلطنت میں پھر انتشار پھیل گیا۔ کچھ مسلمانوں نے ان کے بیٹے یزید کی خلافت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ 680ء میں حضرت علیؓ کے بیٹے اور پیغمبرؐ السلام کے نواسے حضرت حسینؓ نے یزید کے

خلاف بغاوت کردی۔ کربلا، عراق میں انہیں اور ان کے معدودے چند ساتھیوں کو بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد کربلا، شیعہ گروہ کا مقدس مقام بن گیا۔ اس گروہ کا موقف تھا کہ امہ پر حکمرانی کا حق صرف پیغمبرؐ السلام کی اولاد کو ہے۔ کربلا کے احترام کے ساتھ ساتھ شیعہ گروہ اماموں کا احترام کرتا تھا جو پیغمبرؐ اسلام کی بیٹی اور ان کے شوہر حضرت علیؓ کی اولاد تھے۔ ہر امام کو اپنے دور کا ''قطب'' سمجھا جاتا تھا۔ اس منصب پر فائز شخصیت (امام) کو مسلمان اور خدا کے درمیان براہ راست رابطہ قرار دیا جاتا تھا اور یہ پیغمبرؐ اسلام کی اولاد ہونے کی وجہ سے تقدیس کی بدولت تھا۔ پیغمبرؐ اسلام جو کامل انسان اور مقدس ترین تھے۔

امویوں کے خلاف 683ء میں ایک اور بغاوت ہوئی جب خلیفہ یزید شدید بیمار ہو گیا۔ حضرت عبداللہ ابن زبیر نے اپنی خلافت کا اعلان کر کے مقدس شہر مکہ پر قبضہ کر لیا۔ 692ء تک اقتدار میں رہنے کے باوجود پوری امہ کی حمایت اسے نہ مل سکی۔ یزید کی موت کے بعد مروان اول (85-684ء) اور اس کا بیٹا عبدالملک (905-685ء) بالترتیب حکمران بنے اور اموی اقتدار کو ایک بار پھر شام، فلسطین اور مصر میں مستحکم کرنے کے بعد بقیہ اسلامی سلطنت میں تسلیم کرانے کے قابل ہوئے۔ عبدالملک بالخصوص ایک قابل حکمران تھا۔ اس نے باzنطینی اور ایرانی نظام حکومت کو سامنے رکھتے ہوئے ایک نیا عرب نظام وضع کیا یعنی مرکزی بادشاہت مذہبی بنیادوں پر۔

امن و امان بحال کرنے میں کامیاب ہونے کے بعد خلیفہ عبدالملک نے یروشلم کی طرف توجہ مبذول کی۔ تمام امویوں کی طرح وہ بھی یروشلم سے محبت و عقیدت رکھتا تھا۔ اس نے شہر کی دیواریں اور دروازے مرمت کروائیں۔ جنہیں حالیہ خلفشار کے دوران نقصان پہنچا تھا۔ اس نے حرم کے قریب ایلیا کے گورنر کی رہائش گاہ دارامامہ تعمیر کی۔ البتہ شہر کے لئے عبدالملک کی گران قدر خدمات میں سے ایک بلاشبہ قبتہ الصخرہ (Dome of the Rock) کی تعمیر ہے۔ قبتہ الصخرہ کی تعمیر کا حکم 688ء میں دیا گیا۔

MAP (نقشہ)

قبتہ الصخرہ کی تعمیر خلیفہ عبدالملک کے دور میں ہوئی۔ یروشلم میں یہ پہلی اسلامی عمارت تھی جو نئے مذہب کی جڑیں پرانی روایات میں پیوست دکھاتی تھی۔

اسلام کے اپنے مقدس مقامات تھے غیر معمولی جمال وجلال کا عربی صحیفہ اس کے پاس تھا۔لیکن اس کے پاس پُر شکوہ عمارتیں نہیں تھیں۔ بالخصوص یروشلم میں اس کی کوئی عظیم یادگار نہیں تھی جو شاندار گرجوں اور خانقاہوں سے بھرا پڑا تھا۔ مسلمانوں کو یہاں اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا تھا۔وہ یقیناً عیسائیوں کو دکھانا چاہتے تھے کہ آرکلف کے تبصرہ کے مطابق اگر وہ لکڑی کی سادہ سی مسجد کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں تو مسلمانوں کے پاس شاندار عمارتیں بھی ہیں۔ دسویں صدی عیسوی میں یروشلم کا مورخ مقدسی کہتا ہے کہ الشام کے چرچ اتنے خوبصوت اور القمامہ کا گنبد اتنا دیدہ زیب تھا کہ عبدالملک کو خوف لاحق ہوا کہ یہ عمارتیں مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا کر دیں گی۔انہیں ایسی یادگاروں کی ضرورت ہے جو منفرد اور دنیا کے لئے حیرت کا سبب ہوں۔ چنانچہ عبدالملک نے حکم دے دیا کہ یہاں ایک ایسی عمارت تعمیر کی جائے جو''اناستاسیس'' کی ہم پلہ اور گرجا صعود مسیح سے زیادہ خوبصورت ہو۔ جب رات کو یہاں چراغ اور مشعلیں روشن کی جائیں تو یہ منور ہو کر یروشلم کا ایک مسحور کن منظر پیش کرے۔(27) نئی اسلامی عمارت کو عظیم سلطنت کے شایان شان بنانے کے لئے عبدالملک نے بازنطین سے ہنرمندوں اور ماہر تعمیرات کو بلایا۔تعمیراتی کام کی نگرانی کرنے والے تین افراد میں سے دو عیسائی تھے۔(28) ذمیوں کا تعاون حاصل کرنے کے باوجود مسلمانوں کی یہ پہلی عظیم عمارت ایک اسلامی پیغام تھی۔

خلیفہ نے یہ گنبد اس چٹان کے اردگرد تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا جو معبد کے چبوترے کے شمالی کنارے کی طرف جانے والی ہیرودیس کی راہداری سے باہر کو نکلی ہوئی تھی۔عبدالملک نے اس چٹان کو یہ عظمت دینے کا فیصلہ کیوں کیا؟ اس کا سبب نہ تو بائبل میں موجود ہے اور نہ قرآن میں۔ بعد میں مسلمانوں نے سمجھنا شروع کر دیا کہ اسی چٹان سے معراج کی رات کو پیغمبرؐ اسلام آسمان کو گئے تھے۔اسی چٹان کے نیچے انہوں نے نماز ادا کی تھی۔لیکن 688ء میں اس واقعہ کا تعلق یقینی طور پر یروشلم سے بیان نہیں کیا جاتا تھا۔اگر عبدالملک معراج النبی ﷺ کی یادگار تعمیر کرنا چاہتا تھا تو اسے اس واقعہ سے متعلق قرآنی آیات، عمارت کے کسی حصہ میں ضرور کندہ کرنا چاہیے تھیں۔لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ہمیں علم نہیں کہ چٹان کی یہ نسبت کب سامنے لائی گئی۔زائر بورڈیاکس نے کوہ معبد پر ایک گھسے ہوئے پتھر سے یہودیوں کو مسح کرتے ہوئے دیکھا تھا۔لیکن اب حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس پتھر سے مراد وہی چٹان ہے یا کوئی اور پتھر ہے۔ دوسری صدی میں مشناہ میں ایک ''سنگ بنیاد'' کا تذکرہ ملتا ہے جو حضرت داؤد اور حضرت سلیمانؑ کے دنوں میں ''تابوت یہواہ'' کے پہلو میں پڑا تھا۔لیکن ربی ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ کیا یہ پتھر ہیرودیاس کے معبد میں اپنی جگہ پر موجود تھا اور نہ ہی چٹان کی حیثیت سے تباہ شدہ معبد کے اردگرد اس کی موجودگی پہاڑ پر ثابت کرتے ہیں۔قرین قیاس یہی ہے کہ یہودی اور مسلمان دونوں ہی سمجھتے تھے کہ چٹان ''مقدسوں کے مقدس'' کے مقام کی نشاندہی کرتی ہے۔لیکن تاریخ اور آثار قدیمہ کے جدید ماہرین اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔(29) اگر دونوں مذاہب کے پیروکار اس

MAP (نقشہ)

اسلامی یروشلم

(1999-638ء)

www.HallaGulla.com

چٹان کو یہ حیثیت دیتے تو پھر اس کو ''زمین کا مرکز'' بھی قرار دے دیتے، ایک ایسا مقام جو عالم بالا تک رسائی رکھتا ہے۔ اس عمارت یعنی قبتہ الصخرہ کی تعمیر کے بعد یہودی اور مسلمان دونوں ہی چٹان کے بارے میں داستانیں وضع کر لیتے تا کہ اسلامی یادگار یہودی تصورات کو تحریک دے۔ یہودی اور مسلمان دونوں ہی چٹان کو معبد کی بنیاد، دنیا کا مرکز باغ عدن میں داخلے کا باب اور زرخیزی کا ذریعہ قرار دیتے کیوں کہ یہ عمومی تصورات توحید پرستوں کے مقدس ترین مقام سے ضرور وابستہ ہوتے ہیں۔ ابتدائی دنوں ہی سے مسلمان محسوس کرتے تھے کہ اس نئی مذہبی عمارت میں داخل ہو کر وہ جنت کے ازلی و ابدی سکون میں داخل ہو جاتے ہیں۔

کچھ ماہرین نے حال ہی میں تحقیق کے بعد کہا ہے کہ خلیفہ عبدالملک نے اس مقام کا انتخاب خود نہیں کیا تھا۔ ان کا مفروضہ یہ ہے کہ یروشلم پر ایرانی قبضہ کے دوران یہودیوں نے معبد کی تعمیر دوبارہ شروع کر دی تھی لیکن ہرقل نے پھر شہر پر قبضہ کر لیا۔ ہرقل نے حکم دیا کہ ایران اور یہودیت پر عیسائیت کی فتح کی یاد میں ایک ہشت پہلو گرجا تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ مجوزہ گرجا کی بنیادیں رکھی جا چکی تھیں کہ عربوں نے فلسطین پر حملہ کر دیا اور پھر بازنطینیوں کو اپنا منصوبہ ادھورا چھوڑنا پڑا۔ خلیفہ عبدالملک نے 688ء میں انہی بازنطینی بنیادوں پر قبتہ الصخرہ کی عمارت بلند کی۔(30) لیکن یہ مفروضہ اسلامی دنیا کی اس منفرد عمارت کو متنازعہ بنانے کی کوشش محسوس ہوتا ہے۔ قبتہ الصخرہ مسجد نہیں ہے۔ اس میں قبلہ کی سمت بتانے والی کوئی محرابی دیوار نہیں۔ نمازیوں کے لئے کشادہ جگہ بھی نہیں ہے۔ اس کے برعکس چٹان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے ارد گرد دو دائرہ نما راہداریاں اور چالیس ستون ہیں۔ قبتہ الصخرہ یعنی چٹان کا گنبد ایک درگاہ اور خانہ تبرکات ہے۔ یروشلم میں ایسی عمارت کا وجود غیر معمولی نہیں تھا۔ شہر میں اور بہت سے چرچ اور درگاہیں ہیں جو مقدس غاروں اور چٹانوں کے گرد بنی ہوئی عمارتیں ہیں۔ مثلاً ''حیات نو'' کی مدور عمارت حضرت عیسیٰ کی (چٹانی) قبر کے گرد ایستادہ ہے، شہر میں گلگتا کی چٹان ہے، گرجا مولد مقدس میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا مقام مقدس غار ہے۔ اور اسی طرح گرجا صعود مسیح اسی چٹان کا احاطہ کئے ہوئے ہے جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاؤں کے نشان ہیں۔ یہ تمام مقامات کلام الٰہی کی تجسیم (حضرت عیسیٰ) کی یادگاریں ہیں لیکن اب عبدالملک کی شاندار نئی عمارت ان پرانی عمارتوں کو للکارنے کے لئے وجود میں آ گئی۔

گنبد کے اندر داخلی محرابوں پر قرآنی آیات کندہ ہیں جن میں اس عقیدہ کی تکذیب کی گئی ہے کہ خدا کا کوئی بیٹا تھا۔ یہ انجیل کے پیروکاروں سے مخاطب ہیں اور خدا کے بارے میں غیر حقیقی اور خطرناک باتوں پر تنبیہ کرتی ہیں۔

''حضرت عیسیٰ، مریم کے بیٹے اور خدا کے نبی تھے اس نے (بی بی)
مریم سے اپنا وعدہ پورا کیا اور ایک روح تخلیق کی۔ خدا اور اس کے نبی
پر ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو (خدا) تثلیث ہے۔ اپنے بھلے کے لئے
(اس طرح کے وسوسوں سے) دور رہو۔ خدا صرف ایک اور اپنے جلال
میں کسی بیٹے سے بے نیاز ہے۔''(31)

یروشلم میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ عیسائی اکثریت غالباً ان فاتحین کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی اور نہیں وحشی اور گنوار سمجھتی تھی۔ لیکن یروشلم کے قدیم مقدس مقام پر قبتہ الصخرہ جیسی عمارت کا شاہانہ وجود ایک ڈرامائی ادعا تھا کہ اسلام یہاں پہنچ چکا ہے اور رہنے کے لئے آیا ہے۔ اس نے عیسائیوں کو ایک تحکمانہ دعوت دی تھی کہ وہ اپنے عقائد پر نظر ثانی کریں اور حضرت ابراہیم کی خالص توحید کی طرف رجوع کر لیں۔(32)

قبتہ الصخرہ میں کندہ آیات کو یہودیوں نے یقیناً پسند کیا تھا۔ سبھی یہودی اپنے مقدس مقام پر مسلمانوں کی اس عمارت کو خوف زدہ ہو کر نہیں دیکھتے تھے۔ 750ء میں ''ربی شمعون بن یوہائی کے معجزات'' نامی کتاب کا مصنف اس عمارت کو دور مسیحا کا ابتدائیہ قرار دیتا ہے۔ وہ مسلمان خلیفہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''اسرائیل سے محبت کرنے والے اس حکمران نے صیہون اور معبد کی بے حرمتی روک دی ہے۔ اس نے کوہ موریاہ کو تراش کر ہموار کیا اور معبد کی چٹان پر مسجد تعمیر کی۔''(33) لیکن قبتہ الصخرہ یہودیوں کے لئے بھی ایک پیغام رکھتا تھا۔ اس نے ان کے معبد کے مقام پر قبضہ کیا تھا اور یہ جگہ وہی تھی جہاں (کوہ مور ماہ) پر حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے حضرت اسحاقؑ کی قربانی پیش کی تھی۔ لیکن اب حضرت اسماعیلؑ کے بیٹے اس مقدس مقام پر قابض ہو گئے تھے۔ وہ باور کرا رہے تھے کہ صرف یہودی ہی حضرت ابراہیم کی اولاد نہیں ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی بلکہ ''مسلمان'' تھے۔

قبتہ الصخرہ یقیناً اسلامی تشخص کا ایک اظہار تھا۔ اس کی تعمیر کے پیچھے مکہ کا حج کرنے والے زائرین کو متبادل مقدس مقام مہیا کرنے کا کوئی منصوبہ موجود نہیں تھا۔ چونکہ ان دنوں مکہ پر ابن زبیر کا قبضہ تھا۔ چنانچہ یہ مفروضہ سب سے پہلے نویں صدی عیسوی کے عراقی مورخ یعقوبی نے پیش کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ چٹان کے گرد راہداریاں طواف کی غرض سے بنائی گئی تھیں۔ لوگوں نے چٹانوں کے گرد اسی طرح طواف کرنا شروع کر دیا جس طرح خانہ کعبہ کا طواف کیا جاتا ہے۔(34) لیکن

یہ کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں۔قبتہ الصخرہ کی راہداریاں اتنی تنگ ہیں کہ اس مقصد کے لئے استعمال ہی نہیں ہوسکتیں۔ چنانچہ یہ عمارت مکہ کا متبادل تصور ہی نہیں کی جاسکتی اور اگر خلیفہ عبدالملک کے ذہن میں تھی تو اس عمارت کو کعبہ کی طرز پر سادہ اور کشادہ بنایا جاتا۔ایسی صورت میں گنبد بنانے کا کٹھن کام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔کوئی اور ہم عصر مورخ خلیفہ کے اس ''توہین کعبہ'' جیسے منصوبے کا تذکرہ نہیں کرتا۔ایسا اقدام پورے عالم اسلام کو ہلا کر رکھ دیتا۔لیکن عبدالملک نے مکہ اور کعبہ کے لئے اپنے بھرپور احترام کے علاوہ کسی اور جذبہ کا کبھی اظہار نہیں کیا۔دراصل یعقوبی امویوں کے شدید مخالفوں میں سے تھا۔اس کے مفروضے کو محض پراپیگنڈہ ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

MAP (نقشہ)

قبتہ الصخرہ کا اندرونی منظر۔۔۔چٹان اور مدور عمارت،کلیت ووحدت کی طرف روحانی معراج کی علامت ہیں۔

قبتہ الصخرہ ایک سیاسی اقدام تھا یا ذمیوں کو مرعوب کرنے کی ایک سوچی سمجھی ترکیب لیکن یہ کبھی مسلمانوں کے دل نہ جیت سکی۔البتہ یہ ہوا کہ علاقے میں آئندہ بننے والی اسلامی عمارتوں کا بنیادی نمونہ بن گئی۔جب زائرین اور عبادت گزار اس عمارت میں داخل ہوتے تو وہ اسے مکمل طور پر ایک ایسے راستے کی علامتی نقل سمجھتے جس پر چل کر انہیں خدا تک پہنچنا چاہیے۔ (35) یہ ڈیزائین صوفیا کی نئی الٰہیات سے متاثر ہوکر بنایا گیا تھا جنہوں نے یروشلم میں آکر رہنا شروع کر دیا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام میں علامت پسندی کی بہت اہمیت ہے۔چونکہ خدا کی کوئی نظیر اور مثال نہیں تھی چنانچہ مسلمانوں نے اپنی عبادت گاہوں میں تصویروں اور مصوری کے فن پاروں کو بالکل ممنوع قرار دے دیا تھا۔البتہ جیومٹری کی شکلیں اور نقش و نگار کی اجازت تھی کیونکہ یہ تصورات کی مثالی دنیا کی عکاس تھیں۔وہ کائنات کے داخلی ڈھانچے کی طرف اشارہ کرتی تھیں۔ جس کے ساتھ مسلمانوں کا ہم آہنگ رہنا ضروری تھا تاکہ وہ امن وسلامتی اور خدا کی وحدانیت پاسکیں۔مکہ کے حرم میں مربع نما خانہ کعبہ،طواف کے دائرے کی طرف لے جاتا تھا جو زمین سے ابدیت کے سفر کا عکاس تھا۔ایسا ہی انداز یروشلم کی درگاہ میں تھا۔چٹان اور اس کے گرد دائرہ میں راہداریاں زمین کی علامت تھیں جو جد و جہد کا نکتہ آغاز ہے۔بیرونی ہشت پہلو دیواریں مسلمانوں کے نکتہ نظر میں مربع کی جامد حالت سے ایک قدم آگے نکلنے کا مرحلہ تھا۔اس طرح یہ سالمیت،نکتہ کمال اور ابدیت کی طرف معراج کی ابتدا کی نشاندہی تھی۔

گنبد بذات خود مسلم طرز تعمیر کی شناخت اور عالم بالا کی طرف پرواز کی طاقتور علامت ہے۔ یہ توحید کے مکمل توازن کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ اس کا خارج جو آسمان کی لامحدودیت میں داخل ہوتا ہے۔ اس کی داخلی جہت کی بھرپور نقل ہے۔ یہ اس انداز کی توضیح ہے جس میں خدا اور انسان، داخلی اور خارجی دنیائیں ایک دوسرے سے مربوط ہو کر اس طرح تکمیل عمل میں لاتی ہیں جس طرح ایک چیز کے دو نصف حصے مربوط ہو کر اسے مکمل کرتے ہیں۔ قبتہ الصخرہ کے رنگ بھی ایک پیغام دیتے ہیں۔ اسلامی آرٹ میں نیلا۔۔۔ یعنی آسمان کا رنگ، لامحدودیت جبکہ سنہری رنگ علم و آگہی کی علامت ہے۔ علم، قرآن کے مطابق ایسی صلاحیت ہے جو مسلمان کو خدا کی تفہیم میں مدد دیتی ہے۔

قبتہ الصخرہ کو مسلمانوں کے پہلے قبلہ کے مقام پر تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ مقام ''روحانی مرکز'' کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ چٹان کے نیچے مسلمانوں کے عقائد کے مطابق وہ جگہ تھی جہاں حضرت ابراہیم حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت ایلیا نے عبادت کی تھی۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ چٹان پر خنوک نبی کے پاؤں کے نشان ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ یہاں سے آسمان پر اٹھائے گئے تھے۔ یہ ان مقامات میں سے الگ تھا جہاں زمین اور جنت کا ملاپ ہوا۔ اس نے خدا کی طرف مسلمانوں کے روحانی سفر کے آغاز میں معاونت کی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ معبد سلیمانی کے طرز تعمیر نے یہودی روحانیت کو عمارت کی تباہی کے ایک عرصہ بعد بھی مخصوص شکل دینا جاری رکھا۔ اب قبتہ الصخرہ اسلامی طرز تعمیر کا پہلا شاہکار بھی مسلمانوں کی روحانی ہیئت مرتب کر رہا تھا۔

اسی عمارتی خاکہ کو بعد میں مسلمانوں نے ایسے مردوں یا عورتوں کے مزاروں کے لئے استعمال کیا جن کا احترام ایک ''قطب'' کی حیثیت سے کیا جاتا تھا۔ قطب زمین اور آسمان کے درمیان ایک واسطہ یا تعلق تھا۔ قبتہ الصخرہ کو مکہ کا متبادل بنانے کی یعقوبی کی داستان یقینی طور پر غلط ہے۔ لیکن یہ کم از کم اس قرابت داری کو ضرور ظاہر کرتی ہے جو مسلمان ان دونوں میں محسوس کرتے ہیں۔ اسلام کی ابتدا میں پہلا قبلہ مختصر عرصہ کے لئے مکہ کا متبادل تھا۔ دونوں مقامات کو باغ عدن کے مقام کی حیثیت سے دیکھا گیا۔ دونوں کو زمین کا مرکز، ہبوط آدم کا مقام اور حضرت ابراہیم کی قربان گاہ قرار دیا جاتا رہا۔ مکہ کی مرکزی تقدیس کی نقل دوسری مذہبی عمارتوں کی اساطیر اور فن تعمیر میں ہوئی۔ لیکن یہ نقل محض اندھی تقلید نہ تھی یہ بذات خود وحدت کی جدوجہد اور ہر چیز کو اپنے منبع و ماخذ سے جوڑ کر ان کو اپنی اصل اور مکمل صورت میں بحال کرنے کی خواہش کی علامت تھی۔

یہ سب کچھ ان روایات میں واضح ہو گیا جو ساتویں صدی کے اواخر میں اسلامی دنیا میں یروشلم کی فضیلت کے بارے میں پھیلائی جا رہی تھیں۔ ان میں سے کچھ ''اسرائیلیات'' کے اثرات کا بھی نتیجہ تھا۔ یہودیوں نے ہمیشہ معبد کو دنیا کی زرخیزی و شادابی کا ذریعہ تصور کیا تھا۔ اب مسلمانوں کا بھی دعویٰ تھا کہ ''تمام میٹھے پانی چٹان کے نیچے ہی پھوٹتے ہیں'' یوم حساب یروشلم میں برپا ہوگا۔ خدا یاجوج و ماجوج کو شکست دے گا۔

مردے جی اٹھیں گے اور روز حساب شہر مقدس میں جمع کئے جائیں گے۔ یروشلم میں مرنا، سعادت کی بات تھی۔ ''جس نے یروشلم میں مرنے کا انتخاب کیا۔۔۔ وہ اس طرح مرا جیسے جنت میں مرا'' تمام انبیاء کی خواہش تھی کہ وہاں دفن ہوں۔ یہاں تک کہ اپنی موت سے پہلے حضرت آدم نے حکم دیا تھا کہ تدفین کے لئے انہیں یروشلم میں لایا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے ساتھی چاہتے تھے کہ تدفین کے لے آپ کا جسد اطہر یروشلم لے جائیں کیونکہ یہ شہر انبیاء کی آخری آرام گاہ اور میدان حشر ہے۔ یروشلم مقدس انسانوں اور مقدس چیزوں کی فطری منزل تھی۔۔۔ ''قیامت کے دن خود کعبہ کو بھی یروشلم میں لایا جائے گا۔'' یہ روایت بتاتی ہے کہ دونوں مقامات مسلمانوں کی نظر میں کتنے عظیم المرتبت ہیں۔(36)

خلیفہ الولید اول، عبدالملک کا جانشین تھا۔ اس کی تخت نشینی 705ء میں ہوئی۔ خلیفہ الولید نے بھی حرم کی فضیلت اور شان وشوکت میں اضافہ جاری رکھا۔ 705ء میں اس نے حکم دیا کہ ''مسجد عمرؓ'' کی سادہ کھردری عمارت کی جگہ ایک نئی اور پرشکوہ عمارت تعمیر کی جائے۔ یہ موجودہ مسجد الاقصیٰ کے مقام پر ہی تھی۔ قبتہ الصخرہ کے برعکس یہ مسجد کئی دفعہ مسمار ہوئی، پھر تعمیر کی گئی اور اس میں کئی طرح کا ردوبدل ہوتا رہا۔ الولید کی مسجد پہلی تعمیر کے کچھ ہی دنوں بعد ایک زلزلہ میں منہدم ہوگئی۔ اس کا معمولی سا حصہ بچ سکا۔ ہمیں علم ہے کہ اس میں سنگ مرمر کی راہداری اور ستون تھے۔ خلیفہ نے ہیرودیس کی معاون دیواریں مرمت کر کے انہیں مزید اونچا کیا۔ لیکن وہ ہیرودیس کے زمانے کے بڑے بڑے پتھروں کی تنصیب نہ کرا سکا۔ چبوترے کی دیواروں کے اردگرد خلیفہ نے ستون بنوائے۔ ان میں سے کچھ آج بھی موجود ہیں۔ حرم کے پہلو میں موجود رہائشی مکانات گرا دیئے گئے تا کہ کچھ عالیشان شاہی عمارتوں کے لئے جگہ بن سکے۔ چبوترے کے جنوبی کنارے پر موجود دروازے کی تعمیر نو کی گئی۔ اور متعدد سرکاری عمارتیں کھڑی کی گئیں جن میں نمایاں ترین اور قابل دید ایک بہت بڑا محل تھا۔ اس کی دو منزلیں تھیں جب کہ مرکزی صحن کے اردگرد کمرے تعمیر کئے گئے۔ بالائی منزل کو ایک پل کے ذریعے حرم سے مربوط کر دیا گیا۔ یہ پل نئی مسجد تک رابطہ فراہم کرتا تھا۔ کچھ اور ستون دار عمارتوں کا ایک سلسلہ مغربی دیوار کے ساتھ ساتھ مغرب اور شمالی تک پھیلا ہوا تھا۔

زائرین کے لئے ایک قیام گاہ، ایک حمام، ایک بارک اور کچھ سرکاری دفاتر بھی بنائے گئے۔ آخر میں پرانا ہیرو دیس کا پل جو حرم سے زنجیر والی گلی جسے اب طارق السلسہ کہتے ہیں، دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ اموی دور میں تعمیر ہونے والا یہ سب سے بڑا بلڈنگ کمپلیکس تھا۔ کیا خلیفہ ولید یروشلم کو اسلامی سلطنت کا دارالخلافہ بنانا چاہتا تھا؟(37)

ولید کے بارے میں تو کوئی قیاس آرائی نہیں کی جاسکتی لیکن اس کا بیٹا سلیمان (17-715ء) یقیناً یروشلم کی محبت میں دیوانہ تھا۔ مجیرالدین کا کہنا ہے کہ سلیمان کا منصوبہ تھا کہ یروشلم میں رہائش رکھے، اسے دارالخلافہ بنائے اور وہاں بیت تحاز شاہ دولت اور بہت بڑی آبادی منتقل کرے۔(38) سلیمان کی خلافت کا اعلان یروشلم میں ہی کیا گیا اور مملکت کے مختلف حصوں سے وفود نئے خلیفہ سے وفاداری کا اظہار کرنے کے لئے ''بیت المقدس'' پہنچے۔ بادشاہ سلیمان کے ہم نام خلیفہ

سلیمان نے وفود کی باریابی کے لئے کوہ معبد کو پسند کیا۔ قبتہ الصخرہ کے قریب ایک گنبد دار عمارت کو قالینوں، گدیوں اور فرشی نشستوں سے آراستہ کر دیا گیا۔ لیکن یروشلم کو دارالخلافہ بنانے کا منصوبہ زیر عمل نہ آ سکا۔ یہ شہر ایسا جغرافیائی محل وقوع رکھتا تھا کہ اسے سلطنت کا مرکز بنانا بہت مشکل تھا۔ خلیفہ سلیمان کو اس حقیقت کا ادراک لیدا گیا۔ نئے شہر رملہ کی تعمیر کے دوران ہوا۔ رملہ کو جند فلسطین کا انتظامی دارالحکومت بنایا گیا۔ نئے شہر نے یروشلم کی بہت سی طاقت اور خوشحالی اپنی طرف کھینچ لی۔ امویوں کے لئے ویسے بھی یہ بات ممکن نہیں تھی کہ وہ ایک ایسے شہر کو اپنا پایہ تخت بنالیں جس میں غیر مسلموں کی اکثریت ہو۔ لیکن ان تمام عوامل کے باوجود ان کی نظروں میں یروشلم کی اہمیت مسلمہ تھی ابتدائی زمانے ہی سے مسلمان چاہتے تھے کہ اپنا دارالحکومت مقدس مقامات سے دور رکھیں۔ حضرت محمد ﷺ نے مکہ فتح کر لینے کے باوجود اپنا دارالحکومت مدینہ سے وہاں منتقل نہ کیا۔ حالانکہ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اس معاملے میں کسی شک وشبہ میں نہ رکھا کہ مکہ سب سے زیادہ مقدس مقام ہے۔ پہلے تین خلفاء نے بھی اپنا دارالحکومت مدینہ ہی کو بنائے رکھا۔ اسی انداز میں رملہ کو یروشلم پر ترجیح دی گئی۔ خود یہودیوں نے بھی یروشلم کیلئے اپنی گہری عقیدت کے باوجود رملہ میں رہنا پسند کیا۔ نئے شہر میں یہودی برادری یروشلم کے مقابلے میں ہمیشہ بہت زیادہ رہی۔

آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں سلطنت خلفشار میں مبتلا ہوگئی۔ 744ء میں خلیفہ الولید کو قتل کر دیا گیا۔ جند فلسطین اور جنداردن کے قبائل نے ولید کے بیٹے یزید کے خلاف بغاوت کر دی۔ انہوں نے بغاوت دبائے جانے کے بعد بھی ذمیوں کے لئے اس کے فراخدلانہ رویہ کی مخالفت جاری رکھی۔ الشام میں یزید کے جانشین مروان دوم کے خلاف بھی بغاوت کے آثار ابھرے چنانچہ خلیفہ نے احتیاطی اقدام کے طور پر یروشلم، حمص، دمشق اور دوسرے شہروں کی دیواریں گرادیں۔ 11 ستمبر 747ء کو یروشلم میں زلزلہ نے خاصی تباہی مچائی۔ قبتہ الصخرہ کی مشرقی اور مغربی دیواریں زمین بوس ہو گئیں۔ یہی کیفیت الولید کی مسجد، امویوں کے محل اور جسٹنین کے ''نے آ'' چرچ کی ہوئی۔ حرم کے قریب رہنے والے بہت سے مسلمان ہلاک ہوگئے۔ زلزلے کے مزید جھٹکوں کے خوف سے لوگ تقریباً چھ ہفتوں تک پہاڑوں میں رہے۔ زلزلہ امیہ خاندان کے سیاسی زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ حضرت عباس، پیغمبرؐ اسلام کے چچا کی اولاد نے ماورائے اردن کو اپنا مرکز بنا کر امویوں کے لئے ایک عرصہ سے خطرہ پیدا کر رکھا تھا۔ 749ء میں انہوں نے خراسان کے ابومسلم کی فوج سے اتحاد کر لیا۔ اس نے خلافت کے تمام مخلفین کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ جنوری میں خلیفہ مروان کو دریائے دجلہ کے مشرق میں دریائے زاب کے کنارے پہ حتمی شکست ہوگئی۔ پھر جلد ہی فلسطین میں بقیہ امویوں کو قتل کر دیا گیا۔ اور العباس سفاح پہلا عباسی خلیفہ بنا۔ لیکن عباسی اپنا دارالخلافہ نئے شہر بغداد میں لے گئے۔ اس اقدام کے سنگین نتائج یروشلم میں مرتب ہوئے۔

=========

حوالہ جات

www.HallaGulla.com

1۔ قرآن مجید 3:65-68۔۔۔انگریز ترجمہ علامہ محمد اسد کی تفسیر دی میسج آف قرآن (جبرالٹر 1980) سے لیا گیا ہے۔

2۔ قرآن مجید 29:46۔مغرب میں عام طور پر ''اہل کتاب'' کا ترجمہ The People of the Book کیا جاتا ہے لیکن علامہ اسد کا ترجمہ زیادہ درست اور بامعنی ہے۔

"The People of an Earlier Revelation. "

3۔ اس ضمن میں قرآن کی یہ آیات مثال بنائی جاسکتی ہیں۔

21: 129.32. 35:22, 61:6

4۔ قرآن مجید 2:30-37

5۔ قرآن مجید 2:125 انسائیکلوپیڈیا اسلامیکا کے دوسرے ایڈیشن میں لفظ ''کعبہ'' سے بھی استفادہ کیا گیا۔

6۔ قرآن مجید 6:159, 161-163

7۔ قرآن مجید 17:1

8. Clinton Bennet, "Islam," in Jean Holm with John Bowker Sacred Place (London, 1994), pp. 88-89.

9۔ تسخیر کی درست ترین تاریخ معلوم نہیں ہے۔

10. Eutyches, Annals 16-17.

11. Quoted in Guy Le Strange, Palistine Under the Moslems. A description of Syria And the Holy Land from AD 650 To 1500

Virtual Home for Real People

(London 1890). P. 141.

12۔ مطاہر الکیرم 5، شمس الدین سیوطی، الولید بن مسلم۔

13. Muthir al-Ghiram, 5; Shams ad-Din Suyuti; al-Walid ibn Muslim. Traditions quoted in Le Strange, Palestine Under the Moslems pp. 139-43.

14۔ ہشام العمر،

----- do ----- p. 142.

15. Adamnan, The Pilgramage of Arculfus in the Holy Land, trans. and ed. James Roswe Macpherson, (London,1895; New York, 1971), pp. 4-5.

16۔ طبری۔ تاریخ الرسول والملوک 1:2405

17. Moshe Gil, A History of Palestine, 634-1099, trans. Ethel Broido (Cambridge, 19912) pp. 143-48.

18. History 3:226 Quoted in Joshua Prawer, The Latin Kindgdom of Jerusalem, European Colonialism in the Middle Ages (London 1972). p. 216.

19. Robert L. Wilkon, The Land Called Holy: Palestine in Christian History and Thoughts (New Haven & London 1992) pp. 241-49.

20۔ عربوں کو یونانی ''سراکنیوئی (لاطینی میں سارا کینی) کہتے تھے۔ اس سے بھی پہلے انہیں Scenite Arabs یعنی خیمہ نشین عرب کہا جاتا تھا۔ یونانی میں خیمہ کو ''سکینے'' (Skene) کہا جاتا ہے۔

21۔ حرم الشریف (The Noble Sanctuary) کی اصطلاح عثمانیوں کے دور تک مسجد اقصیٰ کے پورے قرب وجوار کے لیے استعمال نہیں ہوتی تھی۔ تب تک پورے علاقے کو مسجد اقصیٰ کہا جاتا تھا۔ میں نے مسجد اور مخصوص علاقے کو الگ الگ سمجھنے کے لیے یہ اصطلاح استعمال کی ہے۔

22. GIL-History of Palestine-pp. 70-72, 636-38.

23. Ibid p. 72.

24. F. E. Peters, Jerusalem: The Holy city in the Eys of Chroniclers, Visitors, Pilgrims and Prophets from The Days of Abraham to the Beginning of Modern Times (Princeton, 1985) p. 192.

25. "Book of Commandments" in Gill, History of Palestine. p.71.

26. Isaac Hasson, "Muslim Literature in Praise of Jerusalem." in L.I. Levine, The Jerusalem Cathedra: Studies in the History Geography and Ethnography of the Land of Israel, 3 vols. (Jerusalem, 1981-83), 1:170.

27۔ مقدسی، احوال شام وفلسطین۔

28. Adamnan, Pilgrimage of Arculfus. p.24.

29. Gil, History of Palestine. p. 92.

30. Benjamin Mazar, The Mountain of the Lord (New York, 1975) p. 98.

31. F.E. Peters, Whw Built the Dome of the Rock (1983) Meir Ben Dov, The Wetern Wall (Jerusalem-1983), p. 57.

32۔ قرآن مجید 19:34-37, 4:172, 4:171

33. Oleg Grabar, "The Umazyyad Dome of the Rosk in Jerusalem," Ars Orientalis 3:33 (1959); The Formation of Islamic Art (New Haven and London, 197), pp. 49-74.

34. Bernard Lewis, An Apocalyptic Vision of Islamic History, Bulletin of the School of Oriental and Afriean Studeis. 13 (1950). برنارڈ لیوس کے مطابق خلیفہ معاویہ ہی وہ فرد تھا جس نے سب سے پہلے قبتہ الصخرہ تعمیر کرنے کا ارادہ اور منصوبہ بنایا۔

35. History, 2:311.

36. Bennett, 'Islam'- pp. 106-7.

37. Meir Kister, 'A Comment on the Antiquity of Tradions, Praising Jerusalem, in Levine, Jerusalem Cathedra 1:85-86.

38. F.E. Peters, The Distant Shrine: The Islamic Centuries in Jerusalem, (New york, 1993), p. 60.

39۔ مجیرالدین، تاریخ یروشلم انگریزی ترجمہ ہنری سیوائر (پیرس- 1876) صفحہ 57۔

=========

بارھواں باب

القدس

مسلمانوں نے یروشلم میں ایک ایسا نظام قائم کیا جس نے پہلی مرتبہ یہودیوں عیسائیوں اور مسلمانوں کے اکھٹے رہنے کے قابل بنایا۔ جب سے یہودی بابل کی جلاوطنی سے واپس آئے تھے۔ ان توحید پرستوں نے شہر کا ایک ایسا تصور وضع کیا تھا جس میں اس کی تقدیس کا انحصار باہر سے آنے والوں کے اخراج پر تھا۔ مسلمان تقدیس کا ایک داخلی تصور رکھتے تھے۔ لیکن انہوں نے حضرت ابراہیم کے تینوں مذاہب کی بقائے باہمی کا انتظام کیا۔ اس میں ہر مذہب کے پیروکار اپنے علاقے میں رہتے تھے اور اپنی اپنی عبادت گاہوں میں عبادت کرتے تھے۔ یہ انتظام ظاہر کرتا تھا کہ تسلسل اور ہم آہنگی کا تصور درست ترین رہنمائی رکھنے والے مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور یہ یقیناً صرف ایک خدا ہی سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسے شہر میں

مل جل کر رہنا جو تینوں مذاہب کے لیے محترم ہو، توحید پرستوں کو ایک بہتر باہمی تفہیم کی طرف لے جا سکتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ صورتحال میں ایک موروثی کشیدگی تھی۔ گزشتہ چھ سو برسوں سے یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان بالخصوص یروشلم کی حیثیت کے بارے میں تناؤ تھا۔ دونوں فریقوں میں سے ہر ایک، دوسرے کو غلطی پر سمجھتا تھا۔ چنانچہ شہر مقدس میں شانہ بشانہ رہنے کے باوجود معاملات بہتر نہ ہو سکے۔ کچھ مسلمانوں نے بھی قرآن کا آفاقی تصور ترک کر کے دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ صرف اسلام ہی ایک سچا مذہب ہے۔ صوفیاء اور فلاسفروں نے اپنے اپنے انداز میں پرانے نصب العین کے نفاذ کی کوشش کی لیکن مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی اکثریت نے اسے طے شدہ امر سمجھ لیا کہ اسلام نے تمام سابقہ ادیان کو منسوخ کر دیا ہے۔ جب توحید پرستی ایک دفعہ اس طرح کا دعویٰ کر دیتی ہے تو پھر بقائے باہمی بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ جب ہر مذہب سمجھتا ہے کہ وہ۔۔۔ اور صرف وہی۔۔۔ سچا ہے تو پھر دوسروں کی طرف سے ایسا دعویٰ ایک ناقابل برداشت چیلنج بن جاتا ہے۔ چونکہ تینوں مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنی ممتاز شناخت اور ایک موروثی برتری مسلط کرنے کی کوشش کی تھی چنانچہ عباسیوں کے دور میں بیت المقدس میں کشیدگی بڑھتی گئی۔

شہر میں پھیلنے والے اضطراب کا ایک سبب دارالخلافہ بغداد کو منتقل کئے جانے کا فیصلہ تھا۔ 762ء میں بغداد، اسلامی سلطنت کا دارالحکومت بن گیا۔ یروشلم عباسیوں کے لیے بھی اہمیت رکھتا تھا لیکن وہ اس پر اندھا دھند دولت خرچ کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ اپنے پیشروؤں کی طرح الشام اور بیت المقدس پر زیادہ توجہ دینے کے حق میں ہی نہیں تھے۔ اموی دور میں یروشلم کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ اموی خلیفہ باقاعدگی سے شہر مقدس میں آیا کرتے تھے۔ چنانچہ شہر کے لیے مانوس لوگ تھے۔ عباسی لاتعلق سے حکمران تھے اور ان میں سے کسی کا وہاں آنا ایک بہت بڑا واقعہ ہوتا تھا۔ لیکن ابتدا میں انہوں نے ضروری سمجھا کہ اپنی قانونی حیثیت کا علامتی جواز مہیا کرنے کے لیے یروشلم کا دورہ کیا جائے۔ 757ء میں جونہی خلیفہ المنصور اپنا اقتدار مستحکم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے حج سے واپسی پر بغداد جانے سے پہلے یروشلم کا دورہ کیا۔ شہر کی حالت دگرگوں تھی۔ 747ء میں آنے والے زلزلہ کے بعد سے حرم اور امویوں کا محل ابھی تک کھنڈر کی صورت میں تھے۔ جب مسلمانوں نے خلیفہ سے کہا کہ حرم کے جنوبی حصے میں موجود الولید کی مسجد بحال کی جائے تو اس نے مختصر سا جواب دی:۔۔۔ میرے پاس تو اتنی رقم نہیں ہے۔۔۔ لیکن پھر اس نے تجویز پیش کی کہ قبتہ الصخرہ کے سونے اور چاندی کے ورق اتار کر مسجد کے اخراجات پورے کر لیے جائیں۔ عباسیوں نے حرم کو نظر انداز تو نہ کیا لیکن امویوں کی طرح فیاضی سے اس کی تزئین و آرائش بھی نہ کی۔ مسجد دوبارہ تعمیر ہوئی تو 771ء میں پھر ایک زلزلے میں منہدم ہو گئی۔ جب خلیفہ المہدی (775-85ء) سریر آرائے مسند ہوا تو اس نے حکم دیا کہ مسجد کی تعمیر نو اور توسیع کی جائے۔ اس دفعہ تمام گورنروں اور فوجی کمانڈروں کو کہہ دیا گیا کہ وہ اخراجات کے لیے مالی ذمہ داریاں پوری کریں۔ نئی مسجد پرانی مسجد سے زیادہ مستحکم تھی اور اس وقت بھی موجود تھی جب مقدسی نے 755ء میں یروشلم کا احوال لکھا۔ اب یہ پہلے سے زیادہ وسیع اور ایک خوبصورت گنبد سے

مزین تھی۔ ''امویوں کی بچ رہنے والی عمارتوں میں سے یہی ایک تھی جو نئی عمارتوں کے درمیان ایک خوبصورت نشان نظر آتی تھی۔'' (1)

اس مسجد کا نام اب ''مسجد الاقصیٰ'' تھا۔ اقصیٰ کے معنی دور دراز کے ہیں۔ اب اسے حتمی طور پر معراج النبی ﷺ ۔۔۔ پیغمبرؐ اسلام کے رات کے سفر سے منسوب کیا جاتا ہے جس کا مختصر سا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے۔ (2) پیغمبرؐ اسلام کی یروشلم رویا کی سب سے پہلی تفصیل محمد بن اسحاق نے تحریر کی ہے۔ محمد بن اسحاق کی وفات 767ء میں ہوئی)۔ وہ بتاتا ہے کہ کس طرح پیغمبرؐ اسلام معجزانہ طور پر مکہ سے کوہ معبد پر فرشتہ جبرائیل کی معیت میں آئے اور پھر وہاں سے سات آسمانوں میں سے گزرتے ہوئے خدا کے تخت (سدرۃ المنتہیٰ) تک پہنچے۔ کچھ مسلمان اس واقعہ کو لفظ بہ لفظ درست سمجھتے ہیں اور ایمان رکھتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے مکہ سے یروشلم اور پھر آسمانوں کا سفر جسمانی طور پر کیا۔ جب کہ بقیہ مسلمان جن میں حضرت عائشہؓ، حضرت محمد ﷺ کی عزیز ترین بیوی، بھی شامل ہے اصرار کرتے ہیں کہ یہ محض ایک روحانی تجربہ تھا۔ یہ سفر جسمانی تھا یا روحانی ۔۔۔ خدا سے ملاقات کے اس سفر کو یروشلم سے وابستہ کرنا مسلمانوں کے لئے فطری تھا۔ 691ء میں قبتہ الصخرہ کی تکمیل کے بعد سے حرم اولین روحانی معراج کا طاقتور مثالی پیکر بن چکا تھا۔ صوفیاء بیت المقدس کو کھنچے چلے آتے تھے۔ جن دنوں مسجد الاقصیٰ نئی تعمیر کے مرحلے سے گزر رہی تھی، عالم اسلام کی معروف صوفی خاتون رابعہ الاضاویہ (رابعہ بصری) کا شہر میں انتقال ہو گیا اور انہیں کوہ زیتون پر قبتہ الصخرہ کی بصری حدود میں دفن کیا گیا۔ تصور کے بانیوں میں سے ایک بزرگ، ابو اسحاق ابراھیم بن ادھم، یروشلم میں رہنے کے لئے خراسان سے وہاں پہنچے۔ صوفیاء مسلمانوں کو کہتے تھے کہ وہ اسلام کی روحانیت کو اپنی ذات میں تلاش کریں۔ ان کے تصور کی تفہیم میں ابتدائی وحدت کو مراجعت ہی اصل مقصد تھا۔ چنانچہ ان کے روحانی تجربے کا نقشہ یا نمونہ حضرت محمدؐ کا رات کا سفر اور معراج تھا۔

مسلمان صوفیاء حرم کے اردگرد جمع ہوتے گئے۔ کچھ صوفیا نے چبوترے کے کناروں کے گرد ستون دار چھجوں کے نیچے رہنا شروع کر دیا تا کہ وہ گنبد اور اس چٹان کی مسلسل زیارت کرتے رہیں جہاں سے آسمان کا سفر شروع ہوا۔ وہ بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت سے بھی کام لینا چاہتے تھے۔ یروشلم میں ان کی موجودگی سودمند اثرات مرتب کر سکتی تھی کیونکہ صوفیا دوسرے مذاہب کا احترام کرتے تھے۔ اور اسی رجحان کو فروغ دے رہے تھے۔ جس وقت فقہا اور علما اسلامی قوانین مدوّن کرتے ہوئے صرف اور صرف اسلام کی بالادستی کا دعوی کر رہے تھے، صوفیا قرآن کی آفاقیت اور عالمگیریت سے وابستہ رہے۔ صوفیا کا معمول تھا کہ وہ وجد کے عالم میں نعرہ لگاتے تھے کہ وہ (مرد اور عورت) نہ تو یہودی یا عیسائی ہیں اور نہ مسلمان۔ چنانچہ وہ مسجد، گرجا یا کنشت میں بھی انتہائی مطمئن رہتے کیونکہ وہ اپنی انا کے خول کو توڑ کر فنا کی کیفیت میں داخل ہو جاتے تھے۔ یوں وہ اپنی دنیاوی شناخت سے بلند تر ہو جاتے۔ تمام مسلمان ان صوفیانہ کیفیات سے ہمکنار نہیں ہو سکتے تھے لیکن وہ صوفیانہ خیالات سے بہت متاثر تھے۔ اسلامی سلطنت کے کچھ حصوں میں تو تصوف غالب قسم کا اسلامی مکتبہ فکر بن

چکا تھا۔لیکن ابتدائی دور میں اسے تشکیلک کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

حضرت محمد ﷺ کے یروشلم کے سفر کا عقیدہ اس شہر کو دوہری فضیلت دینے کا ذریعہ بنا۔معبد کے شہر کی حیثیت سے اس کا احترام تو ہمیشہ سے تھا۔لیکن اب یہ پیغمبرؐ اسلام سے بھی وابستہ ہو چکا تھا۔پیغمبر اسلام جو انسان کامل تھے جن کی روحانی پرواز، ''مکہ سے یروشلم'' نے دونوں مقدس شہروں کے درمیان طاقتور تعلق پیدا کر دیا تھا۔حضرت محمد ﷺ نے اپنی ذات کے ذریعے مکہ کی ابتدائی تقدیس کو دور دراز کی مسجد (الاقصیٰ) تک یروشلم میں پہنچا دیا تھا۔مکہ اور مدینہ کی طرح یروشلم کی فضیلیت اس عظیم ترین انسان کی موجودگی کے سبب بڑھ گئی تھی۔جس نے زمین اور آسمان کے درمیان ایک نیا تعلق مہیا کر دیا تھا۔پیغمبرؐ اسلام کے معراج نے اس حقیقت کو واضح کیا۔اب اس مرحلہ پر مسلمان، اپنے پیغمبرؐ کی زندگی کو ''رویت الٰہی'' کی حیثیت سے دیکھنے لگے۔وہ الوہی ذات نہیں تھے لیکن ان کا کردار دنیا میں خدا کی سرگرمیوں کی علامت اور اللہ کی مکمل ترین اطاعت کا نمونہ تھا۔آٹھویں اور نویں صدی عیسوی کے دوران علما نے پیغمبرؐ اسلام کی احادیث اور سنت (معمولات زندگی) کی روایات مدون کیں۔یہی اسلامی قوانین (شریعت) اور مثالی مسلمان کی روزمرہ زندگی کی بنیاد تھی۔ سنت مسلمانوں کو سکھاتی تھی کہ جو کچھ حضرت محمد ﷺ کرتے تھے اس کی تقلید کریں۔اس میں ان کا اٹھنا بیٹھنا، بولنا، ملنا جلنا یہاں تک کہ زندگی کی تمام تر تفصیلات شامل تھیں۔مکمل ترین اسلام کا نمونہ ان کی سنت تھی۔تقلید کا عمل مسلمانوں کو ازلی ابدی سانچے میں ڈھالتا تھا۔یہ سانچہ پیغمبرؐ اسلام کی شکل میں خدا کی مرضی ومنشا تھی۔

MAP (نمقشہ)

مسجد الاقصیٰ میں ایک مسلمان تلاوت کلام اللہ میں مصروف ہے۔قرآن کا مطالعہ
مسلمانوں کو خدا سے رابطہ اور خدا کی رضا کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے رہنمائی مہیا کرتا ہے۔

حضرت محمد ﷺ کی زندگی کے کئی اور واقعات خود کو مکمل طور پر خدا کے سپرد کر دینے کی خوبصورت مثالیں ہیں۔ مسلمانوں کے لئے زندگی کے منبع و ماخذ کی طرف رجوع کے لئے یہی اولین و بنیادی طریقہ ہے۔جو مسلمان یروشلم میں عبادت کے لئے آتے وہ ''اسرا'' اور ''معراج'' کے خارجی واقعات کی علامتی انداز میں نقل کرتے اور یوں پیغمبرؐ اسلام کی روحانی پرواز میں شامل ہونے کی تسکین حاصل کرتے۔وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح پیغمبرؐ اسلام کی خدا کو مکمل خود سپردگی کے اقدام کی کسی حد تک پیروی کر رہے ہیں۔حرم میں ان کی سنت کی پیروی عیسئوں کے مذہبی جلوسوں جیسی ہی تھی جو یروشلم میں حضرت عیسیٰ کے نقوش قدم پر چلتے تھے۔آٹھویں صدی عیسوی کے دوران حرم میں متعدد چھوٹی چھوٹی خانقاہیں اور محرابیں

بھی نظر آنے لگیں۔تاریخ کچھ نہیں بتاتی کہ یہ خانقاہیں ٹھیک کب وجود میں آئیں۔البتہ ان کے مقامات آپ نقشہ میں دیکھ سکتے یں۔قبتہ الصخرہ کے شمال میں چھوٹا سا گنبد مقام جبرائیل تھا۔(3) یہ چھوٹی چھوٹی خانقاہیں ان مقامات کی نشاندہی تھیں جہاں پیغمبرؐ اسلام اور فرشتہ جبرائیل نے دوسرے انبیاء کے ساتھ مل کر نماز پڑھی اور پھر طلائی سیڑھی (المعراج) کے ذریعے اوپر چلے گئے۔قریب ہی گنبد معراج تھا یہاں سے انہوں نے سیڑھی پر قدم رکھا۔مسلمان حرم کے جنوبی دروازے کے پاس عبادت کرنا بھی افضل سمجھتے تھے۔اسے باب رسول ﷺ کہا جاتا تھا۔سمجھا جاتا تھا کہ یہیں آپ جبرائیل کے پیچھے شہر میں داخل ہوئے۔آپ ﷺ کے داخل ہونے پر تاریکی اس طرح تیز روشنی میں تبدیل ہوگئی جس طرح سورج کی روشنی رات کو دن میں بدل دیتی ہے۔پھر وہ دونوں حرم کے جنوب مغربی گوشے کی طرف گئے جہاں مکہ سے آنے کے بعد براق کو باندھا گیا تھا۔

احاطہ حرم میں دیگر خانقاہیں دوسرے انبیاء کی اس وقت موجودگی کے مقام کی نشاندہی کرتی تھیں۔یہاں ایک بار پھر ہمیں صوفیاء کا اثر ورسوخ دکھائی دیتا ہے۔یروشلم میں آنے والے مسلمان زائرین کو سکھایا جاتا تھا کہ وہ ان مردوں اور عورتوں کو احترام کے ساتھ یاد کریں جنہوں نے یہاں قیام کیا،عبادت کی اور مصائب جھیلے۔قبتہ الصخرہ کے مشرق میں قبتہ سلسلہ تھا۔کہا جاتا ہے کہ یہاں حضرت

داؤد نے بنی اسرائیل کے بچوں کا امتحان لیا تھا۔اس کے لئے انہوں نے روشنی کی ایک خصوصی زنجیر (سلسلہ) کا استعمال کیا جو جھوٹوں کو بے نقاب کرنے کی طاقت رکھتی تھی۔حرم کے شمالی کنارے پر تخت سلیمان تھا۔جہاں حضرت سلیمان نے معبد کی تعمیر مکمل ہونے پر شکرانے کی عبادت کی تھی۔حرم کے کچھ دروازے یہودیوں کی تاریخ سے تعلق رکھتے تھے۔مثلاً ایک دروازے سے منسوب تھا کہ بنی اسرائیل تابوت یہواہ کو اس میں سے گزار کر لائے تھے۔اس کا نام باب شیکنہ تھا۔یوم کفارہ کو جس دروازے پر توبہ کے لئے عبادت کی جاتی تھی،اسے باب حطہ کہتے تھے۔لیکن یروشلم حضرت عیسیٰ کا بھی شہر تھا۔قرآن ہمیں انکی پیدائش اور بچپن کے واقعات بھی بتاتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ جب مقدسہ مریم حاملہ تھیں تو انہیں کھانا غیب سے ملتا تھا۔جب حضرت عیسیٰ ابھی شیر خوار تھے تو پنگھوڑے میں ہی بولنے کی معجزانہ صلاحیت رکھتے تھے۔یہ معجزہ ان کی نبوت کا اولین ثبوت تھا۔(4) چنانچہ حرم میں آنے والے مسلمان زائرین حضرت زکریا کے مقام پر بھی ضرور عبادت کرتے تھے۔یہ چبوترے کے شمال مشرقی کونے میں تھا۔دو اور خانقاہیں راہداری کے نیچے تہہ خانوں میں تھیں۔انہیں محراب مریم اور مہد عیسیٰ کہا جاتا تھا۔ان تمام مقدس مقامات کی زیارت کے بعد آخر میں مسلمان منڈیر سے وادی حنوم (وادی جہنم) اور کوہ زیتوں کو بھی دیکھتے یہاں بعض روایات کے مطابق حشر برپا ہوگا۔حرم کی مشرقی دیوار کے سنہری دروازے کو ''باب رحمت'' کہا جاتا تھا۔یہ قرآن میں ذکر کئے گئے ،مرحوم اور مغضوب دونوں طرح کے انسانوں کے درمیان حساب کے بعد حد فاصل ہوگی۔(5) حرم جنت ہوگا اور وادی حنوم جہنم ہوگی۔دروازے کے اوپر کے کمروں میں صوفیا نے مسجد کے ساتھ خانقاہ قائم

کر رکھی تھی۔ جس میں رہ کر وہ باطن پر غور کرتے تھے۔

خلیفہ ہارون الرشید (786-809ء) پہلا عباسی حکمران تھا جس نے یروشلم آنا ضروری نہ سمجھا۔ حالانکہ وہ حج سے واپس آتے ہوئے کئی مرتبہ شام کے علاقے میں آیا۔ عباسیوں نے بتدریج خود کو مقدس شہر سے لاتعلق بنانا شروع کر دیا تھا۔ شاید اس لئے کہ یہ شہر ان کے نفرت زدہ دشمنوں، بنی امیہ کا پسندیدہ اور اہم شہر تھا۔ بغداد میں ہارون کا دربار افسانوی شان وشوکت سا مالا مال اور زبردست ثقافتی گلدستہ تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ خلافت عباسیہ کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ ہارون اپنی حکمرانی عراق سے باہر موثر طریقے سے نافذ کرنے میں ناکام ہو چکا تھا۔ سلطنت کے مختلف حصوں میں مقامی حاکموں اور جرنیلوں کی طرف سے خدندانی حکومتیں قائم کرنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ یہ لوگ بظاہر خلیفہ کے نام سے حکومت کرتے تھے لیکن خود مختار اور مطلق العنان ہوتے تھے۔ اسی دور میں فلسطین مرکزی حکومت کے اقتصادی انحطاط سے متاثر ہوا۔ امویوں کے اقتدار میں فلسطین خوشحال ہو گیا تھا لیکن عباسیوں نے اس علاقے کا استحصال شروع کر دیا۔ اس کی دولت اور وسائل کو پوری طرح نچوڑ لیا گیا۔ ہارون کے دور میں ہی طاعون کی وباء پھیل گئی اور آبادی کا بہت بڑا حصہ اس کی نذر ہو گیا۔ بدویوں نے دیہات پر حملے کر کے لوٹ مار شروع کر دی۔ انہوں نے اپنی قبائلی جنگ فلسطین کے علاقے میں منتقل کر دی۔ امویوں کے عہد میں بدوی، خلافت کے لئے جنگ کرتے تھے۔ اب وہ ملک کے لئے عذاب بن گئے۔ اضطراب کا پہلا اظہار یروشلم کے مقامی مسلمانوں اور عیسائیوں کے

MAP (نقشہ)

الحرم الشریف

1۔ نمبر سے لیکر 20۔ نمبر تک

درمیان کشیدگی کی صورت میں سامنے آیا۔ بدویوں نے یہودیہ کی خانقاہوں پر حملے شروع کر دیئے تھے اور مغربی پہاڑی کے عیسائیوں کو پتہ چل گیا کہ اقتصادی طور پر کمزور مسلمان ان کی آسودگی کو ناپسند کر رہے ہیں۔ عیسائیوں کے چرچ وافر دولت کی نمائندگی کرتے تھے اور مشکل حالات میں مسلمان مسیحی خزانے کی کہانیوں پر بہت برہم ہوتے۔

یروشلم کے لوگوں کے لئے ہارون الرشید نامانوس اور غیر مقبول شخصیت تھا لیکن مغربی یورپ کے لوگ اسے ایک ایسی مہربان شخصیت سمجھتے تھے جس نے انہیں اپنے شہنشاہ کی قدر و قیمت سے آشنا کر دیا تھا۔ 800ء کے کرسمس کے دن پوپ

لیوسوم نے فرانکوں کے بادشاہ چارلس کی تاجپوتی، مغرب کے مقدس رومن شہنشاہ کی حیثیت سے کی۔ تخت نشینی کی رسم میں یروشلم کے راہبوں نے بھی شرکت کی۔ بازنطینیوں نے چارلس کی یہ حیثیت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا مؤقف تھا کہ ''شاہی ارغوانی لبادے'' کے لئے کسی وحشی گنوار کا انتخاب قابل نفرت تصور ہے۔ چارلس کو اپنے خلیفوں کے لئے بہت دور نظر دوڑانا پڑی۔ اس نے اپنے باپ کی طرح بغداد سے رابطے بڑھائے۔ مغرب کے لوگ ایک بار پھر اپنے شہنشاہ کو پا کر سنسنی میں مبتلا تھے۔ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ روم کے سقوط کے بعد یورپ پر تاریکی چھا گئی ہے۔ نئے شہنشاہ کی آمد سے انہیں لگتا تھا کہ اب یہ دھند اور تاریکی چھٹ جائے گی۔ وہ چارلس کو ''شارلیمان''، یعنی چارلس اعظم کہتے اور اسے ایک منتخب قوم کے بادشاہ کی حیثیت سے دیکھتے۔ ایکن میں اس کا دارالحکومت ایک نیا یروشلم تھا۔ اس کا تخت بھی ''سلیمان بادشاہ'' کے تخت جیسا بنایا گیا۔ فطری طور پر وہ اپنی نئی مغربی شناخت چاہتے تھے۔ مغرب کے لوگ یروشلم کے مقدس شہر کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ جہاں ''یسوع مسیح'' کی قبر دریافت ہو چکی تھی اور وہ اس کی زیارت کے لئے بیتاب رہتے تھے۔ شارلیمان نے خلیفہ ہارون الرشید سے تحائف کا تبادلہ کیا۔ یروشلم کے اسقف اعظم نے بھی شارلیمان کو مقدس تبرکات اور ''گرجا حیات نو'' کی چابیاں بھجوائیں۔ خلیفہ نئے یورپی حلیف کو پا کر بہت خوش تھا۔ چنانچہ اس نے شارلیمان کو ''گرجا حیات نو'' کے پاس یروشلم میں ایک مسافر خانہ ایک چرچ اور اس کے ساتھ شاندار لائبریری بنانے کی اجازت دے دی۔ شارلیمان نے وادی قدرون میں مسیح زائرین کے لئے بارہ کمروں پر مشتمل ایک عمارت، اس کے ساتھ ناکستان (انگور کا باغ)، کھیت اور چھوٹا سا بازار بنانے کا بھی حکم دیا۔ اب نئے شہنشاہ کی جڑیں یروشلم میں موجود تھیں اور کہا جا سکتا تھا کہ اس کی سلطنت کی جڑیں زمین کے مرکز میں پائی جاتی ہیں۔

چارلس کی سلطنت اس کی موت کے بعد زندہ نہ رہ سکی۔ لیکن یورپ کے لوگ اس کی مختصر سی زندگی اور یروشلم کے ساتھ روابط کو کبھی نہ بھول سکے۔ بعد میں کچھ مورخین اور وقائع نگاروں نے دعوی کیا کہ خلیفہ، شارلیمان سے اتنا متاثر تھا کہ وہ پوری ارض مقدس اس کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔(6) کچھ مورخین کا کہنا تھا کہ خلیفہ نے یروشلم کے عیسائیوں کے امور شارلیمان کے سپرد کر دیئے تھے۔ یورپ میں ایک بات تو یقین کے ساتھ کہی جاتی تھی کہ اگرچہ خلیفہ ہارون، شارلیمان کو ارض فلسطین تو نہ دے سکا لیکن اسے گرجا حیات نو کی ملکیت دے گیا۔ چنانچہ اس مقدس مقام پر ان کا جائز حق ہے۔(7) یہ دعویٰ تین سو سال بعد صلیبی جنگوں کے وقت سامنے آیا۔ لیکن اس طرح کے خواب اور تصورات دراصل یورپ کے راہب اور پادری وضع کر رہے تھے۔ 807ء میں گرجا مولد مسیح کے لیے یونانیوں اور لاطینیوں کے درمیان بلوہ ہو گیا۔ مشرقی اور مغربی عیسائی دونوں ہی مسیحیت کو مختلف شکل کا مذہب بنا رہے تھے۔ فطری طور پر ایک دوسرے کے لئے نفرت محسوس کرنے لگے۔ اسی نفرت نے مسیحی دنیا کے ایک مقدس ترین مقام پر فساد کو جنم دیا۔ یروشلم میں ایک طویل اور شرمناک محاذ آرائی کا آغاز ہو گیا۔

یروشلم کے مغربی پہاڑ پر نئی لاطینی عمارتیں مسلمانوں کے نزدیک مقامی عیسائیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور دولت کی مظہر تھیں۔ انکا اپنا خلیفہ مقدس شہر کو نظر انداز کر رہا تھا جب کہ عیسائی بادشاہ وہاں اپنے پاؤں جما رہے تھے۔ شام کے توحید پرست فرقہ ''یعقوبیہ'' نے بھی حرم کے شمال میں ''مریم مگدلینی'' کی یاد میں ایک خانقہ تعمیر کر لی۔ یہ دور فلسطین کے لئے بہت گھمبیر تھا۔ 809ء سے 813ء تک اسلامی لسطنت میں خانہ جنگی برپا رہی۔ ہارون کے دو بیٹے جانشینی کی جنگ میں مصروف تھے۔ جب یہ قضیہ طے ہو گیا اور سلطنت مامون الرشید کو مل گئی تو یروشلم ایک بار پھر قدرتی آفت زلزلہ سے شدید متاثر ہوا۔ گرجا حیات نو کا گنبد ٹوٹ گیا۔ ساتھ ہی طاعون پھیل گیا جس نے ملک بھر کو ویران کر دیا۔ رہی سہی کسر قحط نے پوری کر دی۔ اس دوران حرم کے ساتھ نسبتاً کم صحت بخش علاقے میں رہنے والے مسلمانوں کو چند ہفتوں کے لئے شہر سے باہر منتقل ہونا پڑا۔ واپسی پر وہ یہ دیکھ کر غضبناک ہو گئے کہ اسقف اعظم نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گرجا حیات نو کا گنبد تعمیر کر لیا ہے۔ اب یہ کم و بیش قبتہ الصخرہ جتنا بڑا تھا۔ مسلمان باشندوں نے خلافت کے مقامی کمانڈر کو شکایت کی عیسائیوں نے اس معاہدے کے خلاف ورزی کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ زمی اپنی عبادت گاہوں کو مساجد اور امہ کی دیگر مقدس عمارتوں سے اونچا یا بڑا نہیں بنا سکتے۔

یہ ایک پریشان کن صورت حال تھی۔ اس طرح کے مسائل یروشلم میں مسلسل جنم لینے لگے۔ تعمیرات شہر میں ایک طویل عرصہ سے نظریاتی ہتھیار رہا تھا۔ ہیڈریان کے دور سے یہ شہر کے پرانے قابضین کی عمارتوں کو مٹانے کا ایک حربہ تھا۔ اب یروشلم میں عمارتیں مذہبی گروہوں کی ایک دوسرے کے خلاف دشمنی کے اظہار کا ذریعہ بن رہی تھیں۔ مسلمان ہمیشہ ہی خود کو بیت المقدس میں عیسائیوں کے شاندار عبادت خانوں کو دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ بنو امیہ کے دور میں ایسا مظاہرہ قابل برداشت تھا جب خلیفہ اسلامی یروشلم میں خصوصاً اور فلسطین میں مجموعی طور پر خوب دولت برسا رہے تھے۔ لیکن اب یروشلم کے مسلمان اقتصادی طور پر کمزور اور خلافت کی بے نیازی کے شکار تھے۔ ''حیات نو'' کا بڑا گنبد ان کے لئے نا قابل برداشت تھا۔ اسلام فلسطین میں ایک توانا مذہب کی حیثیت سے داخل ہوا تھا لیکن مسلمانوں کی مذہبی عمارتیں جو معراج اور روحانی برتری کی علامات تھیں، خستگی کے سبب اب مخدوش شناخت بن کر ایک عدم تحفظ کو جنم دے رہی تھیں۔ عیسائیوں نے بھی شہر میں اپنی طاقت اور حیثیت کے جارحانہ اظہار کے لئے گنبد کا حجم دانستہ بڑا رکھا تھا۔ اسلام نے انہیں مفتوح بنا لیا تھا لیکن وہ زیادہ دیر تک کمتر رعایا بن کر رہنے پر تیار نہیں تھے۔

بالآخر مصالحت ہو گئی۔ اسقف اعظم نے ایک راستہ نکال لیا اور پھر مسلمانوں کو خاموش ہونا پڑا۔ مسلمانوں کو کہا گیا کہ وہ ثابت کریں کہ پرانا گنبد نئے گنبد سے چھوٹا تھا۔ یہ چال دراصل ایک مسلمان نے ہی اسقف اعظم کو بتائی جس کے خاندان کو اگلے پچاس سال تک ممنون اسقف اعظم سے باقاعدہ وظیفہ ملتا رہا۔ خلیفہ المامون نے مسلمانوں کی دلجوئی کے لئے حرم میں نئی تعمیرات کا حکم دے دیا۔ چبوترے کے مشرقی اور مغربی دروازے بنائے گئے اور قبتہ الصخرہ کو پوری طرح نئی

چمک دمک دی گئی۔ المامون نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور داخلہ محراب میں اموی خلیفہ عبدالملک کا کندہ شدہ نام مٹا کر اپنا نام لکھوا دیا۔ لیکن اس اقدام میں ایک حماقت یہ ہوئی کہ تاریخ نہ تبدیل کی گئی۔ 832ء میں خلیفہ نے نئے سکے جاری کئے جن پر لفظ ''القدس'' لکھا تھا۔ القدس یعنی پاک۔۔۔ یروشلم کے لئے مسلمانوں کا نیا نام تھا۔

عیسائی اپنی مذہبی علامتوں کو استعمال کر کے مسلسل مسلمانوں کی خود اعتمادی متزلزل کرتے رہے۔ نویں صدی عیسوی کے اوائل میں پہلی مرتبہ پڑھنے کو ملتا ہے کہ عیسائی ''حیات نو'' کی یادگار میں مقدس روشنی کی سالانہ تقریب منعقد کیا کرتے تھے۔ یہ تقریب ایسٹر کی اتوار سے پہلے شام کو منعقد ہوتی۔ بہت بڑے ہجوم کی صورت میں عیسائی باشندے گول عمارت (روٹونڈا) اور مشہد میں جمع ہوتے۔ دونوں عمارتوں میں مکمل تاریکی رہتی۔ اسی تاریکی میں اسقف اعظم قبر کے پیچھے کھڑے ہو کر شام کی معمول کی عبادت میں خصوصی لحن کے ساتھ کلام مقدس پڑھتا۔ پھر اچانک تیز سفید روشنی کے ساتھ یوں نمودار ہوتا جیسے جنت سے برآمد ہوا ہے۔ عبادت گزاروں کا مجمع جو اعصاب زدہ کرنے والی خاموشی کے ساتھ اس لمحے کا منتظر ہوتا تھا۔۔۔ پُر مسرت اور پُر جوش نعروں کے ساتھ پھٹ پڑتا۔ سب لوگ ہاتھوں میں پکڑی صلیبیں ہوا میں لہراتے۔ پوری قوت کے ساتھ مقدس کلام میں درج نعرے لگاتے اور خوشی سے چیختے۔ اسقف اعظم مشعل لے کر مسلمان گورنر کے قریب آتا، جو ہمیشہ اس تقریب میں موجود ہوتا تھا اور پھر گورنر کے سامنے سے گزر کر ہجوم میں پہنچتا۔ تمام لوگ اپنے ساتھ شمعیں لے کر آتے تھے جو اسقف اعظم کی مقدس مشعل سے روشن کرتے اور پھر ہجوم منتشر ہو جاتا۔ اب یہ لوگ ہاتھوں میں جلتی ہوئی شمعیں لے کر صلیبی مذہب کے نعرے لگاتے گھروں کو واپس جانے کے لئے گلیوں میں پھیل جاتے۔ یہ موقع ملسمانوں کے لئے انتہائی پریشان کن ہوتا تھا۔ اس تقریب کے بارے میں مسلمان مورخ بھی ہمیں ابتدائی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ہر سال گورنر خلیفہ کو رپورٹ بجھواتا۔ 947ء میں بغداد کے حکام نے یہ تقریب ختم کرنے کی کوشش بھی کی۔ اسقف اعظم کو کہا گیا کہ ''اپنی اس شعبدہ بازی کو ترک کر دو۔ تم نے پورے الشام کو عیسائی مذہب سے لبریز اور ہماری روایات کو تباہ کر دیا ہے۔''(8) مسلمانوں نے کوشش کی کہ اس نام نہاد معجزے کو شعبدہ ثابت کریں۔ چنانچہ ہر ایک اپنا خیال پیش کرتا کہ یہ سب کچھ کس طرح کیا جاتا ہے لیکن کوئی بھی یہ راز نہ جان سکا مسلمان اس موقع پر عیسائیوں کی نعرے بازی کو کراہت سے دیکھتے، جسے سن کر مجیرالدین کے مطابق ہر کوئی خوف سے لرز جاتا۔(9) اسلام کی سنجیدہ عبادت کا کوئی بھی مذہب مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن ان چند ہنگامہ خیز گھڑیوں میں تو یروشلم میں مسلمانوں کی موجودگی محو ہو کر رہ جاتی۔ ہر سال عیسائی اپنے مذہب کی برتری ثابت کرتے ہوئے دکھائی دیتے لیکن مسلمان اس مظاہرے کو ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

عباسی اقتدار کے زوال کا نتیجہ یہ نکلا کہ فلسطین میں مقامی حکام کے لئے صورت حال قابو میں رکھنا بتدریج مشکل ہو گیا۔ 841ء میں یروشلم کے یہودی، عیسائی اور مسلمان باشندوں کو ''کسانوں کی بغاوت'' کے دوران ایک دفعہ خوف و

ہراس میں شہر سے بھاگنا پڑا تھا۔اس بغاوت کی قیادت تمیم ابوحرب کر رہا تھا۔اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اموی خلافت بحال کرنا چاہتا ہے۔ابوحرب اوراس کے ساتھیوں نے شہر کوخوب لوٹا اور مسجدوں اور گرجوں پر حملے کئے۔''حیات نو'' کی عمارت اس لئے بچ گئی کہ اسقف اعظم نے حملہ آوروں کوایک بڑی رقم ادا کرنے کی پیش کش کی 868ء میں مقامی ترک کمانڈر،احمد ابن طولون نے مصر میں اقتدار پر قبضہ کر کے شام اور فلسطین کا انتظام بھی سنبھال لیا۔اس نے امن وامان کی صورت حال بہتر بنالی چنانچہ تجارت میں اضافہ ہوگیا۔ابن طوولون کا رویہ ذمیوں کے ساتھ خاص طور پر فراخدلانہ تھا۔اس نے یروشلم میں عیسائی گورنر مقرر کیا اور منہدم یا مرمت طلب گرجوں کی تعمیر نو کی۔اس نے ایک نئے یہودی فرقے کو یروشلم میں ابھرنے کی اجازت دے دی۔

یہودی دانیال القموسی 880ء میں اپنے چھوٹے سے گروہ کے ساتھ خراسان سے یروشلم میں منتقل ہوگیا۔یہ لوگ قیریطیوں کے خفیہ مسلک پر کاربند اور تالمود کو مسترد کر کے اپنی زندگیاں خالصتاً توریت کے مطابق گزارتے تھے۔یروشلم میں آنے کے بعد دانیال نے قیریطیت کوایک نئی مسیحی جہت دینا شروع کر دی۔فلسطین میں اس کے ہاتھ قمران فرقے سے تعلق رکھنے والی ایسی دستاویز آئیں جنہیں حال ہی میں کسی بدو کے کتے نے زمین سے کھود نکالا تھا۔نویں صدی سے تعلق رکھنے والے ان صحائفِ بحرمردار نے دانیال کو یقین دلا دیا کہ یہودیوں کی جلاوطنی اب جلد ہی ختم ہونے والی ہے۔اگر یہودی بیرون وطن پُرآسائش گھروں کو چھوڑ کر یروشلم میں آکر بڑی تعداد میں رہائش رکھ لیں تو مسیحا کی آمد کا وقت تیزی سے قریب آجائے گا۔اگر دنیا بھر سے مسلمان اور عیسائی یروشلم میں آسکتے ہیں تو یہودی ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔بیرونی ممالک میں ہر یہودی برادری کو کم ازکم پانچ خاندان یروشلم میں آباد ہونے کے لئے بھیجنے چاہیئں تاکہ شہر مقدس میں یہودیوں کی آبادی کا حجم بڑھ سکے۔دانیال کے شاگرد سہل ابن مصلیاہ نے اپنی تحریروں میں یروشلم کی ایک الم انگیز تصویر کھینچی جس میں شہر اپنے حقیقی بیٹوں کی آمد کا منتظر دکھایا گیا تھا۔اس نے یہودیوں کے پرانے تصور کونظر انداز کر دیا کہ شہر کوخدا خود چھوڑ چکا ہے۔ اس نے اپنی تحریروں اور بیرون ملک یہودی برادری کوخطوط میں لکھا:

> ''مقدس شہر میں اکٹھے ہوجاؤ اور اپنے بھائیوں کی طاقت میں اضافہ کرو۔کیونکہ اس وقت تمہی ایک ایسی قوم ہو جو جنت میں نہیں،اس دنیا میں اپنے باپ کی تمنائی ہے۔''(10)

دانیال اور سہل کا پراپیگنڈہ نتیجہ خیز ثابت ہوا۔قیریط برادری کے لوگ یروشلم میں آنے لگے۔ابن طولون نے انہیں شہر کی دیواروں کے باہر اپنے گھر بنانے کی اجازت دے دی۔یہ لوگ اوفیل کی

مشرقی ڈھلوانوں میں آباد ہو گئے۔ چونکہ قیریطی خورد ونوش اور طہارت کے بارے میں تالمود کے قوانین کے پابندی نہیں کرتے تھے چنانچہ یہ ربانویوں کے ساتھ نہیں رہ سکتے تھے۔ ربانوی ایسے یہودی تھے جو ربیوں کی حاکمیت کو تسلیم کرتے تھے۔ یروشلم میں اسی فرقے کی اکثریت تھی۔ قریطی راہبانہ طرز حیات کے قائل تھے جو یہودیت کے لئے اجنبی بات تھی۔ یہ لوگ ٹاٹ کے کپڑے پہنتے اور گوشت کھانے سے گریز کرتے۔ انہوں نے کوہ زیتون پر اپنے لئے پنیر بنانے کا ایک کارخانہ بھی بنا یا۔ عام یہودی ہر سال ایو کی نو تاریخ کو ہیکل سلیمانی کے کھنڈر پر جا کر گریہ زاری اور نوحہ خوانی کیا کرتے تھے لیکن قیریطیوں نے اس عمل کو اپنی روزمرہ زندگی میں داخل کر لیا تھا۔ وہ منظّم طریقے سے مختلف اوقات میں گروہ بن کر شہر کے دروازوں پر جاتے اور وہاں شہر کی کسمپرسی پر نوحہ کناں ہوتے۔ ان کی یہ نوحہ خوانی عبرانی، عربی اور فارسی زبانوں میں ہوتی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ صیہون کے ماتم گساروں کی یہ عبادت خدا کو مجبور کر دے گی کہ مسیحا کو بھیجے اور یروشلم کو صرف اور صرف یہودی شہر کی حیثیت دے کر تعمیر نو ممکن بنائے۔ ربانوی یہودی قیریطیوں کی رسموں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ بتدریج وہ قیریطیوں سے الجھنے لگے اور پھر وقفے وقفے سے المناک واقعات رونما ہوئے۔ عام یہودی قیریطیوں کو ان کی ''انتظار مسیح'' کی رسموں سے روکنا چاہتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ نجات کا کام خدا خود مناسب وقت پر کرے گا اور قریطی جو کچھ کر رہے ہیں وہ توہین اور گستاخی کے زمرے میں آتا ہے۔ کچھ ربی انتہا پسندی میں اتنا آگے بڑھے کہ انہوں نے آمد مسیح کی امید میں قریطیوں کو یروشلم میں ''ایلیا'' (مراجعت) سے روک دیا۔

ابن طولون کا اقتدار 904ء میں ختم ہو گیا۔ عباسیوں نے ایک بار پھر فلسطین کا انتظام سنبھال لیا۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک اسے برقرار نہ رکھ سکے۔ 935ء میں وسطی ایشیا کے ایک ترک محمد ابن طوغ نے مصر، شام اور فلسطین پر قبضہ کر لیا اور بغداد کے خلیفہ کے نام پر اپنی مطلق العنانی قائم کر لی۔ اس نے اور اس کے جانشینوں نے انشید کا لقب اپنا لیا۔ خلافت کے دوسرے حصوں میں بھی کئی خاندان اقتدار کے حصول کے لئے ابھر آئے۔ فلسطین کا علاقہ ان متحارب گروہوں کی حصول اقتدار کے لئے جنگ کا اکھاڑہ بن گیا۔ صورت حال کو مزید ابتر بنانے کے لئے بازنطینی سلطنت کے یونانی شہنشاہوں نے موقع غنیمت سمجھا اور اسلامی سلطنت میں خلفشار پیدا کرنے کے لئے اسلام کے خلاف ''مقدس جنگ'' کا اعلان کر دیا۔ دسویں صدی عیسوی میں بازنطینیوں نے صلیقیہ کا کچھ علاقہ مسلمانوں سے واپس لے لیا۔ پھر قبرص اور تارسس پر قبضہ کر لیا۔ اب وہ یروشلم کا حصول چاہتے تھے جو ان کی مذہبی جنگ کا اصل مقصد تھا۔

بازنطینیوں کی ان کامیابیوں کا ناگزیر نتیجہ یروشلم میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تعلقات کا مزید بگاڑ تھا۔ مسلمان عام طور پر القدس میں عیسائیوں کی اکثریت کو تسلیم کرتے تھے۔ ''مقدس روشنی'' جیسی تقریبات کے موقع پر عموماً بدمذگی پیدا ہو جاتی تھی اور پھر اس کے نتیجہ میں کچھ عرصہ تناؤ بھی رہتا تھا لیکن مسلمان ذہنی طور پر یہ بات قبول کرتے تھے کہ القدس عیسائیوں کا شہر ہے اور یہاں ان کی اکثریت اپنی موجودگی کا اظہار بھی کرتی رہے گی۔ بازنطینیوں کے ساتھ جنگ

کے عروج کے دنوں میں ''انشید'' نے بازنطینی عیسائی شہنشاہ کو لکھا کہ یروشلم دونوں مذاہب کے لئے مقدس و متبرک ہے۔

''مقدس سرزمین میں مسجد الاقصیٰ بھی ہے اور مسیحی کلیسا بھی۔ یہاں
یہودی اور عیسائی زائرین آتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں یسوع مسیح اور
ان کی والدہ پیدا ہوئے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں پر دونوں کے مزار ہیں۔''(11)

مسلمان، عیسائیوں کی تقریبات میں سیکولر انداز میں شرکت کرتے تھے۔ اینکینیا میں وہ انگور کی خوشہ چینی کا تہوار مناتے۔ سینٹ جارج کا میلہ نئے بیج بونے کے موقع پر منعقد کیا جاتا۔ برسات کا موسم شروع ہونے پر سینٹ باربرا کا میلہ منعقد ہوتا۔ مسلمان یہ حقیقت تسلیم کرتے تھے کہ عیسائیوں کو یہاں مستقل رہنا ہے چنانچہ وہ ان کے ساتھ سماجی میل جول سے گریزاں نہ رہتے۔ لیکن جب بازنطینیوں نے انکے خلاف مقدس جنگ شروع کی اور یروشلم کو آزاد کرانے کی باتیں ہونے لگیں تو تناؤ ناقابل برداشت ہو گیا۔ 938ء میں عیسائیوں کے پام سنڈے کے جلوس پر حملہ کر دیا گیا۔ مسلمانوں نے مسیحی شہر کے دروازوں کو آگ لگا دی۔ حیات نو اور گلگتا کے چرچ بری طرح متاثر ہوئے۔ 966ء میں بازنطینیوں کی فتوحات کے نئے سیلاب کے دوران اسقف اعظم جان چہارم نے شہنشاہ پر زور دیا کہ یروشلم کی بازیابی کے لئے فوری حملہ کیا جائے۔ یہ خبر سنتے ہی مسلمانوں اور یہودیوں نے ''حیات نو'' کی یادگار پر فوراً حملہ کر دیا۔ مشہد کی چھت کو نذر آتش کرنے کے بعد کوہ زیہون کا باسلیق لوٹ لیا گیا۔ اسقف اعظم تیل کے حوض کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ اسے گھسیٹ کر باہر نکالا اور پھر شعلوں میں جھونک دیا گیا۔

انشید نے یہ بلوے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جب اسقف اعظم نے یروشلم پر حملہ کے لئے شہنشاہ کو غیر دانشمندانہ مشورہ دیا تو مصر سے فوراً کچھ دستے اسقف اعظم کی حفاظت کے لئے روانہ کر دیئے گئے۔ انشید نے بعد میں مذہبی عمارتوں کو پہنچنے والے نقصان پر شہنشاہ سے معزرت کی اور مرمت کے اخراجات خود ادا کرنے کی پیش کش کی لیکن شہنشاہ نے حقارت کے ساتھ یہ پیش کش ٹھکرا دی۔ ''میں مقدس شہر کی تعمیر نو خود کروں گا اور یہ سب کچھ تلوار کے زور پر ہوگا۔'' اب ایک شیطانی چکر چل رہا تھا۔ بازنطینیوں کی فتوحات کے ردعمل میں یروشلم میں عیسائیوں پر حملے ہوتے۔ عیسائیوں کی ابتلا کے جواب میں ''مقدس جنگ'' کے شعلے مزید بھڑک اٹھتے۔(12) القدس کی حفاظت کے لئے مسلمانوں کے دفاعی اقدامات فطری تھے۔ انہیں علم تھا کہ یروشلم پر بازنطینی قبضے کے بعد عیسائی ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں کریں گے جو خلیفہ عمرؓ نے کیا تھا۔ مسلمانوں نے پہلی مرتبہ حرم سے باہر دیکھنا شروع کیا۔ مغربی پہاڑی پر ''حیات نو'' کی یادگار کے پاس ایک مسجد تعمیر کی گئی اور اسے خلیفہ عمرؓ سے موسوم کیا گیا۔ مسیحی یروشلم میں یہ پہلی اسلامی عمارت تھی۔ عیسائیوں کے مقدس ترین مقام کے نزدیک مسجد

کی اشتعال انگیز موجودگی، مسلمانوں کی طرف سے یہ باور کرانے کا اقدام تھا کہ شہر کے حاکم ہم ہیں۔ غالباً یہ حضرت عمرؓ کا حیات نو یادگار کے لئے رویا یاد دلانے کی بھی ایک کوشش تھی۔

انشیدیوں کو فلسطین سے نکال دیا گیا۔ پہلا دھکا انہیں قرامطی شیعوں نے دیا جب کہ تیونس کے فاطمی شیعوں نے انہیں پورے علاقے سے خارج کر دیا۔ فاطمیوں نے مئی 970ء میں رملہ فتح کیا۔ اگلے تیرہ برس تک فلسطین کے دیہی علاقے فاطمیوں، فرامطیوں، بدویوں اور عباسی دستوں کے درمیان علاقے پر قبضہ کے لئے جھڑپوں کے نتیجہ میں برباد ہو کر رہ گئے۔ انجام کار فاطمی 983ء میں شیعی خلافت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے اپنا دارالحکومت کیروان سے قاہرہ کو منتقل کر لیا۔ ایک ''تکلیف دہ امن'' ملک میں قائم ہو گیا۔ عرب قبائل وقفہ وقفہ سے بغاوت کا علم سر بلند کر دیتے۔ لیکن یہودی دور پردہ فاطمیوں کے مددگار رہے۔ خلیفہ نے بازنطینیوں کے ساتھ ایک عارضی جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کئے۔ حیات نو اور شہر کی عمارتوں کی تعمیر نو کے اقدامات کئے گئے۔ حیات نو میں مشہد کی عمارت 966ء سے چھت کے بغیر تھی۔ اس جنگ بندی نے یروشلم کے عیسائیوں کو عجیب و غریب صورت حال سے دوچار کر دیا۔ شہر کا تناؤ بظاہر ختم ہو گیا۔

اضطراب کی زیر زمین لہریں ابھی موجود تھیں۔ مقامی مورخ مقدسی نے جب 985ء میں شہر کا احوال لکھا تو وہ یروشلم کو ذمیوں کا شہر کہتا ہے جہاں ہر جگہ عیسائیوں اور یہودیوں کی بالادستی تھی۔ (13) عیسائی مراعات یافتہ طبقہ تھے۔ وہ یہودیوں سے زیادہ متمول اور مسلمانوں سے زیادہ تعلیم یافتہ تھے۔ مقدسی اپنے شہر کا ذکر ناز و افتخار کے ساتھ کرتا ہے۔ ''یہاں موجود قبۃ الصخرہ کا دنیا بھر میں، عالم اسلام کے سوا، کوئی ثانی نہیں، آب و ہوا نہایت معتدل ہے۔ بازار صاف ستھرے اور دکانیں ترتیب سے ہیں۔ انگور کا پھل وافر ہوتا ہے۔ باشندے نیکیوں کے مجسمے ہیں۔ کوئی جوا خانہ قحبہ خانہ اور شراب خانہ نہیں ہے۔ کوئی آدمی شراب نوشی نہیں کرتا۔ لیکن مقدسی شہر کی جو تصویر دکھاتا ہے وہ پوری طرح چمکدار نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ عوامی حمام گندے، اشیائے خورد و نوش مہنگی، محصول بھاری اور عیسائی متکبر ہیں۔ وہ یروشلم میں علمی انحطاط پر بھی تشویش کا اظہار کرتا ہے۔ اسلامی فقہ شافی کے بانی مقدس مقامات کی زیارت کی غرض سے کئی بار یروشلم آ چکے تھے لیکن اب فاطمی شیعوں کے اقتدار میں آنے کے بعد سنی زائرین کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی۔ فاطمیوں نے شیعی نظریات کے فروغ کے لئے یہاں مطالعاتی مرکز، دارالعلم قائم کیا۔ شیعی حکمران پوری اسلامی دنیا کو فتح کر کے سنی نظریات کی بیخ کنی کے خواب دیکھتے تھے۔ مقدسی شیعی انتظامیہ کی شکایت کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شہر کے ہر دروازے پر نگہبان کھڑے ہیں اور تجارت پر پابندیاں ہیں۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ علمی بحث مباحثہ کی اجازت نہیں۔ شہر میں گنتی کے چند علما ہیں۔ فقیہہ تو ادھر کا رخ بھی نہیں کرتے۔ عالم فاضل افراد کا کوئی احترام نہیں۔ مدرسوں میں اس لئے حاضری نہیں ہوتی کہ وہاں پڑھانے والا ہی کوئی نہیں (14) لیکن علم و فضل کی ایسی کوئی کمی بھی نہ تھی۔ شہر میں قرآن پڑھنے والوں کے اپنے حلقے تھے۔ فقہ حنفیہ کا ایک تدریسی

گروہ مسجد اقصیٰ میں موجود تھا۔صوفیا ایک دوسرے سے خانقاہوں میں ملتے تھے۔لیکن یہ تمام علم قدامت پسند اور مدافعانہ تھا ۔ یہ لوگ قرآن کی تفسیر علم کی بجائے عقائد کی زبان میں کرتے تھے۔مقدسی کے مطابق یہ دراصل شیعوں کی عجیب وغریب روایات کا ردعمل تھا۔(15) مقدسی نے عالم اسلام کے دور دراز شہروں کا سفر کیا تھا چنانچہ وہ اپنے شہر میں ''آسان تبادلہ خیال'' کی کمی محسوس کرتا ہے جو عالم اسلام کے دوسرے حصوں میں ایک معمول تھا۔

اکتوبر 996ء میں فاطمی خلیفہ العزیز کا قاہرہ میں انتقال ہوگیا۔اس کا جانشین اس کا بیٹا الحاکم بنا۔وہ ایک پرہیز گار اور راسخ العقیدہ شخص تھا۔شیعی نظریات اور سماجی انصاف اس کی کمزوری تھے۔ان تمام صفات کے باوجود اس کے کردار کا منفی پہلو یہ تھا کہ وہ مذہبی جنونی تھا اور غیض وغضب میں سفا کی پر اتر آتا تھا۔اس کی ماں اسلام قبول کرنے سے پہلے عیسائی تھی۔ چنانچہ خلیفہ کی بہت سی ذہنی الجھنوں کا سرچشمہ اس کی منقسم شناخت تھی۔ پہلے تو اس کی ہمدردیاں یروشلم کے عیسائیوں کے ساتھ تھیں اس نے اپنے ماموں اوریسٹس کو یروشلم کا اسقف اعظم مقرر کیا اور وہاں عیسائی برادری سے ذاتی تعلق کا مظاہرہ کیا۔ 1001ء میں اس نے بزنطینی شہنشاہ باسل دوم سے جنگ بندی کا ایک اور معاہدہ کیا۔ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب اسلام اور عیسائیت دوستی اور امن کے ایک نئے دور میں داخل ہونے والے ہیں۔لیکن پھر صورت حال تبدیل ہوگئی۔

1003ء میں خلیفہ الحاکم نے فسطاط میں سینٹ مارکس کا چرچ منہدم کرنے کا حکم دے دیا۔اس کا موقف تھا کہ یہ چرچ اجازت کے بغیر بنایا گیا ہے۔اور اسلامی قانون کی نفرت انگیز خلاف ورزی ہوئی ہے۔خلیفہ نے چرچ کی جگہ مسجد الراشدہ تعمیر کی اور اسے اتنی وسعت دی کہ قرب وجوار کے یہودی اور عیسائی قبرستان شامل کر لئے گئے۔کچھ اور فرامین کے مطابق مصر میں عیسائی املاک ضبط کر لی گئیں۔فلسطین میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی کی خبروں پر بھی خلیفہ برہم تھا۔فلسطین میں بدویوں کے حملوں کے بارے میں بھی اس کا خیال تھا کہ ان کے پیچھے عیسائیوں اور بازنطینیوں کا ہاتھ ہے۔خلیفہ کو خدشہ تھا کہ یہ حملے مکمل بغاوت کی شکل نہ اختیار کر لیں۔اور پھر پیمانہ لبریز ہوگیا۔ایک ایسٹر کے موقع پر خلیفہ کے علم میں لایا گیا کہ قبطی عیسائیوں کا ایک بہت بڑا گروہ یروشلم روانہ ہو رہا ہے۔اس کا انداز انتہائی اشتعال انگیز ہے۔وہ مکہ جانے والے حاجیوں کی طرح پر جوش ہیں۔خلیفہ نے ایک شیعہ عالم الدودی سے صورت حال دریافت کی۔اسے دیگر باتوں کے علاوہ گرجا حیات نو کی بے پناہ دولت کے بارے میں بھی بتایا گیا۔ایسٹر کے موقعہ پر عیسائی منصب داروں کی ایک بہت بڑی تعداد وہاں عبادت کے لئے جاتی تھی۔ یہاں تک کہ بازنطینی شہنشاہ کے بارے میں بھی کہا جاتا تھا کہ وہ ایک دفعہ بھیس بدل کر یروشلم میں آیا اور ایسٹر کی عبادت میں شامل ہوا۔زائرین وہاں بھاری مقدار میں چاندی، قیمتی پوشاکیں، رنگدار کپڑا اور مشجر پردوں والا کپڑا) لے کر آتے ہیں۔ایک عرصہ سے وہاں قیمتی ظروف اور اشیاء کا انبار بھی لگ چکا ہے۔(16) عیسائیوں کے لئے تمام تر حسد، بیرون ملک طاقتور رابطے، اسلام کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت سے عیسائیت کا

خوف۔۔۔ یہاں سب ایک جگہ جمع دیکھے جا سکتے تھے۔ الدودی نے آخری ضرب خلیفہ کو یہ بتا کر لگائی کہ ایسٹر کے موقع پر یروشلم میں ''مقدس روشنی'' کا شعبدہ دکھایا جاتا ہے۔ مسلمان اس سے بہت متاثر ہوتے ہیں چنانچہ ان کے دلوں میں اپنے مذہب کے لئے شکوک وشبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔(17)

ان ''معلومات'' نے یقیناً پہلے سے الجھے ہوئے خلیفہ کے ذہن میں طوفان کھڑا کر دیا ہوگا۔ ستمبر 1009ء میں خلیفہ نے حکم دے دیا کہ گرجا حیات نو اور مشہد (یادگار قسطنطین) کو زمین بوس کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ ان کی بنیادیں بھی اکھیڑ دی جائیں۔ رملہ کے فاطمی گورنر یاروک نے پوری دلجمعی سے احکامات پر عمل درآمد کیا۔ گلگتا کے مقام پر تمام عمارتیں مسمار کر دی گئیں۔ البتہ گول عمارت (روٹونڈا) کے کچھ حصے باقی بچ رہے۔ عیسائی مورخ یحییٰ ابن سعید کے مطابق انہیں منہدم کرنا بہت مشکل تھا۔(18) یہ حصے بہت سخت جان ثابت ہوئے اور اب موجودہ عمارت میں شامل ہیں۔ چٹانی قبر، مزار کی عمارت اور گلگتا کی چٹان کو ہتھوڑوں اور کدالوں سے پاش پاش کر کے زمین ہموار کر دی گئی۔ ابن سعید کا کہنا ہے کہ قبر کی یادگار کے کچھ حصے ملبے کے نیچے چھپے رہ گئے۔ تمام پتھر اور ملبہ اٹھا کر شہر سے باہر پھینک دیا گیا۔ ایسے اقدام کی توقع کسی مسلمان حکمران سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ خلیفہ کی رعایا بھی مضطرب ہو گئی۔ خلیفہ نے اگلے قدم میں ایسے احکامات جاری کئے جن کے تحت ذمیوں اور مسلمانوں کی الگ شناخت کو ضروری قرار دیا گیا۔ اور پھر انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ عیسائیوں کیلئے ضروری تھا کہ وہ اپنے گلے میں بھاری صلیب لٹکائیں جب کہ یہودیوں کے لئے گلے میں لکڑی کا ایک بڑا ٹکڑا آویزاں کرنے کی پابندی تھی۔ 1011ء میں فسطاط کے یہودی ایک جنازہ لے کر جا رہے تھے کہ ان پر پتھراؤ کیا گیا۔ یروشلم میں یہودیوں کے کنشت (صلوا ۃ) کی بے حرمتی کی گئی اور اس کے صحیفوں کو جلا دیا گیا۔ بہت سے ذمیوں کو اسلام قبول کرنے کے لئے دہشت زدہ کیا گیا۔ کچھ لوگ تو ثابت قدم رہے۔ لیکن زیادہ تر لوگ فرار ہو کر سرحد پار کر کے بازنطین کی سلطنت میں چلے گئے۔

خلیفہ کے جنون کا اگلا نشانہ مسلمان تھے۔ 1016ء میں الحاکم نے اعلان کیا کہ وہ الوہیت کی تجسیم ہے اور نسل انسانی کے لئے ایک نئی راہ ہدایت دے کر بھیجا گیا ہے۔ اس نے جمعہ کی نماز میں خدا کی جگہ اپنا نام پڑھوانے کا حکم دے دیا۔ ظاہر ہے یہ دعوی مسلمانوں کے لئے ناقابل قبول ہی نہیں قابل نفرت بھی تھا۔ قاہرہ میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔ توہین الٰہی پر مسلمانوں کا ردعمل عیسائیوں سے زیادہ شدید تھا چنانچہ الحاکم کے غضب کا نشانہ بھی وہی بنے۔ 1017ء میں عیسائیوں اور یہودیوں کے خلاف جاری کئے گئے فرامین منسوخ کر دیئے گئے اور ان کی املاک انہیں واپس دے دی گئیں۔ اب مسلمانوں کے خلاف کارروائی کا آغاز ہوا۔ انہیں رمضان کے روزے رکھنے سے روک دیا گیا۔ اسی طرح انہیں حج پر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ جو لوگ حکم عدولی کرتے انہیں خوفناک اذیتیں دی جاتیں۔ خلیفہ ان ہنگامہ خیز واقعات کے دوران دبے پاؤں گھومتا پھرتا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ قاہرہ کی گلیوں میں خاموشی سے گھومتا رہتا تھا لیکن کبھی کسی مشتعل ہجوم کی نظر میں نہ آیا۔

1021ء میں ایک رات وہ گھوڑے پر سوار ہو کر قاہرہ سے نکلا اور صحرا میں داخل ہو گیا پھر کبھی کسی نے اسے نہ دیکھا۔

جنونی خلیفہ مسیحی یروشلم کو کھنڈر بنا گیا۔ گلگتا چٹان اور مزار اقدس کی باقیات پر نئی عمارت کی تعمیر ضروری تھی۔ الحاکم کی بہن شط الملک نے 1023ء میں یروشلم کے اسقف اعظم عیسی فورس کو صورت حال کی رپورٹ دینے کے لئے قسطنطنیہ بھجوایا۔ لیکن اگلے برس یراہ کے بدوی قبیلے نے فاطمیوں کے خلاف بغاوت کر دی اور فلسطین کی شاہراہوں پر قبضہ کر لیا۔ ایک ایک کر کے متدد دیہات بھی ان کی بربریت کی نذر ہو گئے۔ یروشلم میں حالات اتنے خراب تھے کہ کسی عمارت کی تعمیر کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ یہودیوں کی حالت تو بالخصوص ناگفتہ بہ تھی۔ دسویں صدی عیسوی کے دوران یہودی برادری کی تعداد میں تھوڑا سا اضافہ ہو گیا تھا۔ نئے آنے والوں کا تعلق بغداد اور افریقہ سے تھا جو 940ء کے عشرہ میں بغداد اور شمالی افریقہ میں پیدا ہونے والی افراتفری سے بچنے کے لئے فلسطین کو بھاگ آئے تھے۔ زیادہ تر مہاجرین نے رملہ یا طبریس میں رہنا پسند کیا۔ ان مہاجرین میں سے ایک نے تحریر کیا کہ:

> ''یروشلم کا شہر بہر حال لعین اور قابل نفرت ہے۔ اس میں اشیائے صرف باہر سے آتی ہیں۔ اس کے اپنے وسائل زندگی نہایت محدود ہیں۔ بہت سے متمول لوگ وہاں آئے لیکن غربت اور بے بسی کے شکار ہو گئے۔''(19)

عیسائیوں کے پاس اعلیٰ اور معزز منصب تھے۔ یہودی مزدور رنگ ساز اور دباغ (چمڑا کمانے والے) تھے۔(20) معاشی بدحالی کی وجہ سے انہیں کام بھی کم ملتا تھا۔ ان حالات کے باوجود یہودیوں نے اپنی مجلس منتظمین دسویں صدی عیسوی میں طبریس سے یروشلم میں منتقل کر دی تا کہ یروشلم کو ایک بار پھر فلسطین کے یہودیوں کا انتظامی شہر بنا دیا جائے۔ الحاکم کے استبداد کے باوجود یہودی، فاطمیوں کے پر جوش حامی رہے تھے۔ 1024ء میں بدوی بغاوت کے دوران فاطمی حکومت کے وفادار رہنے کے ''صلہ'' میں ان پر بھاری ٹیکس عائد کر دیئے گئے۔ بہت سے یہودیوں کو جیل جانا پڑا کیونکہ وہ اپنے واجبات ادا نہیں کر سکے تھے۔ قحط اور قلاشی نے بہت سے یہودیوں کو زندگی سے نجات دے دی۔ باقی بچ رہنے والے کنگال، بدحال، اداس اور مایوس لوگ تھے۔ مجلس منتظمین کے سربراہ (گاؤں) سولومن ھا۔ کوھن نے لکھا۔ ''کسی آدمی کے پاس گھر میں کچھ نہ بچا۔ نہ اپنے پہننے کے لئے کوئی لباس اور نہ گھر کی کوئی چھوٹی موٹی چیز۔۔۔''(21) وہ مسلسل عذاب میں رہے۔ ابھی پہلے بدویوں کا عذاب ختم نہیں ہوا تھا کہ شمال سے فلسطین پر بدویوں کے ایک اور لشکر نے حملہ کر دیا۔ فاطمی خلیفہ فظاہر نے بازنطینی سلطنت سے ایک نیا معاہدہ کیا۔ شہنشاہ سے وعدہ کیا گیا کہ عیسائیوں کو ''حیات نو'' (انا

ستاسیس) کی تعمیر نو کی اجازت دے دی جائے گی۔ 1030ء پہلا پُر امن سال تھا جو فلسطین نے کم از کم ایک سو سال کے بعد دیکھا۔ ترک گورنر الزبیری نے ملک میں زندگی معمول پہ لانے کے اقدامات شروع کر دیئے۔

مسلمانوں کی اپنی عمارتوں کی مرمت اور تعمیر نو کا کام یروشلم میں ان کا منتظر تھا۔ 1017ء میں قبتہہ الصخرہ منہدم ہو گئی تھی۔ اس کی تعمیر نو کے لئے رقم اکٹھی کرنے کی مہم کے ایک حصہ کے طور پر ہی غالباً مسلمان عالم الواسطی نے رسالہ ''فضائل القدس'' لکھا۔ یروشلم کے بارے میں پیغمبر اسلام ﷺ کی احادیث، خلفا کے توصیفی کلمات اور بزرگان دین کے اقوال اس رسالہ کی پہلی جلد میں پڑھے جا سکتے تھے۔ دوسری جلدوں میں یہودی اور عیسائی اکابرین کے اقوال تھے۔ شہر مقدس میں زبردست کشیدگی تھی اور الحاکم کی اذیت رسانی نے تینوں مذاہب کے لوگوں کو مدافعت پر مجبور کر رکھا تھا۔ لیکن واسطی کا رسالہ یک جہتی کے پرانے نصب العین کا نمائندہ تھا۔ اس میں بہت سے حوالے ''اسرائیلیات'' سے تھے۔ کچھ واقعات یروشلم میں حجرت عیسیٰ کی موجودگی کی یاد دلاتے تھے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح وثوق کے ساتھ یروشلم کی تقدیس کو مکہ اور مدینہ کی تقدیس کا حصہ بنایا گیا۔ مثلاً الواسطی ایک حدیث بیان کرتا ہے:

> ''مکہ ایسا شہر ہے جسے اللہ نے سرفراز کیا اور فضیلت دی، اسے تخلیق کیا اور فرشتے ایک ہزار سال تک اس کے گرد جمع رہے۔ یہاں تک کہ زمین کی کوئی اور چیز نہ پیدا کی گئی۔ پھر اس نے اسے مدینہ سے متصل کیا گیا اور مدینہ کو یروشلم سے متصل کیا گیا اور پھر ایک ہزار سال بعد اس نے ایک ہی اقدام میں باقی دنیا کو تخلیق کیا۔''(27)

یوم حساب کو یروشلم میں جنت کسی دلہن کی طرح آراستہ کی جائے گی۔ خانہ کعبہ اور حجر اسود مکہ سے القدس میں لائے جائیں گے جو بنی نوع انسان کی آخری منزل ہے۔(23) (مقامی روایات میں مکہ اور یروشلم کو پہلے سے مساوی طور پر باہم متصل کیا جا چکا ہے۔ مکہ میں حج کے دنوں میں ایک رات عرفات کے میدان میں حجاج شب بیداری میں تھے تو کہا گیا کہ کعبہ کے نزدیک مقدس چاہ زم زم کا پانی زیر زمین چلتا ہوا سلعوم کے تالاب میں آتا ہے۔ اس رات یروشلم کے مسلمان شہر میں ایک خصوصی تقریب منعقد کر رہے تھے۔ یہ داستان دراصل اسی عقیدے کا اظہار ہے کہ یروشلم کی تقدیس مکہ سے اخذ کی گئی ہے۔ ایک ایسا عمل جو وقت کے اختتام پر دیکھنے میں آئے گا جب مکہ کی تقدیس ہمیشہ کے لئے القدس کو منتقل کر دی جائے گی۔ جب حتمی اتحاد اور وحدت جنم لیں گے اور زمین پر جنت اتر آئے گی۔

مقامی لوگ یقیناً محسوس کرتے تھے کہ مکہ اور یروشلم ایک ہی تقدیس کے حصہ دار ہیں۔ غالباً گیارھویں صدی کے

شروع میں جب فلسطین کے لوگ مکہ کو حج کے لیے نہیں جا سکتے تھے تو حج کے دنوں میں یروشلم میں اکٹھے ہو جاتے تھے۔ جس رات حجاج میدان عرفات میں شب بیداری کے لئے کھڑے ہوتے مکہ سے بہت دور فلسطین اور یروشلم کے لوگ القدس کے حرم اور مسجد الاقصیٰ میں اکٹھے ہو جاتے اور مکہ کی طرف منہ کر کے ساری رات شب بیداری میں کھڑے رہتے وہ اس طرح اونچی آواز میں عبادت کرتے جیسے میدان عرفات میں ہوں۔ عیدالاضحیٰ ۔۔۔ حج کے آخری دن یروشلم میں جمع مسلمان حرم میں اسی طرح قربانیاں پیش کرتے جس طرح حجاج مکہ میں کرتے ہیں۔ اس طرح وہ القدس میں رہ کر خود کو مکہ میں موجود سمجھتے تھے۔ کچھ حجاج اپنے حج کے فریضہ میں یروشلم کے مقدس سفر (زیارت) کو بھی شامل کرنا پسند کرتے تھے۔ وہ حج کے خصوصی سفید لباس احرام میں زیارتیں کرتے۔ کئی مسلمان اس اختراع کو قابل اعتراض سمجھتے تھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ سے روایات منسوب ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کو حج کے دنوں میں یروشلم جانے سے منع کیا تھا۔ لیکن یروشلم کی حرمت وفضیلت میں حدیثوں کے حوالے دے کر ان اعتراضات کا جواب دیا جاتا۔ مثلاً ایک مشہور حدیث کا ذکر کیا جاتا؛

''تمہیں صرف تین مساجد کا عزم کرنا چاہئے ۔۔۔ پہلی مسجد حرام
(مکہ)' دوسری میری مسجد (مسجد نبوی مدینہ) اور تیسری مسجد
الاقصیٰ (القدس)۔''

گورنر الزبیری نے امن وامان حاصل ہونے پر قبتہ الصخرہ کی تعمیر ومرمت کا کام شروع کیا۔ خلیفہ قظاہر ذاتی طور پر حرم میں دلچسپی رکھتا تھا۔ گنبد کو سہارا دینے کے لئے جو لکڑی کے ستون استعمال کئے گئے تھے وہ آج بھی موجود ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے تباہی پھر نازل ہوگئی۔ 5 دسمبر 1033ء کو فلسطین ایک شدید زلزلے سے لرز گیا۔ خوش قسمتی سے یہ سورج غروب ہونے سے پہلے آیا چنانچہ زیادہ تر لوگ گھروں کے اندر نہ تھے۔ کئی روز تک لوگ چار دیواری میں داخل ہونے سے ڈرتے رہے۔ پورے شہر کی آبادی شہر سے باہر پہاڑیوں میں خیمہ باش رہی۔ تعمیرات کے ایک بالکل نئے منصوبے کی ضرورت تھی۔ حرم کے پشتہ کی معاون دیواریں مرمت طلب تھیں۔ قظاہر نے ایک نئی فصیل شہر سے کام کے آغاز کا حکم دیا۔ ایک ایسا کام جو ایک نسل تک جاری رہا۔ مسجد اقصیٰ بھی زلزلے سے شدید متاثر ہوئی تھی۔ اس کی شمالی راہداریاں بالکل تباہ ہوگئی تھیں۔ انکی تعمیر کا کام فوری طور پر شروع ہوا۔ 1047ء میں ایرانی سیاح ناصر خسرو جب یروشلم میں پہنچا تو نئی مسجد مکمل ہو چکی تھی۔ یہ مسجد زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ راہداریوں کی جگہ اب ایک بغلی راستہ بنا دیا گیا جس پر سات محرابیں بنائی گئیں۔ ناصر خسرو مسجد کی تعریف کرتے ہوئے اس کے خوبصورت قالینوں، سنگ مرمر کے فرش، 280 مرمریں ستونوں اور گنبد پر رنگا رنگ نفیس مینا کاری کی تفصیل بتاتا ہے۔

MAP (نقشہ)

حرم الشریف میں آج کل بھی جمعہ کی نماز میں ہزاروں مسلمان شریک ہوتے ہیں۔

گیارھویں صدی کے وسط میں یروشلم ایک بھرپور بحالی کا منظر پیش کرتا ہے۔ ناصر خسرو لکھتا ہے کہ ان دنوں شہر میں 20 ہزار خاندان رہتے تھے۔ مجموعی آبادی ایک لاکھ کے قریب تھی۔ وہ یروشلم کی بلند و بالا عمارتوں اور خوبصورت بازاروں سے بہت متاثر نظر آتا ہے۔ ''ہر صنعت اور دستکاری کا اپنا 'سوق' ہے۔ شہر میں بے شمار عمدہ ہنر مند رہتے ہیں ۔۔۔۔۔ چیزیں وافر اور سستی ہیں۔'' ناصر ایک بہت بڑے شفاخانے کا ذکر بھی کرتا ہے جہاں ادویات کے خواص کی تعلیم اور انہیں بنانے کا طریقہ سکھایا جاتا ہے۔ مسجد سے ملحقہ دو خانقاہوں کا بھی ذکر کرتا ہے جہاں صوفیا رہتے اور عبادت کرتے ہیں۔ حرم کی شمالی دیوار کے ساتھ ایک حجرہ میں صوفیا وعظ کرا کرتے تھے۔ ناصر خسرو حرم کے چبوترے پر انتہائی عقیدت کے سات ایک سے دوسرے مقام پر جاتا ہے اور انبیاء کی جدوجہد اور عبادت کے بارے میں سوچتا ہے۔ وہ تصور کرتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے معراج کی رات قبۃ الصخرہ کے پہلو میں نماز ادا کی تھی۔ انہوں نے چٹان کے اوپر ہاتھ بلند کیا تو وہ ہاتھ چھونے کے لئے بلند ہوگئی، نیچے غار بن گیا۔ ناصر دوسرے پیغمبروں کے بارے میں بھی سوچتا ہے۔ خصوصاً باب مغفرت پر بادشاہ داؤد کا تصور کرتا ہے اور اپنے لئے معافی کا طلب گار ہوتا ہے۔ مہد مسیح کے مقام پر وہ سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ چونکہ عیسائیوں کے مقدس مقامات پر انبیاء کے جسمانی نشانات موجود ہیں۔ چنانچہ ناصر ان مقامات پر حاضری کے دوران نشانات کا گہرا مشاہدہ کرتا ہے۔ مثلاً زچگی کے دوران دردزہ سے مغلوب بی بی مریم نے سنگ مرمر کے جس ستون کو پکڑا تھا اس پر بی بی کے ہاتھوں کے نشانات کو وہ دیکھتا ہے۔ ذرا محتاط انداز میں وہ کہتا ہے کہ چٹان پر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسحاقؑ کے پاؤں کے نشانات دیکھے جا سکتے ہیں۔

ناصر خسرو نے گرجا حیات نو (اناستاسیس) کی نئی عمارت بھی دیکھی جو 1048ء میں مکمل ہوئی۔ اس کی تعمیر کے لئے شہنشاہ قسطنطین نہم مونو مارکس نے دل کھول کر عطیات دیئے۔ ناصر اس عمارت کو انتہائی خوبصورت قرار دیتا ہے۔ وہ تصاویر اور موزیک، جن میں حضرت عیسیٰ، انبیاء اور یوم حساب دکھایا گیا تھا، اسے حیرت انگیز اور پریشان کن محسوس ہوتی ہیں کیونکہ وہ ایک مسلمان سیاح ہے اور انبیاء کی تصویروں کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ نیا گرجا قسطنطین کی بنی عمارت سے مختلف تھا۔

مشہد کو دوبارہ بنانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی تھی۔ اب وہاں پتھر، ٹوٹے ہوئے ستون اور ملبے کا ڈھیر پڑا تھا۔ حضرت عیسیٰ کی قبر کے گرد بنایا گیا گرجا گول عمارت کی باقیات پر کھڑا کیا گیا تھا۔ یہ خلیفہ الحاکم کے حکام کے انہدام سے بچ گئی تھیں۔ مونو مارکس کی نئی عمارت نے رومن یادگار کو بالکل بدل دیا تھا۔ اب اس پر بالائی منزل کا اضافہ ہوگیا۔ ایک محراب بنائی گئی جو گول عمارت (روٹونڈا) کو بہت بڑی قوس کی صورت میں آپس میں ملاتی تھی۔ گرجا حیات نو کے آگے صحن کو وسیع کر کے اس کے احاطہ کے جنوب مشرقی کونے میں گلگتا کی باقیات اور اس کے پیچھے خانقاہ حضرت آدم کو شامل کر لیا گیا۔ نئی عمارت کے گرجوں کو سینٹ جان، تثلیث اور سینٹ جیمز سے موسوم کیا گیا۔ یہ تینوں گرجے بپتسمہ والے پرانے حوض کے ساتھ تعمیر کئے گئے تھے۔ گلگتا کی طرف وسیع کئے گئے صحن میں بنائے گئے گرجے مقدس واقعات اور عقائد سے منسوب تھے۔

ناصر نے ''حیات نو'' کی نئی عمارت دیکھتے ہوئے کوئی کشیدگی محسوس نہ کی۔ وہ آزادی اور اطمینان سے پوری عمارت دیکھتا رہا۔ اس نے بڑی دلچسپی سے حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت عیسیٰ کی تصاویر دیکھیں۔ البتہ اس نے محسوس کیا کہ یہ عیسائی ابھی تک وہ تباہی اور پریشانی نہیں بھول سکے جو گزشتہ صدی کے دوران ان پر آئی تھی۔ چنانچہ وہ خود کو غیر محفوظ محسوس کرتے تھے۔ 1055ء میں جب شہر کی نئی دیواریں تعمیر ہو رہی تھیں تو گورنر نے عیسائیوں کو مطلع کیا کہ شہر کے جس حصہ میں وہ رہتے ہیں وہاں دیوار کی تعمیر کے اخراجات انہیں خود برداشت کرنا پڑیں گے۔ چونکہ مقامی عیسائیوں کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے چنانچہ انہوں نے ایک بار پھر شہنشاہ قسطنطین نہم مونو مارکس سے رجوع کیا۔ اس نے شہر مقدس کی زندگی میں دخل دینے کا موقع ضائع نہ کیا۔ خلیفہ سے سلسلہ جنبانی کے بعد طے پایا کہ شہنشاہ صرف اس شرط پر دیوار تعمیری کرنے کے لئے رقم دے گا کہ اس حصہ میں صرف اور صرف عیسائی رہائش رکھیں گے۔ چنانچہ 1063ء کے بعد سے یروشلم کے عیسائیوں کا رہائشی علاقہ الگ اور مخصوص ہوگیا۔ یہ شہر کے شمالی دروازے سے لے کر مغربی دروازے کی شہر پناہ تک پھیلا ہوا تھا۔ داخلی طور پر اس کی سرحد پرانی شاہرہ کارڈو میکسی مس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی اس چوراہے تک آتی تھی جہاں سے ایک شاہراہ واپس شہر پناہ کو جاتی۔ قسطنطین نہم کی بدولت اب اسقف اعظم کے علاوہ کوئی اور ان کا حاکم اور منصف نہیں تھا۔(24) بازنطینیوں کو یروشلم میں ایک ایسا علاقہ مل گیا جو ان کے حامیوں اور مددگاروں پر مشتمل اور مسلمانوں کے علاقہ سے الگ تھلگ تھا۔ اسقف اعظم

MAP (نقشہ)

انا ستاسیس (گرجا حیات نو) تعمیر نو

(شہنشاہ قسطنطین نہم۔1048ء)

تفصیل

1۔نمبر سے 13۔نمبر تک

کی رہائش سے متصل عمارتوں میں ایک ہسپتال تھا۔ یہ سینٹ جان المعروف مہتمم خیرات خانہ سے موسوم تھا اور تقریباً انہی دنوں اٹلی کے علاقہ امالفی کے لوگوں نے شارلیمان کے پرانے شفاخانہ کے مقام پر ہی بنایا تھا۔ یورپ کے لوگ تاریک دور سے نکلنے کی کوشش کررہے تھے۔ اٹلی کے شہروں کے تاجروں نے مشرق کے ساتھ تجارتی روابط پیدا کر لئے تھے۔ فاطمی دور کی تجارت میں چونکہ امالفی تاجر اہم کردار ادا کررہے تھے چنانچہ انہیں اطالوی راہبوں اور زائرین کے لئے یروشلم میں سرائے اور شفاخانہ بنانے کی اجازت خلیفہ نے آسانی سے دے دی۔

یروشلم کے دیگر نو واردوں میں آرمینیائی تھے۔ یورپی زائرین کی طرح یہ لوگ بھی چوتھی صدی عیسوی سے شہر مقدس کی زیارت کے لئے آرہے تھے۔ ان میں سے کئی زائرین (راہب اور صوفی) یہیں مستقل آباد ہو گئے۔ انہوں نے کوہ زیہون پر ایک نیا کلیسیا بنالیا تھا۔ یہ کلیسیا 1030ء کے عشرہ میں جارجیا کے راہب پروچر نے تقریباً انہیں دنوں تعمیر کیا جب شہر سے باہر خانقاہ صلیب تعمیر ہورہی تھی۔ آرمینیائیوں نے چالیس سال کے بعد کوہ زیہون کا چرچ جارجیوں سے لے لیا۔ یہ سینٹ جیمز سے موسوم تھا۔ آرمینیائی زبان میں اسے ''سرپ ھھیگوپ'' کہتے تھے۔ اس کے مرکزی متبرک خانہ میں ''کل خطیر'' یعنی جیمز دی پلر کا کاسہ سر تھا، جو حضرت عیسیٰ کے حواری تھے اور 42ء میں یروشلم میں ان کا سر قلم کیا گیا تھا۔ قربان گاہ کے نیچے جیمز زادک کی قبر تھی جو یروشلم کے پہلے بشپ تھے۔ کوہ زیہون پر ایک عرصہ سے عیسائیوں کا متبرک مقام تھا۔ جب یہ مذہبی عمارتیں تعمیر ہو گئیں تو پھر آرمینیائی عیسائیوں نے سینٹ جیمز کی برادری اور پیشوائیت کے لئے اپنا مدرسہ اور خانقاہ قائم کر لئے۔ ان میں اس مسلک کے پادریوں، بشپوں اور پریبیتر (مذہبی جماعت کے دنیاوی امور سرانجام دینے والے عہدہ داروں) کو تربیت دی جاتی تھی۔ صدیوں کے دوران بتدریج آرمینیائی پادریوں نے اپنی خانقاہ کے اردگرد عمارتیں خرید لیں اور شہر کے جنوب مغربی گوشہ پہ اپنا تسلط جما لیا۔ ابتدا میں جب آرمینیائی زائرین نے یروشلم میں قیام کا فیصلہ کیا تو انہیں آرمینیائی گوشے میں ایک مکان دے دیا گیا۔ وہ ایک سیکولر کمیونٹی کے رکن بن گئے جو ''بھائیوں کا حلقہ'' کہلاتا تھا۔ وہ ''کاغا کاتسی'' یعنی یروشلم کے مستقل باشندے قرار دے دیئے گئے۔ اب یہ شہر ان کا اپنا شہر تھا۔ انہیں اپنا کلیسائی حلقہ بنانے کے لئے ''گرجا ریئس الملائکہ'' (ھرستا گابد) مخصوص کر دیا گیا۔ یہ آرمینیائی خانقاہوں کے وسط میں تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس مقام پر اناس کا گھر تھا۔ اسی کاھن نے کائفا کاھن اعظم کو قائل کیا تھا کہ یسوع کو مجرم ٹھہرا کر موت کی سزا دلوائے۔ اس گرجا کے صحن میں زیتون کا ایک قدیم درخت تھا جس کے بارے میں عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ یسوع کو کوڑے مارنے کے لئے اسے

اس درخت سے باندھا گیا تھا۔ کاغا کاتسی بتدریج شہر میں ایک الگ اور بڑی برادری بن گئے۔ آرمینیائی توحید پرست تھے لیکن یونانی اور لاطینی تقلید پسندوں کی طرح نئے لوگوں کو عیسائی بنا کر اپنے حلقہ میں شامل نہیں کرتے تھے۔ یہ فرقہ موروثی ارکان پر مشتمل رہا۔ نویں صدی عیسوی کے اختتام تک ان کی آبادی ایک ہزار کے قریب اور آرمینیائی گوشہ شہر کا دسواں حصہ تھی۔

گیارھویں صدی کے دوران زائرین کے ہجوم یروشلم میں اُمڈتے چلے آرہے تھے۔ یورپ سے آنے والا سیلاب زیادہ نمایاں تھا۔ وہاں برگنڈی میں کلیونی کی خانقاہ میں راہب لوگوں کو زیارتوں کے لئے ذہنی طور پر تیار کرتے تھے۔ 1000ء میں برگنڈی کے مبصر راؤل گلبہر نے لکھا کہ نا قابل شمار تعداد میں رؤسا اور عام آدمی یروشلم کے لئے سڑکوں پر نظر آتے ہیں۔ یہ اٹلی، گال، ہنگری اور جرمنی سے آتے ہیں اور کشف ورویا سے متاثر ہوتے ہیں۔(25) انہیں رومن دور کی پیشین گویاں یاد دلائی جاتی تھیں کی آخری دنوں سے پہلے مغرب کا ایک شہنشاہ یروشلم میں داخل ہوگا۔ وہاں اس کی تاجپوشی ہوگی اور وہ مسیح کے دشمنوں کے خلاف جنگ کرے گا۔ کتاب الہام بتاتی تھی کہ شیطان پر مسیح کی فتح کے ایک ہزار سال بعد آخری جنگ ہوگئی۔(26) چنانچہ 1000ء میں زائرین جوق در جوق اسی لئے یروشلم کا رخ کررہے تھے کہ وہ اس جنگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ انہیں یقین تھا کہ مسیح کی آمد ثانی کا وقت آچکا ہے۔ قریطیوں کی طرح ان لوگوں کو بھی یقین تھا کہ یروشلم میں ان کی موجودگی خدا کو مجبور کردے گی کہ وہ نئے یروشلم کو زمین پر نازل کرے اور نیا عالمی نظام نافذ ہو۔ جب آخری دن آنے میں ناکام ہوگئے تو لوگوں نے کہنا شروع کردیا کہ 1033ء جو واقع صلیب کا ہزارویں سالگرہ کا سال ہے، موعودہ واقعہ کے لئے طے شدہ ہے۔ اس برس پورے یورپ میں شدید قحط پڑا۔ گلبیر بتاتا ہے کہ لوگوں کو یقین ہوگیا کہ یہ آفت آخری دنوں کا پیش خیمہ ہے۔ سب سے پہلے کسان، پھر معاشرے کے متوسط طبقات اور آخر میں راؤسا نے یروشلم میں نجات دہندہ کی قبر کا رخ کرنا شروع کردیا۔ گلبیر کا کہنا ہے کہ شہر مقدس نے زائرین کا اتنا بڑا ہجوم ماضی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ زائرین کو یقین تھا کہ موجودہ حالت زار دنیا کے خاتمہ کی پیش گوئی کررہی ہے۔(27) مغربی یورپ کے عیسائیوں میں زبردست مایوسی پائی جاتی تھی۔ لوگ نجات کی علامت یروشلم کے لئے ناامید ہوچکے تھے۔

1064ء میں بھاری تعداد میں یورپی زائرین نے بمبرگ کے بشپ آرنلڈ کی قیادت میں یروشلم کا رخ کیا۔ ہجوم اب مقدس غربت کا مظہر نہیں تھا۔ یورپ میں زندگی آسودہ ہوچکی تھی۔ جرمن امرا اپنی دولت پر اترا رہے تھے۔ اپنے زرق برق ملبوسات اور پرتعیش طرز حیات سے وفخر ومباہات کا اظہار کررہے تھے۔ عرب بدو زائرین کو رشک وحسد کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انہیں وہم تھا کہ بظاہر چیتھڑوں میں ملبوس زائرین بھی اپنے لبادوں میں سونے کے ٹکڑے چھپا کر لاتے ہیں۔ جرمن امرا کی شان وشوکت قزاقوں کے لیے ایک دعوت عام تھی۔ بدوؤں نے زائرین پر حملہ کردیا۔ ان لوگوں کے گروہ شہر مقدس کے سائے میں مارے گئے۔ ہر تیس سال کے بعد یورپ سے زائرین کا ایک بہت بڑا ریلہ یروشلم میں آیا کرتا تھا۔

صدی کے اختتام کے قریب ماضی کی طرح ایک بہت بڑے قافلے کی آمد متوقع تھی۔لیکن اس دفعہ یعنی 1099ء میں جب زائرین یہاں آئے تو وہ تلواروں سے مسلح تھے۔ وہ نہ صرف دفاع کے لئے تیار تھے بلکہ جوابی کاروائی کرنے پر بھی آمادہ تھے۔

یہودی زائرین اور آبادکار بھی یروشلم کو شہر نجات بنانا چاہتے تھے۔ عیسائیوں کی طرح وہ بھی درشت رویہ پر برا نگیختہ ہو جاتے تھے۔ جب خانہ بدوش بربروں نے کیروان پر 1050ء کے عشرہ میں حملہ کیا تو مسلمان اور یہودی دونوں ہی تباہی سے بچنے کے لئے فلسطین کو بھاگ نکلے تھے۔ کچھ اور مہاجرین ہسپانیہ سے قحط اور افلاس سے مجبور ہو کر آ گئے تھے۔ یورپیوں کو مغربی کہا جاتا تھا۔ان یہودی مغربیوں میں سے کچھ شہر مقدس میں آباد ہو گئے لیکن یہاں کے مشکل حالات نے انہیں اپنے وطن کی یاد دلا دی جو اسلامی سلطنت سے آگے پایا جاتا تھا۔ جوزف ھا۔کوہین نے یروشلم کے یہودیوں کی حالت زار کا نقشہ یوں کھینچا:

''یہ لوگ ذلت کے مارے ہوئے تضحیک کے شکار، غریب، محرم،
کچلے ہوئے اور بال بال قرضے میں جکڑے ہوئے تھے۔''

عیسائیوں اور مسلمانوں کی موجودگی انکے لئے نا قابل برداشت تھی۔ اگر زندگی بری نہیں تھی تو بھی انہیں عیسائی زائرین کے نعرے اور مسلمانوں کی پانچ وقت اذان سننا پڑتی تھی جس میں کسی روز وقفہ نہیں ہوتا تھا۔(28) چونکہ یروشلم کی یہودی برادری کا انحصار فسطاط اور رملہ کی خیرات پر تھا چنانچہ وہاں قحط یا طاعون کا مطلب ہوتا تھا کہ انہیں بھوکا مرنا پڑے گا۔

ان تمام تر مشکلات کے باوجود یہودی زائرین یروشلم کی زیارت کے لئے آتے رہتے تھے۔ وہ خصوصاً تشری کے مہینے میں ضرور یہاں آتے اور سکوتھ کی تقریب منعقد کرتے۔اس تقریب میں شرکت کے لئے خراسان جیسے دور دراز علاقوں سے بھی یہودی ضرور آتے۔انہوں نے انتظار مسیح کے لئے اس تہوار کے موقع پر اپنی رسوم وضع کر لی تھیں۔ سب سے پہلے مقامی اور زائر یہودی شہر کی دیواروں کے گرد دائرہ بناتے اور حرم کے دروازوں پر ماضی کی طرح دعا مانگتے۔ پھر وہ کوہ زیتون پر چڑھتے اور زبور کے گیت گاتے ہوئے معراج کی رسم ادا کرتے۔سلمان بن یہوداہ نے لکھا ہے کہ زیتون پر کھڑے ہو کر وہ اپنا منہ معبد کے طرف کر لیتے۔ جو ان کے لئے خدا کی موجودگی، اس کی طاقت اور اس کا پائیدان تھا۔(29) اگرچہ معبد کے پہاڑ کا منظر ان کے لئے خوشگوار نہیں تھا۔ اس پر مسلمانوں کی مذہبی عمارتیں اور خانقاہیں تھیں لیکن کوہ زیتون پر یہودیوں کے بھاری اجتماعات پر مسرت اور جشن کا ماحول دیکھتے تھے۔ یہودی وہاں ایک دوسرے کو گلے ملتے اور مبارک دیتے۔ پہاڑ پر وہ ایک بڑے پتھر کے گرد جمع ہو جاتے۔ان کا کہنا تھا کہ یروشلم چھوڑنے سے پہلے شیکنہ (خدا کی موجودگی)

نے یہاں کچھ دیر قیام کیا تھا۔ یہاں یروشلم کا ربی اعظم (گاؤں) سالانہ وعظ کرتا۔ بدقسمتی سے اس اجتماع کی دوستانہ فضا پر فرقہ وارانہ دشمنی کے بادل چھا گئے۔ گاؤن توریت کا کوئی جز نکالتا اور قریطیوں کو دین دشمن ٹھہرانے کے لئے مذہبی دلائل دیتا۔ قریطیوں کو یہودی برادری سے خارج قرار دیا جاتا۔ یہ فتوے ہمیشہ فساد کا سبب بنتے کیونکہ ایس پہاڑ پر ربانوی فرقے کے سامنے کچھ فاصلے پر قریطیوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ گاؤن سلمان بن یہوداہ ایک امن پسند شخص تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ نا خوشگوار رسم ختم ہو جائے۔ مسلمان حکام بھی اصرار کرتے تھے کہ یہودی ایک دوسرے کو دین دشمن قرار دینے کے ہنگامہ پرور اقدام سے دور رہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ربانوی اور قیریطی دونوں کو سکوتھ کا تہوار منانے کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ انہیں اپنے اپنے عقیدے کا مطابق پرامن طریقے سے منانا چاہئے۔

یروشلم پر فاطمیوں کا قبضہ شہر کے لئے سود مند ثابت نہ ہوا۔ جلد ہی شہریوں کو شمال سے ایک نئے دشمن کا سامنا کرنا پڑا۔ 1055ء میں اسلام قبول کرنے والے ترک قبائل نے عباسی خلیفہ کے نام سے شمالی شام پر قبضہ کر لیا۔ یہ ترک قبائل سنی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ لوگ عمدہ قسم کے منتظم اور اعلیٰ سپاہی تھے۔ چونکہ ترکوں کی ان معرکہ آرائیوں میں سلجوق ترک قبیلہ نے اہم کردار ادا کیا تھا چنانچہ ان ترکمانوں (اشراف ترک) کو تاریخ میں سلجوق کہا گیا۔ حالانکہ تمام ترکمان سلجوق نہیں تھے۔ 1071ء میں ترک جرنیل الپ ارسلان نے آرمینیا میں بازنطینی دفاع توڑتے ہوئے ایشیائے کوچک کا بہت سا علاقہ اپنی عملداری میں لے لیا۔ اسی دوران عزیز بن اباق نے شیعوں کے خلاف جنگ کی قیادت کرتے ہوئے فلسطین پر حملہ کیا اور رملہ فتح کر لیا۔ اگلے مرحلہ میں اس نے یروشلم کا محاصرہ کر لیا۔ 1073ء میں شہر تسخیر ہو گیا۔ شہر کے باشندے فاتحین کا رویہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ عزیز نے یروشلم کے سبھی شہریوں کو عام معافی دینے کا اعلان کر دیا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیں اور نہ شہر کی عظیم دولت لوٹیں۔ اس نے گرجوں اور مساجد کے تحفظ کے لئے محافظ تعینات کر دیئے۔ فاطمی فوج جو ترکوں، سوڈانیوں اور بربروں پر مشتمل تھی اسے شہر میں رہنے دیا گیا۔ فاطمی جوف کے ترک، سلجوقوں کے پاس چلے گئے جب کہ دوسرے سپاہی عام شہریوں کی حیثیت سے رہنے لگے۔

ترک قبضے کا مطلب تھا کہ اب شہر پھر سے سنی العقیدہ قیادت کے پاس آ گیا ہے۔ علما یروشلم کو واپس آنے لگے اور شہر کی عملی زندگی فاطمیوں کے استبداد کے بعد نشاۃ ثانیہ میں داخل ہو گئی۔ ترکمانوں کا اقتدار شہر میں خوشحالی لے آیا۔ 1089ء میں ایک نئی مسجد تعمیر ہوئی۔ اسلامی فقہ کے چار مکاتب فکر میں سے دو، شافعی اور حنفی شہر میں خوب پھلے پھولے۔ ترکوں نے تالاب بیت حصدا کے پاس کنواری مریم کے مولد کی یاد میں بنے پرانے گرجا کی تعمیر نو کی لیکن اسے شافعی مدرسہ میں تبدیل کر دیا اور اس کا سربراہ شیخ نصر المقدسی کو بنا دیا۔ یروشلم میں حدیث اور فقہ کے علوم ایک بار پھر فروغ پا گئے۔ مجیر الدین نے ایسے علما کی فہرست بھی مرتب کی ہے جو یروشلم میں پڑھانے اور لکھنے لکھانے کے لئے اس دور میں آئے۔ ان میں ابوالفتح نصر اور الطرطوشی شامل تھا۔ الطرطوشی، اندلس کے معروف فقیہ تھے۔ 1095ء میں ممتاز سنی العقیدہ عالم ابو حامد الغزالی بھی یروشلم

میں زیارت اور مراقبہ کے لئے آیا۔ اس نے باب الرحمت کے پاس چھوٹی سی خانقاہ میں رہائش رکھی، ایس میں مراقبہ اور ریاضت کے صوفیانہ مراحل طے کئے۔ عالم اسلام کے اس عظیم دانشور نے یروشلم ہی میں اپنا مشہور مقالہ ''احیائے علم دینیہ'' لکھا۔ تقریباً انہی دنوں ہسپانیہ کا سیاح ابوبکر ابن العربی یروشلم میں آیا۔ وہ اس شہر سے اس قدر متاثر ہوا کہ تین سال تک یہیں مقیم رہا۔ وہ یہاں دو فقہی مدرسوں کا ذکر کرتا ہے جن میں ممتاز علما باقاعدگی سے فقہ پڑھاتے تھے۔ ابن العربی ان مدرسوں میں ہونے والے مذاکروں اور بحث مباحثوں کا دلچسپی سے ذکر کرتا ہے کیونکہ یہ طریقہ کار اندلس میں متعارف نہیں تھا۔ وہ مسلمان علما اور ذمیوں کے درمیان مناظروں سے بھی بہت متاثر ہوا۔ ان مناظروں میں یہودی، عیسائی اور مسلمان مذہبی نکات اٹھاتے۔

1077ء میں شہر کشیدگی کا شکار تھا۔ فاطمیوں کے حامیوں نے ترکوں کے خلاف یورش کر دی۔ عزیز ان دنوں مصر میں معرکہ آرا تھا۔ قاضی نے تمام ترک مردوں اور عورتوں کو قید کر کے شہر پناہ میں بجھوا دیا۔ ترکوں کی املاک بھی ضبط کر لی گئیں۔ اس دفعہ جب عزیز یروشلم میں داخل ہوا تو اس نے رحم کا مظاہرہ نہ کیا۔ اس کے سپاہیوں نے تین ہزار کے قریب شہر یوں کو قتل کیا۔ صرف ان لوگوں کو معاف کیا گیا جنہوں نے حرم میں پناہ لی۔ اسی طرح اسقف اعظم کے علاقہ میں عیسائی محفوظ رہے۔ البتہ یہودیوں کے ساتھ کوئی نرمی نہ برتی گئی۔ کیونکہ وہ ہمیشہ سے فاطمیوں کے وفادار تھے اور ترک اقتدار کو تباہی کا ذریعہ قرار دیتے تھے۔ وہ ان سے وسیع تر قتل و غارت، لوٹ مار، کھیتوں کو جلانے اور درختوں کو کاٹ پھینکنے جیسے وحشیانہ اقدامات منسوب کرتے تھے۔ یہودی پیشوا اس دور میں یروشلم سے الصور چلا گیا۔ سرکردہ مسلمان شہری جو فاطمیوں کے حامی تھے انہیں ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ لیکن آبادی کا بہت بڑا حصہ اس شورش کے دوران بے نیاز نظر آیا۔ ابن عربی کے لئے حیرت کی بات تھی کہ شہر کے باشندے روزمرہ زندگی کے معمولات میں مشغول تھے۔ ایک باغی شہر پناہ میں گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ گورنر کے تیر انداز اس پر تیر برسا رہے تھے۔ سپاہی دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے اور ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ ابن عربی کا کہنا ہے کہ اگر اس طرح کا واقعہ اندلس میں ہوتا تو پورے شہر میں لڑائی پھیل جاتی۔ دکانیں بند ہو جاتیں۔ زندگی کے معمولات معطل ہو جاتے۔ چنانچہ ابن عربی کے لیے اس نسبتاً چھوٹے شہر میں زندگی کا معمول پہ رہنا ایک اچنبھا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

> ''شورش کے باوجود کوئی بازار بند نہ ہوا۔ کسی عام شہری نے متحارب گروہوں میں سے کسی کا ساتھ دیتے ہوئے ہنگامہ آرائی میں حصہ نہ لیا۔ کسی صوفی نے مسجد اقصیٰ سے نکلنا پسند نہ کیا اور کوئی مباحثہ منسوخ نہ ہوا۔''(30)

یروشلم کے شہری پچھلے دوسو برسوں سے اس طرح کی شورشوں کے عادی ہو چکے تھے چنانچہ وہ چھوٹے موٹے واقعات سے بے نیاز رہنا سیکھ چکے تھے۔یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی جزوی بدامنی پھوٹ پڑنے کے واقعات کے باوجود شہر ترکمانوں کے دور میں خوشحالی کے سفر پر گامزن رہا اور فلسطین کا سب سے اہم شہر بن گیا۔1033ء کے زلزلہ کی تباہی سے رملہ کبھی بھی پوری طرح نہ نکل سکا۔لیکن یروشلم کی ئی دیواریں بن گئیں۔عمارتیں نئی آب وتاب کے ساتھ بحال ہوئیں۔ ثقافتی زندگی نے بھرپور توانائی حاصل کی اور شہر بین الاقوامی سطح پر سب کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ہر سال تینوں مذاہب کے زائرین دنیا بھر سے ہزاروں کی تعداد میں یہاں آتے۔لیکن ابن عربی جس خوشحالی اور آسودگی کا ذکر کرتا ہے،اس کی موجودگی کے باوجود شہر کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لئے ایک تباہی سرپٹ بھاگی چلی آرہی تھی۔ جسے یروشلم کے شہری اپنی افتادطبع کے باوجود قبول نہ کر سکے۔۔۔۔۔فاطمی ابھی فلسطین سے دستبردار نہیں ہوئے تھے۔ اگست 1098ء میں شیعی خلیفہ الافضل نے چھ ماہ کے محاصرے کے بعد شہر کو فتح کرلیا۔فاطمیوں کے حامی بہت مسرور تھے۔ لیکن ایک سال سے بھی کم عرصہ بعد۔۔۔۔۔یعنی جون 1099ء میں یورپ کے ''صلیبی مجاہدین'' شہر کی دیواروں کے گرد جمع ہو گئے۔جب شہر مقدس پر ان کی پہلی نظر پڑی تو تمام لشکر ایک صدمہ کی کیفیت میں ساکت وجامد ہو کر رہ گیا۔سنہری قبتہ الصخرہ شاہانہ انداز میں ان کے مقدس شہر میں سربلند نمایاں وممتاز اور غالب نظر آرہا تھا۔پھر ان کے اعصاب بحال ہوئے تو وہ شہر مقدس پہنچنے کی روحانی مسرت سے رونے اور چلانے لگے۔''گیستا فرینکورم'' کا گمنام مصنف کہتا ہے کہ ان کی خوشی بتدریج غیض وغضب میں بدل گئی اور مذہبی جوش وخروش کے ساتھ نعرے لگاتے ہوئے انہوں نے شہر کا محاصرہ کرلیا۔

==========

حوالہ جات

1۔ تاریخ مقدسی (احوال شام وفلسطین) انگریزی ترجمہ گے لی سٹینج (لنڈن 1896ء) نیویارک 1971ء۔صفحہ نمبر 41۔

2۔ قرآن مجید 17:1۔

3۔ ابتدائی دسویں صدی عیسوی کی تحریروں میں ان چھوٹے چھوٹے تبرک خانوں، خانقاہوں اور محرابوں کو

مقدس مقامات کہا گیا ہے۔حرم میں ان کے درست ترین مقام کا تعین ہم نہیں کر سکتے۔آج کل جو عمارتیں موجود ہیں وہ اپنے اصل مقام پر نہیں ہیں۔ صلیبی جنگوں کے دوران انہیں منہدم کر دیا گیا تھا۔

بعد میں اندازاً انہیں مختلف مقامات پر تعمیر کیا گیا۔

4۔ قرآن مجید 3:35-38

5۔ قرآن مجید 57:13

6. NOTKER, De Caralo Magno, Two Lives of Charlemage, Trans. Lews Thorpe (London 1969), p. 148.

7. William, Archbishop of Tyre, A History of Deeds Done Beyond The sea, 2 vol. trans. E.A Babcock and A.C. Krey (New York, 1943) p. 1:65.

8. F. E. Peters, Jerusalem, The Holy city (Princeton, 1985), p. 261.

9۔ مجیرالدین، تاریخ یروشلم انگریزی ترجمہ ہنری سیوائر (پیرس 1876) صفحہ نمبر 689

10۔ موشے گل (ہسٹری آف فلسطین) انگریزی ترجمہ ایتھل برائیڈو (کیمبرج 1992) صفحہ نمبر 618۔

11۔ ایضاً صفحہ نمبر 325۔

12۔ ایضاً صفحہ نمبر 326۔

13۔ مقدسی (احوال شام) صفحہ نمبر 37۔

14۔ ایضاً ۔

15۔ ایضاً صفحہ نمبر 67-68۔

16. Ibn Al-Qalanisi, continuation of the Chronicle of Damascus: The Damascus Chronicle of the Crusades, Trans. H. A. R. Gibb (London- 1932), p. 66.

17. Ibid.

18. Charles Cousnon, O. p> the Church of The Holy Sepulchre inJerusalem (London- 1974), p. 19.

19۔ گل۔ہسٹری آف فلسطین۔صفحہ نمبر 167۔

20۔ مقدسی۔احوال شام و فلسطین۔صفحہ نمبر 36۔

21۔ گل۔ہسٹری آف فلسطین۔صفحہ نمبر 151۔

22. Isaac Hasson, Muslim Literaturw in Praise of Jeruslame in L.I. Levine The Jerusalem Catherdra (Jerusalem,1981-82),I, p.182.

23. Guy Le Strange, Palwstine Under the Moslems: A Description of Syria and the Holy Land from AD 650 to 1500 (London, 1890), pp. 164-65.

24. William of Tyre, History 1:406-8.

25. Glaber, History 3:1.

26. Revelation 20:1-3.

27. Glaber, History 4:6.

28. Gil, History of Palestine, p. 400.

29. Ibid., p. 627.

30. Rihla 66-67, quoted in Mustafa A. Hiyari, "Crusader Jerusalem, 1099-1187 AD," ub J, H, Asakum ed., Jerusalem in History (New York, 1990), p. 131.

==========

تیرھواں باب

صلیبی جنگیں

1071ء میں مانسی کرٹ کی جنگ کے بعد بازنطینی کم وبیش پورے ایشائے کوچک سے محروم ہو گئے۔اس پر سلجوقوں کا قبضہ ہو گیا۔اب بازنطینیوں کو نظر آ رہا تھا کہ مسلمان ان کی دہلیز عبور کرنے والے ہیں۔لیکن ترکمانوں کی طاقت مضمحل ہو رہی تھی اور شہنشاہ الیکسئیس کومنینس اول نے بھانپ لیا تھا کہ ترکمان پہلی جیسی تب وتاب نہیں رکھتے اور اگر پے در پے دو تین حملے کئے جائیں تو ان کا قصہ ہمیشہ کے لئے ختم کیا جا سکتا ہے۔اس نے 1095ء کے اوائل میں پوپ اربن دوم کو عسکری امداد کی درخواست کی۔اس کا خیال تھا کہ پوپ اسے کچھ نارمن کرائے کے سپاہی بھجوا دے گا جو پہلے بھی اس کے لئے لڑ چکے تھے۔لیکن پوپ کے عزائم کچھ اور ہی تھے۔وہ زیادہ سنجیدگی سے اور بھرپور طریقے سے مہم جوئی چاہتا تھا۔سال کے آخر میں پوپ نے یورپ کے پادریوں، امرا اور عام عیسائیوں کو شہر مقدس آزاد کرانے کے لئے صلیبی جہاد کی ترغیب دی۔اس نے یورپ کے نائٹس سے درخواست کی کہ اپنی بے مقصد جاگیردارانہ محاذ آرائیوں کو ترک کر دیں جو یورپ کی توانائیاں ضائع کر رہی ہیں اور ان کی بجائے اناطولیہ کے عیسائی بھائیوں کی مدد کریں جو پچھلے بیس برسوں سے مسلمان ترکوں کی غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔اپنے بھائیوں کو ''کافروں'' سے آزادی دلا کر انہیں یروشلم کا رخ کرنا چاہئے تا کہ مرقد مسیح کو اسلام کے سائے سے نجات دلائی جا سکے۔''یورپ میں خدا کی سلامتی نازل ہو گی اور مشرق قریب میں خدا کی جنگ برپا ہو گی۔'' پوپ اربن نے صلیبی جہاد کی ترغیب کے لئے کلرمانٹ کی مذہبی مجلس میں جو تقریر کی، اس کے اصل متن سے تو ہم آگاہ نہیں لیکن جو کچھ کہا گیا اس کا مطلب یہی تھا اور اس نے جس مہم جوئی کی ترغیب دی وہ پہلی صلیبی جنگ کی صورت میں دنیا کے سامنے آئی۔بظاہر یہ اسی طرح کی ایک مسلح زیارت تھی جس طرح کی تین بڑی زیارتیں گیارھویں صدی عیسوی میں دیکھنے میں آ چکی تھیں۔اس سے پہلے زائرین کو ہتھیاروں کے ساتھ زیارتوں پر جانے کی ممانعت تھی لیکن اب پوپ نے مسلح ہونے کی اجازت دے دی تھی۔مجلس میں تقریر کے بعد پوپ کو زبردست پذیرائی ملی۔مجمع یک زبان ہو کر چلایا۔۔۔۔۔ڈیوس ھاک ولٹ۔۔۔۔۔

''خدا کی مرضی یہی ہے۔''

پوپ کی درخواست کا ردعمل، حوصلہ افزا، غیر معمولی، ہمہ گیر اور فوری تھا۔عوامی واعظین نے پوپ کا پیغام پورے

یورپ میں پھیلا دیا۔ 1096ء کے موسم بہار میں ساٹھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل پانچ لشکر، جن میں غیر جنگجو کسانوں اور زائرین کے جتھے تھے اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ یروشلم جانے کے لئے سڑکوں پر نکل آئے۔ ان کی اکثریت مشرقی یورپ کے خطرناک سفر کے دوران موت کے منہ میں چلی گئی۔ ان کے پیچھے موسم خزاں میں ایک لاکھ مردوں اور پادریوں کے ایک انبوہ پر مشتمل مزید پانچ لشکر روانہ ہو گئے۔ جب ابتدائی فوجی دستے قسطنطنیہ کے طرف روانہ ہوئے تو ''شہزادی ان کا منینا کو ایسا محسوس ہوا کہ'' ۔۔۔۔۔ پورا مغرب بلکہ بحر ایڈریاٹیک سے عمودان ہرقل (جبل الطارق کی چٹانوں) تک ہر چیز متحرک ہو گئی ہے۔ سب کچھ ابل کر ایشیا میں داخل ہو رہا ہے۔ ایک سیل رواں کی صورت میں اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ۔۔۔۔۔''

(1) شہنشاہ نے روایتی قسم کی فوجی مدد کی درخواست کی تھی لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے کسی بربر حملے کو آواز دے دی ہے۔ صلیبی جنگ، تاریک دور سے نکلنے کے بعد یورپ کی پہلی مشترکہ مہم جوئی تھی۔ اس میں سبھی طبقے شامل تھے۔ پادری، بطریق، امرا اور کسان سبھی پورے مذہبی جوش و خروش کے ساتھ یروشلم کی آزادی کے متمنی تھے۔ صلیبی مجاہدین یقیناً زمین اور دولت کا حصول نہیں چاہتے تھے۔ لیکن یہ مہم جوئی بہت خطرناک، مصائب سے دوچار کرنے والی اور سنگین پہلو رکھتی تھی۔ اور پھر یہ ایک مہنگی مہم تھی۔ بہت سے صلیبی مجاہد اپنے مال و متاع گنوانے کے بعد گھروں کو لوٹ آئے۔ اب ان کے پاس اپنی بقا کے لئے محض مذہبی عقیدت رہ گئی تھی۔ صلیبی مجاہدین کا کوئی ایک مخصوص نصب العین طے کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ تمام زائرین اس مہم جوئی کے لئے مختلف تصورات رکھتے تھے۔ پادری اور بطریق غالباً پوپ اربن کے ہم خیال تھے کہ آزادی کی مقدس جنگ سے مغربی کلیسیا کی طاقت اور توقیر میں اضافہ کیا جائے بہت سے نائٹس سمجھتے تھے کہ یروشلم کے لئے جنگ کرنا، ان کا مذہبی فریضہ ہے۔ کیونکہ یروشلم مسیح کی میراث ہے۔ اس کے حصول کے لئے جنگ کرنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح اپنی آبائی میراث کے حصول کے لئے نبرد آزما ہوا جاتا ہے۔ غریب اور عام صلیبی مجاہدین، نئے یروشلم کی الہامی پیشین گوئیوں کو پورا ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن ایک بات سب کے مقاصد میں مشترک تھی اور وہ شہر مقدس یروشلم تھا۔ اگر پوپ اربن نے مرقد مسیح کی بات نہ کی ہوتی تو شاید اسے یہ جوش و خروش نہ ملتا لیکن اس نصب العین کا ایک تاریک پہلو بھی تھا۔ بہت جلد یہ بات واضح ہو گئی کہ ''مسیح کی فتح'' دوسروں کی تباہی اور موت ہو گی۔ 1096ء کے موسم بہار میں جرمنوں کے صلیبی دستے نے دریائے رائن کے کنارے سپئیرز، وارمز اور مینز کے مقامات پر یہودیوں کا قتل عام کر دیا۔ یقیناً پوپ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن ان صلیبی مجاہدین کے لئے یہ بات مضحکہ خیز تھی کہ ہزاروں میل کا سفر کر کے وہ ان مسلمانوں سے لڑنے کے لئے جائیں جن کے بارے میں انہیں تفصیل سے کچھ علم ہی نہیں۔ ان کے لئے یہی اقدام بامعنی تھا کہ وہ یہودیوں کو قتل کریں جنہوں نے اصل میں یسوع کو مصلوب کیا تھا اور ان کے اردگرد زندہ سلامت پھر رہے تھے۔ یورپ میں یہ پہلا مکمل منصوبہ تھا۔ اسی کو وہ بار بار صلیبی معرکہ آرائی کی حیثیت سے دُہرا سکتے تھے چنانچہ مسیحی یروشلم کے تصور نے یورپ کو یہودیت دشمنی کے ناقابل علاج مرض میں مبتلا کر دیا۔

1096ء کے موسم خزاں میں جو مسیحی لشکر روانہ ہوئے وہ اپنے پیشروؤں سے زیادہ منظّم تھے۔ انہوں نے یہودیوں کو قتل کرنے کے لئے راستے میں کہیں بھی دائیں بائیں نہ دیکھا۔ زیادہ تر صلیبی مجاہد اچھی حالت میں قسطنطنیہ پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے عہد کیا کہ فتح کئے جانے والے وہ تمام علاقے شہنشاہ کی عملداری میں دے دیئے جائیں گے جو ماضی میں بازنطینی سلطنت کا حصہ رہے ہیں۔ لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ ان میں سے کچھ اپنے عہد پر کاربند رہنے میں زیادہ مخلص نہیں تھے۔ سلجوقوں پر حملہ کرنے کا یہ ایک اچھا موقع تھا۔ کیونکہ ان کی ابتدائی یک جہتی اب گروہی مناقشت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ان کے امیر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے۔ صلیبی مجاہدین نے ایک اچھا آغاز کیا۔ نیقیہ اور دوریلئم میں ترکوں کو شکست دے دی گئی۔ لیکن ابھی ایک طویل سفر درپیش تھا۔ خوراک کی قلت تھی۔ ادھر ترک پسپائی سے پہلے ہر چیز کو جلا دینے کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔ چنانچہ صلیبی مجاہدین کو ناقابل تصور مشکلات سے گزر کر یروشلم پہنچنے میں تین سال لگ گئے۔ جب وہ انطاکیہ پہنچے تو 98---1097ء کا خوفناک موسم سرما تھا۔ انہوں نے اس مضبوط قلعہ بند شہر کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے کے دوران ہر سات سپاہیوں میں سے ایک فاقوں کی وجہ سے مرتا رہا۔ آدھا لشکر تباہ ہو گیا۔ لیکن تمام دشواریوں کے باوجود انجام کار صلیبی لشکری کامیاب ہوئے اور جب 1099ء میں وہ بالآخر یروشلم کی دیواروں کے سائے میں پہنچے تو انہوں نے مشرق قریب کا نقشہ بدل دیا۔ انہوں نے ایشیائے کوچک میں سلجوقوں کے قوت کے مراکز ختم کر کے علاقے کو دو انتظامی اکائیوں میں تقسیم کر دیا اور ان کو مغربی حکمرانوں کی تحویل میں دے دیا۔ ایک اکائی انطاکیہ اور گردونواح پر مشتمل تھی، اس کا حکمران ٹارنٹینو کا نارمن بوھیمین اور دوسری اکائی آرمینیائی علاقہ تھی جس کا حکمران بالڈوین (آف بولون) کو بنایا گیا۔ اگرچہ صلیبی لشکریوں کی فتوحات نہایت کٹھن تھیں لیکن ان زرہ پوش جنگجوؤں کے بارے میں خوفناک افواہیں پھیل گئیں۔ انطاکیہ میں ان کی آمد سے پہلے ہی شور مچ گیا کہ یورپ سے آنے والے عیسائی لشکری آدم خور اور مذہبی جنون میں انتہائی سفاک اور درندہ صفت ہیں یروشلم کے بہت سے یونانی تقلید پسند اور مسیح کی ایک حیثیتی کے قائل عیسائی بھی ان افواہوں سے خوف زدہ ہو گئے اور بیشتر مصر کو بھاگ گئے۔ باقی رہ جانے والوں کو مسلمان گورنر نے شہر سے نکال دیا۔ ان کے ساتھ لاطینی عیسائیوں کو بھی شہر بدر کر دیا گیا کیونکہ ان کی وفاداریاں بلاشبہ صلیبی مجاہدین کے ساتھ ہو سکتی تھیں۔ لیکن یہ لوگ شہر کی کمزوریوں سے آگاہ اور علاقے کی ڈھلوانوں سے آشنا تھے چنانچہ محاصرہ کے دوران صلیبی لشکریوں کے بہت کام آئے۔

صلیبی جرنیلوں نے مخصوص حکمت عملی کے مطابق لشکریوں کو شہر کی دیواروں کے اردگرد تعینات کیا۔ نارمن رابرٹ کو شمال میں سینٹ ستفنس کے تباہ شدہ گرجا کے پاس متعین کیا گیا۔ فلنڈروں کے رابرٹ اور سینٹ پول کے ہیوغ کو شہر کے جنوب مغرب میں رہنے کی ذمہ داری دی گئی۔ بوئیلون کے گاڈفرے اور سینٹ گائیلز کے ریمنڈ اپنے دستوں کے ساتھ شہر پناہ کے سامنے خیمہ زن ہو گئے۔ ایک اور لشکر کو مشرق سے ہونے والے کسی حملہ کی مزاحمت کرنے کے لئے کوہ زیتون پر

تعینات کیا گیا۔ ابتدا میں مسیحی مجاہدین نے کچھ پیش رفت کی۔ لیکن وہ مشرق کے پتھریلے شہروں کے محصروں سے آشنا ہی نہیں تھے۔ پتھریلی دیواروں سے محفوظ یہ شہر مغرب کے زیادہ تر شہروں سے بڑے اور مستحکم تھے۔ چنانچہ مغرب سے آنے والے لوگ اس طرح کے محاصرے کی مہارت اور ضروری آلات سے محروم تھے۔ لیکن پھر یافہ میں جینیوا سے آنے والے بحری بیڑے نے ان کی مشکلات حل کر دیں۔ اس کے جہاز توڑ کر مستول، رسے اور آنکڑے حاصل کئے گئے اور ان کی مدد سے ایسے متحرک مینار (Belfreys) بنائے گئے جو سپاہیوں کو دیواروں پہ پہنچا سکتے تھے۔ مسلمان اس تکنیک سے بے خبر تھے۔ 15 جولائی 1099ء کو گاڈفرے کی فوج کا ایک سپاہی انہی میناروں میں سے ایک کے ذریعے شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ بقیہ سپاہیوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ وہ الہامی پیشین گوئیوں کے انتقام لینے والے فرشتوں کی طرح شہر کے محافظ یہودیوں اور عیسائیوں پر جھپٹ پڑے۔

تین دن تک صلیبی مجاہدین نے یروشلم میں منظّم انداز میں قتل عام کیا۔ تیس ہزار کے قریب شہری تہ تیغ ہوئے۔ گیستا فرینکورم کا مصنف لکھتا ہے کہ انہوں نے نظر آنے والے ہر ترک اور مسلمان کا سر قلم کر دیا۔ کسی مرد یا عورت کو نہ بخشا گیا۔(2) 10 ہزار مسلمان مسجد القصیٰ کی چھت پر پناہ لئے ہوئے تھے۔ ان کو چن چن کر قتل کیا گیا۔ اسی طرح یہودیوں کو ان کے صلواۃ میں گھیر کر موت کی وادی میں اتار دیا گیا۔ شہر کے مقامی باشندوں میں کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ شہریوں کو ختم کرنے کے بعد ان کی املاک پر قبضہ کرنے کی دوڑ شروع ہوئی۔ جو سپاہی یا افسر سب سے پہلے جس گھر میں داخل ہو جاتا وہ بلا شرکت غیرے اس کا مالک بن جاتا۔ قابض ہونے والوں میں نہ تو کسی امیر غریب کی تمیز تھی اور نہ قبضہ میں لئے جانے والی دکان، مکان یا محل کا کوئی امتیاز تھا۔(3) گلیاں خون سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ ہر جگہ سروں، ہاتھوں اور اعضائے جسمانی کے ڈھیر دکھائی دے رہے تھے۔ اس بربریت کا چشم دید گواہ اگیولیس کا ریمنڈ انتہائی تفاخر کے ساتھ تفصیلات بتاتا ہے۔ اسے اس وحشیانہ پن پہ کوئی شرمساری محسوس نہیں ہوتی۔ وہ پوری ڈھٹائی سے لکھتا ہے:

''قتل عام عیسائیت کی فتح کی علامت اور حرم پر اس کا مظاہرہ
ایک بھرپور ثبوت تھا۔''

''اگر میں آپ کو سچ بتا دوں تو آپ یقین نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ
میں یہی بتانے پر اکتفا کروں گا کہ معبد میں اور ہیکل سلیمانی (مسجد
عمر) کی ڈیوڑھی میں سوار ہو کر جانے والے صلیبیوں کے گھوڑوں کے
گھٹنے اور زینوں کی رکابیں خون میں ڈوب گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ
خدا کے احتساب اور انصاف کا یہ ایک علایشان مظاہرہ تھا۔ وہ جگہ

کافروں کے خون سے لبریز ہوگئی جہاں ایک طویل عرصہ سے خدا کی
توہین ہوتی رہی تھی۔'' (4)

شہر مقدس کو یہودیوں اور مسلمانوں سے حشرات الارض کی طرح صاف کر دیا گیا۔ آخر کار وہاں قتل ہونے کے لئے کوئی نہ بچا۔ عیسائی مذہبی جلوس کی صورت میں حمد وثنا کے گیت گاتے ہوئے ''حیات نو'' میں گئے۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ مرقد مسیح کے گرد جمع ہو کر انہوں نے حیات نو کی آیات پڑھیں۔ ان کی مذہبی رسوم نئے دور کی نقیب محسوس ہو رہی تھیں۔ ریمنڈ لکھتا ہے:

''یہ دن، میرے خیال میں، آنے والے تمام ادوار میں سب سے زیادہ
شہرت کا حامل رہے گا۔ کیونکہ اس نے ہمارے دکھوں اور
مصیبتوں کو سرور وانبساط میں تبدیل کر دیا ہے۔ آج کا دن
مسیحیت کے حق بجانب ہونے اور کفر کی تکذیب کا دن ہے۔
آج کا دن احیائے دین کا دن ہے۔ یہی وہ دن ہے جو خدا نے ہمارے
لئے بنایا ہے۔ ہمیں آج مسرت وشادمانی کا اظہار کرنا چاہیے۔
کیونکہ خدا اپنی قوم پر ظاہر ہوا ہے اور اس نے اسے اپنی برکت سے
معمور کیا ہے۔'' (5)

یہ تصور بہت جلد پورے یورپ میں پھیل گیا اور لوگ مطمئن ہو گئے ورنہ قتل عام کی خبریں سن کر وہ خوف زدہ ہو گئے تھے۔ صلیبی جہاد ایک خوش کن عقایدہ تھا تمام تر دشواریوں اور مزاحمتوں کے خلاف اس کی کامیابی نے لوگوں کو یقین دلا دیا کہ خدا کی خوشنودی اس اقدام میں شامل ہے۔ اگلے دس برسوں کے دوران پہلی صلیبی جنگ کا احوال تین مشہور مسیحی مورخین نے لکھا۔ انمیں نوجنٹ کا راہب گلبرٹ، راہب رابرٹا ور بورجیئل کا بالڈریک شامل ہیں۔ یہ لوگ صلیبی لشکریوں کے جذبہ جہاد کی زبردست تعریف کرتے ہیں۔ اب تک مسلمانوں کو نسبتاً غیر جانبدار سمجھا جاتا تھا۔ لیکن صلیبی جنگ کے بعد مغرب میں انہیں ''قابل نفرت اور خبیث نسل'' قرار دیا جانے لگا جو خدا کو نہیں مانتے تھے اور ختم کر دیئے جانے کے قابل تھے۔ (6) جس طرح مصر سے اسرائیلیوں کا خروج خدا کا کام تھا اسی طرح صلیبی جنگ کو خدا کا اقدام کہا گیا۔ چونکہ صلیبی جہاد میں فرانکوں نے نمایاں کردار ادا کیا تھا چنانچہ فرانک اب خدا کے نئے منتخب کردہ لوگ تھے۔ انہوں نے وہ فریضہ سرانجام دیا تھا جو

یہودی بھول چکے تھے۔(7) راہب رابرٹ نے ایک حیرت انگیز دعوی کیا۔اس کا کہنا تھا کہ صلیب کے واقعہ کے بعد یروشلم کی تسخیر تاریخ عالم کا سب سے بڑا واقعہ ہے۔(8) جلد ہی مسیح کے دشمن یروشلم میں داخل ہوں گے اور آخری دنوں کی جنگ شروع ہوجائے گی۔(9)

''لیکن الہامی فتوحات رونما ہونے سے پہلے اگر شہر کی تطہیر نہ کی گئی تو صلیبی مجاہدین کی کارروائیاں کوئی اہمیت نہیں رکھیں گی۔'' الصور کا ولیم بتاتا ہے کہ نعشوں کو پھرتی سے جلایا گیا تاکہ مقدس مقامات تک پہنچنے کے لئے راستے صاف ہو جائیں۔(10) لیکن یہ کام خاصا دشوار اور طویل تھا۔ پانچ مہینے بعد بھی شہر کے گرد انسانی لاشیں پڑی ہوئی تھیں، جب چارٹریس کا فلچر اس سال کرسمس منانے کے لئے یروشلم پہنچا تو صورت حال دیکھ کر خوف زدہ ہوگیا۔

''اوہ۔۔۔۔۔یہاں کس قدر تعفن پھیلا ہوا ہے۔شہر کے اندر اور باہر
دیواروں کے پاس ان مسلمانوں کی لاشیں گل سڑ رہی ہیں جنہیں ہم
نے شہر پر قبضہ کرتے ہوئے قتل کیا تھا۔ جہاں پر کوئی تلوار کے نیچے
آیا،اس کی لاش ابھی تک وہیں پڑی ہے۔'' (11)

صلیبی لشکریوں نے انسانوں سے بھرے شہر کو راتوں رات ایک بدبودار مردہ خانہ میں تبدیل کر دیا تھا۔قتل عام کے تین دن بعد جب صلیبیوں نے بازار لگایا تو متعفن لاشوں کے انبار گلیوں میں موجود تھے۔انتہائی جوش وخروش اور تقریباتی انداز میں انہوں نے لوٹ کا مال ایک دوسرے کو فروخت کیا۔انہیں اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی کہ انہوں نے کس قدر خون ریزی کی ہے اور اس کا نفرت انگیز ثبوت ان کے قدموں تلے کراہ رہا ہے۔اگر اپنے پیشروؤں کے مقدس حقوق کا احترام یروشلم کے کسی توحید پرست فاتح کے ایمان کا امتحان ہوسکتا ہے تو صلیبی لشکری اس میں بری طرح ناکام رہے تھے۔

انہوں نے شہر پر قبضہ کرنے کے علاوہ کوئی بات نظر میں رکھی ہی نہیں تھی۔اب وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ اگلا قدم کیا اٹھائیں؟ شہر پر حکومت کیسے کی جائے؟ پادریوں کا خیال تھا کہ شہر پر ایک اسقف اعظم مذہبی بنیادوں پر حکومت کرے۔ نائیٹس چاہتے تھے کہ ان میں سے کوئی فرد حکمران بنایا جائے۔ جب کہ عام اور غریب لشکری جن کا صلیبیوں پر بھرپور اثر اور دباؤ تھا، نئے یروشلم کے متمنی تھے اور شہر میں کسی روایتی حکومت کے حق میں نہیں تھے۔طویل بحث مباحثہ کے بعد طے کیا گیا کہ چونکہ یونانی تقلید پسند اسقف اعظم کو مسلمانوں نے محاصرہ کے دوران شہر سے نکال دیا تھا چنانچہ اس منصب پر سب سے پہلے کسی کا تقرر کر دیا جائے اور پھر نارمنڈی کے آرنلف کو یروشلم کا اسقف اعظم مقرر کر کے ایک یونانی کی جگہ لاطینی کو یہ منصب دے دیا گیا۔ پھر انہوں نے بولون کے گاڈفرے کو اپنا قائد منتخب کر لیا۔ یہ شخص ذہین تو نہیں تھا لیکن ایک پرہیزگار

اور جرات مند نوجوان تھا۔ گاڈفرے نے اعلان کر دیا کہ وہ اس شہر میں سونے کا تاج نہیں پہنے گا جہاں اس کے نجات دہندہ نے کانٹوں کا تاج پہنا تھا۔ اس نے اپنے لئے ''مزار مقدس کے محافظ'' کا خطاب پسند کیا۔ شہر پر حکمرانی اسقف اعظم کی ہوگی لیکن وہ (گاڈفرے) اسے عسکری تحفظ فراہم کرے گا۔ چند ماہ بعد پیسا کا آرک بشپ، ڈیمبرٹ، پاپائے اعظم کے نائب کی حیثیت سے یروشلم پہنچا۔ اس نے آتے ہی آرنلف کو معزول کر دیا۔ خود اسقف اعظم کا منصب سنبھالا اور ''حیات نو'' اور یروشلم کے دیگر گرجوں سے یونانی، یعقوبی، نسطوری جارجیائی اور آرمینائی پادریوں کو نکال دیا۔ پوپ اربن نے صلیبی لشکروں کو مشرقی عیسائیوں کی مدد کا حکم دیا تھا لیکن اب وہ شہر میں اپنے پیشروؤں کا تعصب اور عدم رواداری خود اپنے مذہب کے لوگوں تک پھیلا رہے تھے۔۔۔۔ 1100ء کے ایسٹر کے موقع پر اتوار کے روز گاڈفرے نے مینار داؤد اور یروشلم کے تمام متعلقات سمیت شہر اسقف اعظم کے حوالے کیا (12) اور خود یروشلم کی مملکت کے لئے مزید سرزمین کے حصول کی عسکری مہم جوئی کا ارادہ ظاہر کیا۔

صلیبیوں کے لئے یہ کام بہت ضروری تھا۔ یروشلم کی تسخیر کے بعد پورے فلسطین کو کلیسیا کے لئے آزاد کرانا تھا۔ ملک کے بہت سے حصے جن میں اہم ساحلی شہر بھی شامل تھے، ابھی تک فاطمیوں کے قبضہ میں تھے۔ گاڈفرے نے پیسا کے بحری بیڑے کی پشت پناہی کے ساتھ فاطمیوں کے مراکز پر حملے کرنا شروع کر دیئے۔ مارچ 1100ء میں اسقلون، قیصریہ، عکرہ اور ارسوف کے امیروں نے گاڈفرے کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ ماورائے اردن کے شیوخ نے بھی ان کی پیروی کی اور گاڈفرے کو اپنا فرماں روا تسلیم کر لیا۔ ان علاقوں پر مشتمل ایک ریاست گلیلی تشکیل دے دی گئی۔ ابھی تک صورت حال غیر یقینی تھی۔ اگرچہ مملکت کے پاس اب قابل دفاع سرحدیں تھیں۔ لیکن اسے اگلے چوبیس برس تک اپنی بقا کے لئے سخت جدوجہد کرنا پڑی کیونکہ یہ سخت خوقسم کے دشمنوں میں گھری ہوئی تھی۔

صلیبیوں کا سب سے بڑا مسئلہ افرادی قوت تھا۔ یروشلم حاصل کر لینے کے بعد سپاہیوں کی اکثریت یورپ کو واپس چلی گئی اور پیچھے معمولی سی فوج رہ گئی۔ یروشلم بالخصوص ویران پڑا تھا۔ اس میں کچھ ہی دن پہلے ایک لاکھ نفوس آباد تھے۔ لیکن اب یہ بھوتوں کا بسیرا بن چکا تھا۔ خالی گھروں میں صرف چند سو افراد رہ رہے تھے۔ الصور کے ولیم نے لکھا ہے: ''ہمارے ملک کے لوگ تعداد میں بہت کم مگر ضرورت مند تھے مشکل سے ایک گلی بھری جا سکی۔ (13) وہ تحفظ کے لئے مرقد مسیح کے گرد اسقف اعظم کے علاقہ میں مقیم تھے۔ (14) بقیہ تمام شہر غیر آباد تھا۔ شہر کی گلیاں سنسان پڑی رہتی تھیں۔ ان میں راتوں کو اٹھائی گیر اور بدوی بچا کھچا سامان چرانے کے لئے دبے پاؤں پھرتے رہتے تھے۔''

یروشلم کا دفاع مناسب انداز میں کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے لئے ضروری افرادی قوت موجود ہی نہیں تھی۔ ایک دفعہ جب گاڈفرے اپنے سپاہیوں کو لے کر عسکری مہم کے لئے نکلا تو پیچھے صرف چند غیر جنگجو اور زائرین تھے جو شہر پر کسی ممکنہ حملہ کی مدافعت کے لئے رکھے گئے۔ امن و امان بحال ہوا تو مسلمان اور یہودی بیروت، صیدا، الصور اور مکہ کے شہروں

سے واپس آنے لگے۔ مسلمان کسان دیہاتوں میں ہی رہے۔ یروشلم کے فاتح صلیبیوں نے یہودیوں اور مسلمانوں کو مقدس شہر میں آنے سے روک دیا اور ایک قانون کے ذریعے ان کے داخہ پر پابندی عائد کر دی گئی۔ مقامی عیسائیوں کو بھی شہر سے نکال دیا گیا۔ صلیبیوں کو شبہ تھا کہ وہ اسلام کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں اور مسلمانوں سے ساز باز کر سکتے ہیں۔ گنوار یورپیوں کے لئے ان شامی، فلسطینی اور قبطی عیسائیوں اور عربوں میں امتیاز کرنا مشکل تھا۔ شہر کی تقدیس کے پیش نظر کچھ فرانک یروشلم میں رہنا چاہتے تھے لیکن یہ شہر اب اپنی اصلی صورت کا محض دھندلا عکس تھا۔ زیادہ تر فرانکوں نے داحلی شہروں میں رہنے کو ترجیح دی۔ وہاں زندگی آسان تھی اور تجارت اور کاروبار کے مواقع بھی زیادہ تھے۔

شہر کی تسخیر کے فوراً بعد گاڈفرے مسجد اقصیٰ میں منتقل ہو گیا۔ اسے سرکاری رہائش گاہ قرار دے دیا گیا۔ اس نے قبتہ الصخرہ کو گرجا میں تبدیل کر کے اس کا نام خداوند کا معبد رکھ دیا۔ حرم صلیبیوں کے لئے بہت اہم تھا۔ بازنطینیوں نے یروشلم کے اس حصہ میں کبھی دلچسپی نہیں لی تھی۔ لیکن صلیبی لشکریوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ خدا کے نئے منتخب کردہ لوگ ہیں۔ چنانچہ یہودیوں کے مقدس مقام پر ان کا موروثی حق ہے۔ ابتدا ہی سے اس نے صلیبی مجاہدین کی روحانی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا چنانچہ ڈیمبرٹ، اسقف اعظم نے خداوند کے معبد کو ہی اپنی سرکاری رہائش گاہ بنایا تھا۔ صلیبی قائدین کی نظر میں حرم کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسقف اعظم اور اس کے ''محافظ'' نے اس الگ تھلگ مقام پر رہنا پسند کیا تھا حالانکہ وہ مغربی پہاڑی پر صلیبیوں کی رہائش گاہوں سے بہت دور تھا۔ ان کے قریبی پڑوسی سیاہ پوش راہب تھے جنہیں گاڈفرے نے وادی قدرون سے مقدس کنواری مریم کے مزار میں منتقل کر دیا تھا۔ سیاہ پوش سینٹ بنی ڈکٹ کے مقلدین تھے اور سیاہ لبادے میں رہنا پسند کرتے تھے۔

گاڈفرے کا دور بہت مختصر رہا۔ جولائی 1100ء میں وہ ٹائیفائیڈ بخار سے انتقال کر گیا۔ اسے حیات نو یادگار کے احاطہ میں دفن کیا گیا۔ صلیبی قائدین حیات نو یادگار کو ''گرجا مزار اقدس'' کہنا پسند کرتے تھے۔ اسقف اعظم ڈیمبرٹ مذہبی اور سیاسی دونوں قیادتیں سنبھالنا چاہتا تھا لیکن اسے گاڈفرے کے بھائی بالڈوین کے حامیوں کی سیاسی حکمت عملی نے ناکام بنا دیا۔ وہ آرمینیا کی صلیبی ریاست ایڈیسا کا نواب تھا۔ اسے اس کے ہموطنوں نے یروشلم بلا لیا۔ بالڈوین اپنے بھائی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذہین اور جہاندیدہ تھا۔ جوانی میں ہی کلیسیائی تعلیم حاصل کر لینے کی بدولت وہ تمام لوگوں سے زیادہ پڑھا لکھا تھا۔ اس کا بھاری قد و قامت بھی اسے نمایاں بنا دیتا تھا۔ اس کی سیاسی قیادت یروشلم کی صلیبی مملکت کو استحکام دے سکتی تھی۔ بالڈوہین جب 9 نومبر 1100ء کو یروشلم میں پہنچا تو اس کا پرجوش استقبال کرنے والوں میں فرانک ہی نہیں مقامی عیسائی بھی شامل تھے جو شہر کے باہر اس کے انتظار میں تھے۔ بالڈوین نے سمجھ لیا تھا کہ اگر فرانکوں کو مشرق قریب میں رہنا ہے تو انہیں مقامی حلیفوں کی ضرورت رہے گی۔ چونکہ یہودیوں اور مسلمانوں سے دوستی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا چنانچہ یونانی، شامی، آرمینیائی اور فلسطینی عیسائی ہی ایسے لوگ ہیں جن سے فطری اتحاد ہو سکتا ہے۔ بالڈوین کی اپنی بیوی

آرمینیائی تھی۔اسے مشرقی عیسائیوں کا اعتماد بھی حاصل تھا جن کے ساتھ ڈیمبرٹ توہین آمیز سلوک روا رکھتا تھا۔

11 نومبر کو بالڈوین کی تاجپوشی ''لاطینیوں کے بادشاہ'' کی حیثیت سے بیت لحم کے گرجا ''مولد مقدس'' میں ہوئی۔ بیت لحم کو بادشاہ داؤد کا شہر بھی کہا جاتا تھا۔ بالڈوین کو یروشلم میں سونے کا تاج پہننے اور بادشاہ کہلانے میں کوئی عار نہیں تھی۔اس کی قیادت میں صلیبی محاربین ایک کے بعد دوسری فتح حاصل کرتے گئے۔ یروشلم کی تسخیر کے بعد صلیبی لشکریوں کو مجاہدین کی بجائے محاربین کہا گیا۔ 1110ء تک بالڈوین نے قیصریہ، حیفہ، یافہ، ترپیولی، صیدا اور بیروت پر قبضہ کر لیا۔ صلیبیوں نے اب ایک اور ریاست قائم کر لی۔اسے ترپیولی ریاست کا نام دیا گیا۔ان مفتوحہ علاقوں میں آبادی کو قتل اور مساجد کو منہدم کر دیا گیا۔ فلسطینی مہاجر جان بچانے کے لئے اسلامی سلطنت میں داخل ہو گئے۔اس قتل عام اور غارت گری نے صلیبی محاربین کے لئے یہ بات مشکل بنا دی کہ ایک عرصہ بعد بھی مقامی لوگوں سے اچھے تعلقات قائم کر سکیں۔ صلیبی محاربین کی پیش قدمی مسلسل جاری تھی۔ سلجوق امیر اور مقامی خاندانی حکومتیں مناسب مزاحمت پیش کرنے کے قابل ہی نہیں تھیں۔ وہ ابھی تک ذاتی لڑائی جھگڑوں میں الجھے ہوئے تھے چنانچہ انہیں کوئی متحدہ محاذ بنانا بہت مشکل بلکہ ناممکن محسوس ہوتا تھا۔ بغداد سے بھی کسی اعانت کی امید نہیں تھی۔ خلافت بذات خود ناقابل علاج ضعف میں مبتال تھی اور فلسطین جیسے دور دراز علاقے میں کسی جنگ میں حصہ نہی لے سکتی تھی۔اس صورت حال نے صلیبیوں کو مشرق قریب میں اولین مغربی نو آبادیاں قائم کرنے کے قابل بنا دیا۔

بالڈوین کو ابھی یروشلم کا مسئلہ بھی حل کرنا تھا۔ یہ شہر ابھی تک خالی اور بڑی حد تک بے آباد تھا۔فرانک ابھی تک وہاں سے کھسک کر زیادہ خوشحال ساحلی شہروں میں جا رہے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر کسان، سپاہی، دستکار اور ہنرمند تھے چنانچہ ان کے لئے کسی ایسے شہر میں زندگی گزارنا مشکل تھا جس کا انحصار مقامی ہلکی پھلکی صنعت پر ہو۔1099ء کے فاتحین نے قانون بنایا تھا کہ جن لوگوں نے صلیبی جنگ میں حصہ لیا ہے وہ یروشلم کی زمینوں، گھروں اور ان گھروں میں رکھی چیزوں کے مالک بننے کے مجاز ہیں۔۔۔اب وہ یورپ کے جاگیرداری نظام سے آزاد انسانوں کی طرح جائداد کے مالک بن سکتے تھے۔ان میں سے کچھ ''برجیس'' (اس زمانے میں ان کے لئے یہی لفظ استعمال ہوتا تھا) اب یروشلم کے مکانوں یا مضافات میں جاگیروں اور دیہات کے مالک تھے۔انہیں یروشلم سے نقل مکانی کرنے سے روکنے کے لئے بالڈوین نے ایک قانون نافذ کیا جس کے تحت کسی مکان پر اپنے قبضہ کو جائز بنانے کے لئے قابض کو اس میں ایک سال اور ایک دن تک رہائش رکھنا ضروری تھا۔اس قانون نے لوگوں کو روک لیا۔ بحران کے دوران وہ اچھے اور آسودہ وقت کی امید میں مستقل طور پر شہر میں مقیم ہو گئے۔ فرانکوں کے یروشلم میں برجیس شہر کی ریڑھ کی ہڈی ثابت ہو سکتے تھے۔ وہ نان بائی، قصاب، لوہار اور دکاندار کی حیثیت سے کام کر سکتے تھے لیکن وہ اسے کافی نہیں سمجھتے تھے۔

بالڈوین کو امید تھی کہ وہ مقامی عیسائیوں کو یروشلم کے گرجوں اور خانقاہوں میں واپس لے آئے گا۔ 1101ء

میں خدا نے اسے ایسا کرنے کا سنہری موقع فراہم کیا۔ ایسٹر سے ایک رات پہلے ہجوم معمول کے مطابق ''مقدس روشنی'' کے معجزے کا منتظر تھا۔ لیکن کچھ بھی رونما نہ ہوا۔ ملکوتی روشنی نمودار ہونے میں ناکام ہوگئی۔ غالباً یونانی عیسائی یہ راز اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے اور لاطینیوں کو اس سے آگاہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ ناکامی بہت برا تاثر قائم کرسکتی تھی۔ کیا خدا فرانکوں سے کسی وجہ سے ناراض ہوگیا ہے؟ بالاخر فیصلہ ہوا کہ ڈیمبرٹ کی قیادت میں لاطینی ''خداوند کے معبد'' میں جائیں گے جہاں خدا (حضرت) سلیمان کی دعاؤں کا جواب دیا کرتا تھا۔ مقامی عیسائیوں سے کہا گیا کہ وہ بھی دعا میں شامل ہوں۔ اگلی صبح اعلان کیا گیا کہ مزار کے پہلو میں موجود دو قندیلوں میں مقدس روشنی نمودار ہوئی تھی۔ خدائی پیغام بہت واضح تھا۔ آرمینیائی مورخ میتھیو کا دعویٰ ہے کہ ''فرنکوں نے خانقاہوں سے آرمینیائی، شامی، یونانی اور جارجیائی عیسائیوں کو بے دخل کر دیا تھا۔ چنانچہ خدان کی اس حرکت پر ناراض تھا۔ مقدس روشنی اس لئے دوبارہ نمودار ہوئی کیونکہ مشرقی عیسائیوں نے اس کے لئے دعا کی تھی۔(15) مزار مقدس کی چابیاں یونانیوں کے حوالے کر دی گئیں۔ دوسری قوموں کے لوگوں کو اپنی خانقاہوں، گرجوں اور تبرک خانوں میں واپس آنے کی اجازت دے دی گئی۔

اس واقعہ کے بعد یروشلم کا بادشاہ مقامی عیسائیوں کا بھی محافظ بن گیا۔ اعلی درجے کے پادری اب بھی لاطینی تھے لیکن مزار مقدس کے پادری یونانی تھے۔ 1099ء میں مصر کو فرار ہو جانے والے یعقوبی عیسائی جب واپس یروشلم کو واپس آئے تو انہیں میری میگدلینی کی خانقاہ دے دی گئی۔ آرمینیائی خاص طور پر نوازے گئے کیونکہ وہ اب شاہی خاندان کے ارکان تھے۔ بالڈوین نے آرمینیائی لوگوں کے ساتھ خصوصی مراسم پیدا کئے چنانچہ سینٹ جیمز کی ''برادری'' اور راہباؤں کو عروج مل گیا۔ اہم آرمینیائی شخصیات اور ممتاز افراد زائرین کی حیثیت سے جب یروشلم میں آتے تو اپنے ساتھ قیمتی تحائف لاتے۔ ان میں کڑھائی والے ملبوسات، سونے کی صلیبیں، عشائے ربانی کے ساغر اور مصلوب مسیح کے قیمتی پتھروں سے مزین مجسمے شامل ہوتے تھے۔ یہ ابھی تک مذہبی ضیافتوں کے موقع پر استعمال ہوتے ہیں۔ انکے علاوہ درس گاہ کی لائبریری کے لئے سونے کے پانی سے لکھے مخطوطے ہوتے تھے۔ مزار اقدس سے منسلک سینٹ میری کا گرجا بھی آرمینیائی عیسائیوں کی تحویل میں دے دیا گیا۔

بالاخر 1115ء میں بالڈوین یروشلم میں آبادکاری کا مسئلہ حل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے ماورائے اردن سے عیسائیوں کو شہر مقدس میں بلا لیا جو صلیبی محربین کی اذیت رسانیوں کی وجہ سے عالم اسلام میں ''ناپسندیدہ شخصیات'' قرار دے دیئے گئے تھے۔ بالڈوین نے انہیں خصوصی مراعات دینے اور شہر کے شمال مغربی گوشے میں آباد کرنے کا لالچ دے کر واپس آنے پر مائل کیا۔ انہیں اپنے استعمال کے لئے نئے گرجا تعمیر کرنے اور پرانے گرجوں کی مرمت کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ انہوں نے ستفنس کے دروازے کے پاس سینٹ ابراہم اور اسقف اعظم کے علاقہ میں سینٹ چارج، سنیٹ الیاس اور سینٹ جیکب کے نام سے گرجے تعمیر کر لئے۔

بالڈوین کی پالیسی واقعی نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ کیونکہ اس مرحلہ کے بعد یروشلم نے خوب ترقی کی اور اس کی آبادی بھی تیس ہزار نفوس تک پہنچ گئی۔ یہ ایک بار پھر دارالحکومت اور فرانکوں کی تمام ریاستوں میں مذہبی نسبت رکھنے کی وجہ سے عروس البلاد تھا۔ یہ صورت حال یروشلم میں ایک نئی زندگی اور ایک نیا ولولہ لائی۔ اب یہ مغربی شہروں کی طرح منظّم تھا۔ اسلامی شرعی عدالت کی بجائے دیوانی اور فوجداری مقدمات کے لئے تین عدالتیں قائم کر دی گئیں۔ ان میں ایک ہائی کورٹ شرفاء اور رؤسا کے لئے تھی۔ دوسری عدالت برجیس آبادی اور شامیوں کے لئے جب کہ تیسیری عدالت نسبتاً کم درجہ کی تھی جس میں مقامی عیسائیوں کے مقدمات فیصل ہوتے تھے۔ اس کے منصف بھی مقامی عیسائی تھے۔ صلیبی حکمرانوں نے وہ بازار بحال رکھے جو قدیم رومن فورم میں مزار مقدس کے پہلو میں اور مرکزی شارع کے ساتھ تھے۔ انہوں نے غالباً ''سوق'' کا انتظام مقامی عیسائیوں سے سیکھ لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گوشت، ملبوسات، مصالحوں اور دیگر سامان ضرورت کے بازار الگ الگ رکھنے کا مشرقی نظام برقرار رکھا گیا۔ فرانک اور شامی ایک جگہ تجارت کرتے تھے۔ لیکن ان کی دکانیں بازار میں ایک دوسرے کے سامنے تھیں۔ یروشلم کبھی بھی تجارتی مرکز نہ بن سکا کیونکہ یہ مرکزی شاہراہوں سے بہت فاصلہ پر واقع تھا۔ اطالوی شہروں سے آنے والے تاجروں نے ساحلی شہروں میں اپنے مستقر بنا رکھے تھے اور فلسطین میں شہری مراکز قائم کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ چنانچہ یروشلم ۔۔۔۔۔ ہمیشہ کی طرح سیاحوں کی تجارت کا مرہون منت رہا۔ بالڈوین پادریوں کی تجویز سے متفق نہیں تھا کہ شہر کو مذہبی بنیادوں پر چلایا جائے۔ جب اس نے ڈیمبرٹ سے چھٹکارا پا لیا تو ہمیشہ ایسے اسقف اعظم منتخب کئے جو ثانوی اور ماتحت قسم کے کردار پر قانع رہتے تھے۔(16) 1112ء سے اسقف اعظم کو عیسائی علاقے میں مکمل بالادستی حاصل تھی اور بالڈوین بقیہ تمام شہر پر حکمران تھا۔ یہ مملکت ہم عصر یورپی ریاستوں کے برعکس کلیسیائی گرفت سے آزاد تھی۔

MAP (نقشہ)

معبدیوں کی یہ مہر صلیبی جہاد کی یاد میں تیار کی گئی تھی۔
ایک گھوڑے پر دو سپاہی اس دور کی عکاسی ہے جب غریب صلیبی
مجاہدین ابھی یروشلم کی دولت و اقتدار پر قابض نہیں ہوئے تھے۔

MAP (نقشہ)

مسیحی یروشلم

1099-1187ء

www.HallaGulla.com

حالات کی ستم ظریفی یہ تھی کہ مذہبی جنون کے ساتھ آنے والے صلیبی مجاہدین کا شہر یروشلم ایک سیکولر مقام بن گیا۔ جوں ہی فرانکوں کو استحکام ملا انہوں ے اسے مغربی شہر کا رنگ دینا شروع کر دیا۔ اس کا آغاز انہوں نے قبتہ الصخرہ سے کیا۔ فرانکوں کے یروشلم میں یہ اہم مقام کی ایک اور علامت تھا۔ صلیبیوں کو اس عمارت کی تاریخ کا زیادہ علم نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ وہ معبد تو بہر حال نہیں جسے ''سلیمان بادشاہ'' نے تعمیر کیا تھا۔ البتہ شہنشاہ قسطنطین یا ہرقل میں سے کسی نے معبد کے مقام پر خوبصورت عمارت بنائی تھی جسے مسلمان اپنے استعمال میں لے آئے۔ 1115ء میں انہوں نے اس کی قدیم تقدیس بحال کرنے کا منصوبہ شروع کیا۔ قبتہ الصخرہ پر ایک صلیب نصب کی گئی۔ چٹان پر سنگ مرمر چسپاں کیا گیا۔ اب داخلی منظر کسی قربان گاہ اور سماع خانہ جیسا تھا۔ داخلی محرابوں پہ کندہ آیات قرانی پر انجیل کی لاطینی آیات کے کتبے لگا دیئے گئے۔ یہ ایک مخصوص صلیبی اقدام تھا۔ جس کا مقصد مسلمانوں کی موجودگی کے آثار کو چھپانا تھا۔ تمام کام نہایت ہنرمندی سے کیا گیا۔ چٹان کے گرد بنائی جانے والی ضریح قرن وسطیٰ کی عمدہ تریں صناعی کا ایک نمونہ تھی۔ اس تمام کام میں برسوں لگ گئے۔ ''خدا کا معبد'' 1142ء تک باقاعدہ مذہبی نوعیت نہ اختیار کر سکا۔ اس نئے گرجا کے شمال میں آگستیوں کے لئے حجرے بنائے گئے اور قبتہ السلسہ کو جیمز زادک سے موسوم گرجا بنا دیا گیا۔ جیمز زادک کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ انہیں اسی مقام پر قتل کیا گیا تھا۔

مسجد الاقصیٰ کو نئی شکل دینے کے لئے ابتدا میں پیسے نہیں تھے۔ یہ حالیہ تسخیر کے دوران بری طرح ٹوٹ پھوٹ اور لوٹ مار کا شکار ہوئی تھی۔ بالڈوین کو مجبور کیا گیا کہ وہ چھت کا سیسہ اتار کر فروخت کر دے۔ لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ 1118ء میں نائٹس کے ایک چھوٹے سے گروہ نے جو خود کو ''یسوع مسیح کے غریب سپاہی'' کہلاتا تھا، خود کو بادشاہ (بالڈین) کے رُوبرو پیش کیا اور کوئی مذہبی خدمت چاہی۔ وہ فلسطین کی سڑکوں پر نہتے زائرین کو بدویوں اور دیگر مسلمان ''بدمعاشوں'' سے محفوظ رکھنے کے لئے پولیس کا کام کر سکتے تھے۔ صلیبی مملکت کو اس انتظام کی شدید ضرورت تھی۔ چنانچہ بالڈوین نے انہیں اپنا صدر دفتر بنانے کے لئے مسجد اقصیٰ کا ایک حصہ دے دیا۔ ''خداوند کے معبد'' کے قریب رہنے کی وجہ سے انہیں سب لوگ ''معبدی'' کہتے تھے۔(17) اب تک راہبوں کو اصلحہ رکھنے اور لڑائی کرنے کی ممانعت تھی۔ لیکن جب کلیسیا نے

معبدیوں کو سرکاری طور پر محافظ قرار دے دیا تو ''مقدس تشدد۔۔۔۔۔'' کسی حد تک ۔۔۔ مذہبی طور پر جائز ہو گیا۔ اب یہ سپاہی راہب یورپ کے دو عظیم جذبوں کے امین تھے۔۔۔ عبادت اور جنگ۔۔۔۔۔ انہیں بہت جلد بہت سے رضا کار مل گئے۔ ان کی بھرتی سے مملکت کو درپیش افرادی قوت کی کمی کا بہت پرانا مسئلہ حل کرنے میں مدد ملی۔ 1120ء کے عشرہ میں معبدی صلیبی افواج کا ایک ممتاز حصہ بن گئے، لیکن اب وہ اپنے اصل اور خالصتاً دفاعی عسکری مقاصد ترک کر چکے تھے۔

بدقسمتی سے معبدی بہت جلد امیر ہو گئے اور کلیسیا کے طاقتور طبقات میں شمار کئے جانے لگے۔ وہ اقصیٰ میں اپنے صدر دفتر کی تزئین و آرائش کے قابل ہو چکے تھے۔ مسجد اقصیٰ ان دنوں فوج کے استعمال میں تھی۔ ہیرودیس کے زمانہ کے تہہ خانے اصطبل کے طور پر استعمال ہو رہے تھے۔ انہیں بادشاہ سلیمان کے اصطبل کہا جاتا تھا جن میں ایک ہزار سے زائد گھوڑے، سائیسوں کے ساتھ رکھے جا سکتے تھے۔ مسجد کے صحن میں دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں تاکہ اضافی کمرے میسر آ جائیں۔ گودام اصلحہ اور کوٹھی خانے بھی فوج کے استعمال میں تھے۔ چھت پر باغیچے، پیویلین اور حوض تھے۔ معبدیوں نے مسجد کے مغربی بازو میں اضافہ کر کے اس میں ایک برآمدہ، ایک طعام خانہ اور تہہ خانے بنا لئے تھے۔ انہوں نے ایک نئے شاندار گرجا کی بنیادیں بھی استوار کر دی تھیں لیکن یہ کبھی بھی مکمل نہ ہو سکا۔ مسجد اقصیٰ میں ہونے والا کام بھی اعلیٰ درجہ کی ہنرمندی کا عکاس تھا۔ بالخصوص سنگ تراشی میں بیل بوٹوں کے نمونے بازنطینی، اسلامی اور رومن انداز کا قابل دید امتزاج پیش کرتے تھے

MAP (نقشہ)

یسوع کے آخری سفر کی یاد میں زائرین کا جلوس شاہراہ الم سے گزر رہا ہے۔
ان زائرین کی طرح صلیبی مجاہدین بھی سمجھتے تھے کہ وہ مسیح کے نقش قدم
پر چل رہے ہیں۔ لیکن صلیب کے پیروکاروں نے یروشلم کے نام پر تلوار اٹھالی۔

معبدیوں نے صلیبی یروشلم کے بنیادی میلان کی تمثیل پیش کی۔ صلیبی جہاد کو محبت کا اقدام سمجھا گیا تھا۔ پوپ نے یورپ کے سرداروں اور جاگیرداروں کو اسلامی دنیا میں موجود اپنے عیسائی بھائیوں کی مدد کا حکم دیا تھا۔ ہزاروں صلیبی مجاہد، یسوع کی محبت میں اس کے پدری ورثے کو کافروں سے آزاد کرانے کوشش میں مارے گئے تھے۔ صلیبی جہاد کو غیر کلیسیائیوں

کے لئے راہبانہ زندگی گزارنے کے ایک راستہ کے طور پر بھی دیکھا گیا تھا۔ (18) لیکن اس محبت کا اظہار تشدد اور ایذا رسانی کی صورت میں ہوا۔ معبدیوں کے ابتدائی کردار میں ہی انسانی ہمدردی اور درماندہ لوگوں کے لئے دردمندی کی جگہ عسکری جارحیت داخل ہوگئی۔ حرم میں ہر قسم کی ہنگامہ آرائی اور تشدد ممنوع تھا۔ لیکن اب مسجد اقصیٰ کو ایک بیرک اور اسلحہ خانہ میں تبدیل کیا جا چکا تھا۔ جلد ہی معبدیوں کے گول گرجے، حیات نو کی طرز پر پورے یورپ کے شہروں اور قصبوں میں نمودار ہو گئے۔ اس طرح عیسائیوں کو یاد دلایا جا رہا تھا کہ تمام عیسائی دنیا کو یروشلم کے دفاع کی مقدس جنگ کے لئے متحرک کر دیا گیا ہے۔

یہی طرز عمل ہمیں معبدیوں کے حریف ''ہمدردوں'' امور خیر کی مجلس کے ارکان کے ہاں نظر آتا ہے۔ ان کا مرکز اسقف اعظم کے علاقہ میں سینٹ جان کے لاطینی شفا خانہ میں تھا۔ جیرارڈ ایبٹ نے یروشلم کے محاصرہ کے دوران صلیبی مجاہدین کی مدد کی تھی۔ اس نے شہر کی تسخیر کے بعد فوجی طرز پر قائم امور خیر کی مجلس میں شمولیت اختیار کر لی۔ یہ مجلس بھی چند سرداروں اور زائرین نے بنائی تھی تا کہ غریب اور ضرورت مند افراد کی مدد کی جا سکے۔ قبل ازیں یورپ کے سرداروں اور نوابوں نے کبھی بھی نرسنگ جیسے معمولی کام کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ لیکن جیرارڈ کی سربراہی میں انہوں نے اپنی خدمات رضا کارانہ طور پر پیش کیں۔ معبدیوں کی طرح ہمدردوں نے بھی مقدس غربت کے نظریہ کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔ بہت جلد انہیں فلسطین اور یورپ میں فلاحی کام کرنے والوں کی ایک معقول تعداد میسر آ گئی۔ 1118ء میں جیرارڈ کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ رے منڈ کو مجلس کا سربراہ بنا دیا گیا۔ رے منڈ، لی پوے کا رہنے والا تھا۔ اس نے مجلس کو خوب ترقی دی لیکن اس کی قیادت میں معبدیوں کے برعکس ہمدردوں کی توجہ کا مرکز یروشلم ہی رہا۔ ان کے دور میں سمندر پار کا لفظ یورپ کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ بارہویں صدی کے وسط میں ہمدرد بھی جنگجو بن گئے اور صلیبی لشکروں میں شامل ہو کر لڑتے رہے۔ اگرچہ ان کی ہمدردی کے نصب العین پر عسکریت غالب آ گئی لیکن انہوں نے اپنا بنیادی مطمح نظر ترک نہ کیا۔ انہوں نے مزار مقدس کے جنوب میں ایک بہت بڑا اور شاندار شفا خانہ تعمیر کیا اس میں ایک سال کے دوران تقریباً ایک ہزار مریضوں کا علاج کیا جاتا اور غریبوں اور ناداروں میں کپڑے، کھانا اور خیرات تقسیم کی جاتی۔ مزار مقدس سے ایک پتھر کے فاصلہ پر یہ ہسپتال ''صلیبی بھائیوں'' کا پرکشش چہرہ پیش کرتا تھا۔

زائرین اس ہسپتال سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ ان کے سامنے ایک مختلف یروشلم کے خدوخال ابھرتے۔ مثلاً بازنطینی دور میں انہیں کوہ معبد کی طرف جانے کی تحریک نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس مقام کو محض یہودیت کی شکست کی علامت کے طور پر دیکھتے تھے۔ ان کی مذہبی رسوم میں اس کا کوئی کردار نہیں ہوا کرتا تھا۔ لیکن 1120ء میں جب برطانوی زائر سائی ولف یروشلم میں آیا تو اسے بڑے فخر کے ساتھ حرم کی عمارتیں دیکھنے کا مشورہ دیا گیا۔ اس مقام کو اب مسیحی اہمیت دی جا چکی تھی مثلاً باب الرحمت کے بارے میں کہا جانے لگا تھا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں کنواری مریم کا باپ یہوقیم اور ماں انا پہلی مرتبہ

ملے تھے۔حرم کے دوسرے دروازوں میں سے ایک ''خوبصورت دروازہ'' کہلاتا تھا۔ یہاں سینٹ پیٹر اور سینٹ جان نے ایک کوڑھی کو شفا بخشی تھی۔قبتہ الصخرہ کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس معبد میں یسوع نے زندگی بھر عبادت کی تھی۔''یسوع کے قدموں کے نشان چٹان پر دیکھے جا سکتے تھے۔'' حرم نے صلیبی مجاہدین کی اختیار کردہ مذہبی رسوم میں بھی اہم کردار ادا کیا۔(19) ان کی تمام بڑی تقریبات میں ایک جلوس بھی شامل ہوتا تھا جو''خداوند کے معبد'' کو جاتا تھا۔ پام سنڈے کی مذہبی تقریبات کا مرکز بھی اب یہی تھا۔شہر میں عقیدتوں کے مراکز میں بھی ایک بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔متعدد مقدس مقامات جو پہلے کوہ زیہون پر تھے،اب شہر کے شمال میں منتقل ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔مثلاً زائر سائی ولف کے بیان کے مطابق وہ ستون جس سے باندھ کر حضرت مسیح کو کوڑے مارے گئے تھے۔مزار مقدس کے گرجا میں تھا حالانکہ سابق مورخین اس کا مقام کوہ زیہون بتاتے ہیں۔زائرین کو اب یہ بتایا جا رہا تھا کہ پریتورین جہاں پیلاطس نے حضرت مسیح کو موت کی سزا سنائی، وادی الوعد میں نہیں بلکہ کوہ معبد کے شمال میں پایا جاتا تھا۔اس جگہ پر بعد میں انتونیہ کا قلعہ بنایا گیا۔اس تبدیلی کے محرک یقیناً معبدی ہوں گے جو یروشلم کے اپنے علاقے کو اہمیت دینے کے لئے اسے مقدس مقامات سے منسوب کرنا چاہتے تھے۔

بالڈوین 1118ء میں مر گیا۔اس کی جگہ اسی کا چچازاد بھائی،ادیسہ کا نواب، بالڈوین ثانی کے نام سے تخت نشین ہوا۔ وہ ایک نیک اور خود مزاج آدمی تھا۔لیکن اس کی توجہ کا مرکز اس کی آرمینیائی بیوی اور چار بیٹیاں تھیں۔ بالڈوین ثانی پہلا بادشاہ تھا جس نے بیت لحم کے باسلیق کی بجائے یروشلم میں مزار مقدس کے گرجا میں تاجپوشی کی رسم منعقد کی۔اس کا جلوس مشرقی انداز کے پارچات سے مزین و آراستہ گلیوں میں سے گزرتا ہوا،''مرقد مسیح'' پہ پہنچا، جہاں اس نے مملکت یروشلم کے کلیسیا، پادریوں،یتیموں، بیواؤں اور ناداروں کے تحفظ کا عہد کیا۔اس نے اسقف اعظم سے وفاداری کا خصوصی حلف بھی اٹھایا۔حلف برداری کی تقریب کے بعد بادشاہ جلوس کی قیادت کرتا ہوا خداوند کے معبد میں پہنچا۔وہاں اس نے اپنا تاج قربان گاہ پر رکھا اور شہر کے برجیسوں کی طرف سے مسجد اقصیٰ میں دی گئی ضیافت میں شریک ہوا۔ 1120ء میں بالڈوین اقصیٰ کو چھوڑ کر شہر پناہ کے قریب نئے محل میں منتقل ہو گیا۔اب مسجد اقصیٰ پوری طرح معبدیوں کی تحویل میں تھی جب کہ بالڈوین یروشلم کے صلیبی مرکز میں آ گیا تھا۔

1120ء میں ہی بالڈوین نے نابلوس میں منعقدہ کونسل میں شرکت کی۔کونسل نے کوشش کی کہ نئی نسل کو مقامی ثقافت میں جذب ہونے سے بچایا جائے۔صلیبی مملکت کے ابتدائی برسوں میں ایک دفعہ چارٹرس کے فلچر نے یورپی لوگوں سے کہا تھا''مغرب کے باسیو ہم مشرقی ہو چکے ہیں۔کل کے اطالوی اور فرانسیسی آج پیوند کاری کے سبب گلیلی اور فلسطین کے لوگ ہیں۔''(20) یہ بیان یقیناً مبالغہ آرائی پر مبنی تھا۔لیکن اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا تھا کہ فرانک تبدیل ہو چکے ہیں۔ پوری ایک نسل مشرق میں پروان چڑھی تھی اور اس کے ذہن میں یورپ کی کوئی یاد موجود نہیں تھی۔اس نسل کے

لوگ غسل کیا کرتے تھے جس کا رواج یورپ میں سننے کی حد تک بھی نہیں تھا۔ یہ لوگ لکڑی کی جھونپڑیوں کی بجائے پختہ مکانوں میں رہتے اور نرم ریشمی لباس پہنتے تھے۔ ان کی عورتیں مسلمان عورتوں کی طرح نقاب میں رہتی تھیں۔ یورپ کے زائرین کے لئے یہ سب کچھ تکلیف دہ اور پریشان کن تھا۔ فلسطین کے فرانک، مقامی ہوتے جارہے تھے اور ان دنوں چونکہ عالم اسلام میں لوگوں کا معیار زندگی یورپ کے برعکس بہت اونچا تھا چنانچہ یہ مغرب کے کھردرے اور ناتراشیدہ عیسائیوں کی نظر میں ناکارہ اور ناپسندیدہ طرز حیات تھا۔ بہت سے فرانکوں نے اس حقیقت کا ادراک کرلیا تھا کہ انہیں اپنی بقا کے لئے کسی حد تک مقامی روپ میں ڈھلنا پڑے گا۔ انہیں مسلمانوں کے ساتھ تجارت اور معمول کے تعلقات استوار کرنا پڑے تھے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر بالڈوین ثانی نے مسلمانوں اور یہودیوں پر یروشلم میں داخلہ کی پابندی میں بھی نرمی کردی تھی اور اب مسلمانوں کو اجازت تھی کہ وہ اشیائے خورونوش اور سامان تجارت لے کر یروشلم میں آسکتے ہیں اور محدود عرصہ کے لئے شہر میں قیام کرسکتے ہیں۔ 1170ء میں شاہی محل کے قریب مقیم ایک یہودی رنگریز خاندان کا ذکر بھی اس دور کی تحریروں میں ملتا ہے۔

لیکن مقامی ثقافت میں مغربیوں کا انجذاب سطحی تھا۔ 1120ء کے عشرے میں فرانک اپنی مملکت کے اردگرد نئے قلعوں کا ایک حصار تعمیر کرنے اور پرانے قلعے آباد کرنے میں مصروف تھے تاکہ دشمن مسلمانوں کے حملوں کو روکا جاسکے۔ یروشلم کے گرد بھی قلعہ بند گرجے اور خانقاہیں شاہراہ یریحو، حبرون، بیتھنی، بنی سیموئیل (Samwil)، البیراہ اور رام اللہ کے مقامات پر ایک دفاعی حصار بناتی تھیں۔ صلیبی محاربین مغربی عیسائیوں اور اسلام کے درمیان موجود نفرت کی دیواریں گرانے کی بجائے اپنے پڑوسیوں کے خلاف پتھروں کی بڑی بڑی دیواریں بھی کھڑی کررہے تھے۔ انکی مسیحی ریاستیں مصنوعی مغربی حصاروں میں بند مقامی خطے کے لئے اجنبی اور خطرناک بنتی جارہی تھیں۔ یہ جنگجو ریاستیں ہر وقت جارحیت اور تصادم کے لئے تیار رہتی تھیں۔ بارھویں صدی یورپ میں تخلیقی دور بن کر آئی تھی لیکن فلسطین کے صلیبی محاربین کی ریاستوں میں جنگی جنون کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہاں جدت واختراع کے نام پر عسکری تعمیرات اور جنگ وجدل کے نئے نئے منصوبے تھے۔ ان کا عملی جوش وجذبہ مغربی قانون تھا۔ فرانکوں نے مشرق قریب کے عملی وثقافتی خزانوں سے بہرہ ور ہونے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہ کی چنانچہ وہاں ان کی جڑیں گہری نہ ہوسکیں۔ ان کی توانائیوں صرف اور صرف اپنی بقا کے لئے خرچ ہو رہی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے جو معاشرے اپنی ریاستوں میں تشکیل دیئے وہ اپنے ماحول کے خلاف ایک مصنوعی تحفظ میں زندہ تھے۔

صلیبی محاربین نے تخلیقی بننے اور تسخیر کردہ اجنبی ملک میں اپنے آثار ونشانات ثبت کرنے کی کوشش ضرور کی۔ 1125ء میں فرانکوں نے یروشلم میں ایک بہت بڑا تعمیراتی منصوبہ شروع کیا۔ انہوں نے فلسطین میں تعمیراتی شعبہ میں جو کچھ کیا وہ ہیرودیس بھی نہ کرسکا تھا۔ یہ لوگ ارض مقدس میں یورپ تعمیر کرکے خود کو وطن میں ہونے کی تسکین دینا چاہتے

تھے۔ چنانچہ ان کی عمارتوں میں بازنطینی یا مسلم اثرات نہ ہونے کے برابر تھے۔ لیکن ان میں یورپ کے جدید فن تعمیر کی بھی کوئی جھلک نہ تھی۔ انہوں نے وہی رومی طرز تعمیر اپنایا جو یورپ کے رومی مقبوضات میں کلاسکی اور گوتھک دور کے درمیان رائج تھا۔ انہوں نے صلیبی جنگوں سے پہلے یہی دیکھا ہوا تھا۔ سب سے پہلے انہوں نے گرجا مزار مقدس کی وسیع و عریض تعمیر نو کا کام شروع کیا۔ اسے 1149ء میں ان کی تسخیر یروشلم کی پچاسویں سالگرہ کے موقعہ پر مکمل ہونا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے تالاب بیت حصدا کے پہلو میں کنواری مقدسہ مریم کی ماں سینٹ انا سے موسوم ایک گرجا رومی طرز تعمیر کے مطابق شروع کیا۔ اس مقام کو مسیحی علما چھٹی صدی عیسوی سے مقدس مریم کی جائے پیدائش قرار دے رہے تھے۔ اب یہ بنی ڈکٹین (سیاہ پوشوں) کی خانقاہ اور گرجا بن گیا۔ اپنے جبر و تشدد کے باوجود فرانک ابھی کچھ مذہبی و روحانی تفہیم رکھتے تھے۔ سینٹ انا کے گرجا میں ستونوں کی قطار کے ساتھ وسط میں اونچی قربان گاہ فوراً اپنی طرف توجہ مبذول کراتی تھی۔ یہاں سادگی کا مطلب تھا کہ توجہ کسی اور طرف منعطف نہ ہو جائے۔ جب کہ مختلف سمتوں سے گرجا میں اترنے والی روشنی پیچیدہ قسم کے سائے بناتی اور ایک فاصلے کا احساس پیدا کرتی تھی۔

فرانکوں نے قدرون وادی اور کوہ زیتون کے سابقہ چرچ بھی آباد کئے۔ ان میں گرجا گتسمنے اور کنواری مریم کا مزار بھی شامل تھا۔ یہاں صلیبیوں نے ایک خانقاہ اور ایک حجرہ بھی تعمیر کیا۔ ان کی دیواروں پر کندہ کاری اور موزیک قابل دید تھے۔ مقام صعود کا گول گرجا بھی دوبارہ تعمیر کیا گیا اور اس میں جزیرہ باروس کا سفید سنگ مرمر لگایا گیا۔ یہ گرجا صلیبیوں کی دفاعی حکمت عملی کا ایک حصہ اور ان کا مورچہ بن گیا۔ تھیوڈوریک ہمیں بتاتا ہے:

''کافروں سے محفوظ رہنے کے لیے چھوٹے بڑے برجوں کے ساتھ
اس کی قلعہ بندی کی گئی۔ دیواریں اور مورچے بنائے گئے
اور رات کو محافظوں کا گشت ہوتا۔''(21)

ایرانیوں نے 614ء میں ایلیونا کا باسلیق مسمار کر دیا تھا جو دوبارہ تعمیر نہ ہو سکا تھا۔ اس مقام پر صلیبیوں نے دو گرجے بنائے۔ ایک حجرت عیسیٰ کی طرف سے شاگردوں کو خدا کی تعلیم دینے اور دوسرا انجیل مقدس کی منادی کرنے والے حواری کی یاد میں تھا۔ کوہ زیہون کا باسلیق فاطمی خلیفہ الحاکم نے منہدم کر دیا تھا۔ یہ بھی دوبارہ تعمیر نہ ہو سکا تھا۔ اس مادر کلیسیا کو بھی صلیبیوں نے پھر سے تعمیر کیا۔ اس کی عمارت میں متعدد قدیم تبرک خانے بھی شامل کر دیئے گئے۔ ان میں سے ایک ستفنس کی درگاہ بھی تھی۔ یہاں شہید ستفنس کا جسد خاکی یودوکیہ کے گرجا میں لے جانے سے پہلے عارضی طور پر دفن کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں بالا خانہ جس میں یسوع نے آخری رات کا کھانا حواریوں کے ساتھ کھایا تھا۔ اور ''اگلا دروازہ'' عید فسح کی

یادگار جس میں روح اقدس کے صعود کی تصویر بنائی گئی تھی۔ مادر کلیسیا میں شامل کر دیئے گئے۔ اس کے نیچے ''گلیلی کی یادگار'' تھی جہاں یسوع مسیح دوبارہ زندہ ہونے کے بعد حواریوں پر ظاہر ہوئے تھے۔(22) جب اس یادگار کو بحال کیا جا رہا تھا تو صلیبیوں پہ ایسی چیز کا انکشاف ہوا جس کے بارے میں وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ اس کا کیا کریں۔ اس کی ایک دیوار گر گئی اور وہاں غار نمودار ہوگئی۔ غار میں ایک طلائی تاج اور ایک شاہی عصا پڑا تھا۔ آج کچھ محققین کا خیال ہے کہ مذکورہ مقام کسی زمانے میں کنشت رہا ہوگا۔ وہاں کام کرنے والے بھاگتے ہوئے بطریق کے پاس پہنچے۔ اس نے قریطیوں کے ایک بزرگ راہب سے مشورہ کیا۔ دونوں نے اعلان کر دیا کہ ''اتفاق سے حضرت داؤد اور یہودیہ کے بادشاہوں کی قبریں دریافت ہوگئی ہیں۔ صدیوں تک لوگ کوہ زیہون کو شہر داؤد کا علاقہ سمجھتے رہے۔ حالانکہ اس کا اصل مقام اوافیل کی پہاڑی ہے۔ طویل عرصہ تک یہی سمجھا جاتا رہا تھا کہ شہر کے مغربی دروازے کے پہلو میں موجود شہر پناہ حضرت داؤد کا قلعہ ہے۔ اسی طرح ہیرودیس کے ہپی کس برج کو مینار داؤد کہا جاتا تھا۔ غالباً یہ امر ناگزیر تھا کہ کسی روز کوئی شخص بادشاہ داؤد کی قبر کوہ زیہون پر ''دریافت'' کرے گا۔ بطریق غار کا معائنہ کرنا چاہتا تھا لیکن وہاں کام کرنے والے لوگ اتنے خوفزدہ تھے کہ دوبارہ اس میں داخل ہونے پر تیار نہ ہوئے۔ چنانچہ بطریق نے حکم دے دیا کہ غار کا دھانہ بند کر کے اسے چھپا دیا جائے۔ 1170ء میں یروشلم کی زیارت کرنے والے یہودی سیاح ''تودیلا کے بنجمن'' کا کہنا ہے کہ ''آج تک بادشاہ داؤد اور یہودیہ کے بادشاہوں کی قبریں شناخت نہیں کی جا سکیں۔''(23) تاہم بعد میں صلیبیوں نے حضرت داؤد کی مبینہ قبر کی پھر کھدائی کی اور اسے کوہ زیہون کے
باسلیق میں شامل کر لیا۔ لیکن اس اقدام نے مستقبل میں شدید مشکلات پیدا کیں۔

MAP (نقشہ)

گیارھویں صدی عیسوی میں صلیبی محاربین کا عسکری جنون پورے یورپ میں پھیل گیا۔ فرانس کے کریسک چرچ کی دیواروں پر صلیبی جنگوں کے دور کی تصویریں آج بھی موجود ہیں۔ جن میں گھڑسوار نائٹس یروشلم کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔

1131ء میں بالڈوین ثانی کا انتقال ہوا۔ اس کے جانشین اس کی سب سے بڑی بیٹی میلی زینڈے اور اس کا

شوہر فولک (کاؤنٹ انجووا) تھے۔فولک ایک بہادر جنگجو تھا۔اس نے عین جوانی کے دنوں میں اپنا آپ یروشلم کے دفاع کے لئے وقف کر دیا تھا۔ بالڈوین کی موت کے بعد ایسا نظر آنا بہت اہم اور ضروری تھا کہ مملکت کی باگ ڈور ایک طاقتور حکمران کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ضرورت اس لئے تھی کہ مشرق قریب کی تاریخ میں پہلی بار ایک طاقتور مسلمان جرنیل منظر پہ ابھرا تھا۔ یہ جرنیل عماد الدین زنگی موصل اور الیپو کا ترک کمانڈر تھا۔اس نے خطے میں امن قائم کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔اور امیروں کی باہمی چپقلش کا خاتمہ کر کے مسلمانوں کی قوت کو مجتمع کرنا چاہتا تھا اس نے نہایت دانشمندی سے ایک ایک کر کے شام اور عراق کے مقامی امیروں کو اطاعت گزار بنایا اور بغداد کی مدد سے اس خطے کا حکمران بن گیا۔زنگی کو فرنکوں کے مفتوحہ علاقوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔لیکن فرانک، زنگی کی ابھرتی ہوئی طاقت کو اپنے لئے خطرہ محسوس کر رہے تھے۔فولک نے اپنی مملکت کی سرحدوں کو پہلے سے زیادہ مستحکم کرنے کے اقدامات کئے۔اس نے ''ہمدردوں'' کا ایک لشکر 1137ء میں بیت جبرین کے قلعہ کی طرف روانہ کیا۔اسی سال اس نے دمشق کے بادشاہ اونر کے ساتھ دفاعی معاہدہ کیا۔اونر بھی خائف تھا کہ اس کا شہر زنگی کی سلطنت نہ ہڑپ کر لے۔

اس معاہدہ کے لئے گفت وشنید کرنے والوں میں ایک شامی شہزادہ اسامہ بن منذیق بھی تھا جو معاہدہ پر دستخط ہو جانے کے بعد فرانکوں کے فلسطینی علاقہ کی سیاحت کو نکلا اور ہمیں ایک ایسا سفر نامہ دے گیا جس میں مغربیوں کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ فلسطین میں ناگہانی بلا کی طرح ٹوٹ پڑنے والے فرانکوں کو مسلمان کس نظر سے دیکھتے ہیں۔اسامہ بذات خود ایک مہذب اور خوش اخلاق انسان تھا۔وہ فرانکوں سے بہت متاثر نظر آتا ہے۔وہ ان کی بہادری کی تعریف کرتا ہے لیکن ان کی ادویات سے متنفر اور عورتوں کا علاج کرنے کے نازیبا انداز پر کراہت کا اظہار کرتا ہے۔وہ ان کے مذہبی عدم رواداری اور تنگ نظری کو بھی برا سمجھتا ہے۔وہ اس وقت خوف سے بوکھلا گیا جب ایک زائر نے اس کے بیٹے کو مغربی تعلیم دلانے کے لئے ساتھ لے جانے کی پیش کش کی۔اس کے خیال میں مغرب کی تعلیم حاصل کرنے کی بجائے اس کے بیٹے کا مقامی فرانکوں کی قید میں رہنا زیادہ بہتر تھا۔وہ تسلیم کرتا ہے کہ مشرق میں پیدا ہونے والے فرانک یورپ سے آنے والے نو واردوں سے بہتر ہیں۔ کیونکہ یورپ کے لوگ ابھی تک متعصب ہیں۔ وہ ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہے:

''اس نے یروشلم میں کچھ معبدی اپنے دوست بنا لئے تھے۔وہ جب
بھی مسجد اقصیٰ میں ان سے ملنے کے لئے جاتا وہ کوئی چھوٹا یا
بڑا حجرہ اس کے لئے مخصوص کر دیتے۔ایک روز وہ مکہ کی طرف
رخ کر کے نماز پڑھ رہا تھا تو ایک فرانک دفعتہً کمرے میں آیا۔اس

نے اسامہ کو دبوچا اور اٹھا کر مشرق کی طرف پٹخ دیا اور چلایا۔۔
یہ ہے طریقہ نماز پڑھنے کا۔۔۔' معبدی دوڑتے ہوئے کمرے میں آئے۔
حملہ آور کو پکڑا اور حجرے سے باہر نکال دیا۔ معبدیوں نے ابھی پیٹھ
پھیری تھی کہ حملہ آور پھر آدھمکا اور پہلے والی حرکت دہرائی۔
معبدی بہت شرمندہ ہوئے۔ انہوں نے بتایا حملہ آور نو وارد فرانک ہے
اور آج ہی یورپ سے یہاں پہنچا ہے۔ اس نے پہلے کبھی کسی کو مشرق
کے علاوہ کسی اور رخ پر نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔' میں اپنی نماز مکمل کر
چکا ہوں، اسامہ نے تحمل کے ساتھ کہا اور حجرے سے باہر نکل گیا۔ وہ
اس مذہبی جنونی کی حرکت پر بہر حال پریشان تھا جو کسی کو 'قبلہ رو'
نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔''(24)

یروشلم کی مملکت میں مقامی فرانکوں اور نو وارد فرانکوں کے درمیان اختلافات بڑھتے گئے۔ مقامی فرانک مذکورہ واقعہ کے معبدیوں کی طرح مسلمانوں کے نکتہ نظر کو سمجھتے تھے اور ان پڑوسیوں کے ساتھ معمول کے تعلقات قائم کرنا چاہتے تھے لیکن یورپ سے آنے والے فرانک بہت متعصب تھے اور کسی دوسرے مذہب کو برداشت کرنے پر تیار ہی نہیں تھے۔ اختلافات کہ یہ خلیج ٹھیک ان دنوں وسیع ہو رہی تھی جب پڑوسی مسلمان اپنے اختلافات ختم کر رہے تھے اور مضبوط ''قیادت'' کے تحت متحد ہو رہے تھے۔ 1144ء میں فرانکوں کو ایک ایسی ضرب لگی جس نے انہیں باور کرا دیا کہ وہ اب غیر محفوظ ہیں۔ اسی سال نومبر میں عماد الدین زنگی نے دمشق کے خلاف اپنی مہم کے دوران صلیبیوں کا شہر اڈیسہ فتح کر لیا اور فرانکوں کی یہ ریاست پوری طرح تباہ کر دی۔ عالم اسلام میں مسرت و انبساط کی لہر دوڑ گئی۔ زنگی جو بلا نوش اور بے رحم جنگجو تھا، اچانک مسلمانوں کا ہیرو بن گیا۔ لیکن دو سال بعد وہ مارا گیا اور اس کا بیٹا محمود سلطان بنا۔ محمود کو لوگ نور الدین زنگی کے نام سے جانتے ہیں۔ نور الدین راسخ العقیدہ سنی تھا اور فرانکوں اور شیعوں کے خلاف برسر پیکار رہنے کو مقدس فرض سمجھتا تھا۔ اس نے حضرت محمد ﷺ کا انداز اپنایا۔ خود سادہ زندگی بسر کی اور غریبوں اور ناداروں کی ہمیشہ دل کھول کر مدد کی۔ وہ خیرات میں بڑی بڑی رقمیں تقسیم کرنے کا عادی تھا۔ اس نے جہاد کے لئے ایک موثر مہم چلائی۔ قرآن ہر قسم کے جنگ و جدل کی مذمت کرتا ہے لیکن تعلیم دیتا ہے کہ اگر اعلیٰ اقدار کے تحفظ کے لئے ظلم و جبر کے خلاف لڑنا پڑے تو پھر قتال و جدال جائز ہے۔ اگر مسلمانوں کو قتل کیا جائے یا انہیں انکے گھروں سے نکال دیا جائے اور وہ بتائیں کہ ان کی عبادت گاہیں تباہ کی جا رہی ہیں تو پھر بقیہ مسلمانوں پر ان کے دفاع کے لئے لڑنا فرض ہو جاتا ہے۔(25) قرآنی تعلیمات ان صلیبیوں کے خلاف معرکہ آرائی کی

تحریک دیتی تھیں جنہوں نے ہزاروں مسلمانوں کو قتل کیا تھا۔ انہیں انکے گھروں سے نکال دیا تھا اور ان کی مساجد کو نذر آتش کر دیا تھا۔ انہوں نے القدس کے حرم کی تقدیس بھی پامال کی تھی۔ نورالدین زنگی نے ''فضائل القدس'' کے اوراق نقل کروا کے پورے عالم اسلام میں تقسیم کروائے اور فرانکوں کے قبضہ سے یروشلم آزاد کرانے کے بعد مسجد اقصیٰ میں ایک خوبصورت منبر بنانے کا اعلان کیا۔

MAP (نقشہ)

گرجا مزار مقدس

(1149ء)

1۔نمبر سے 23۔نمبر تک

مشرق قریب میں جہاد کا دستور ختم ہو چکا تھا۔ لیکن اب مغربی صلیبیوں کی سفاک جارحیت نے اس کے تن مردہ میں پھر جان ڈال دی۔ ادھر صلیبی نورالدین کو اپنے داخلی تعصّبات کی وجہ سے کوئی موثر جواب نہ دے سکے۔ جب دوسری صلیبی جنگ کے لئے یورپ سے 1148ء میں فوجیں فلسطین میں پہنچیں تو محصور فرانکوں کو آزاد کرانے کے لئے نورالدین پر حملہ آور ہونے کی بجائے اپنے حلیف مسلمان حکمران دمشق کے بادشاہ اونر پر جھپٹ پڑیں۔ اب اونر کے لئے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ نورالدین زنگی کو مدد کے لئے پکارے۔ صلیبیوں نے دمشق کا محاصرہ کرتے ہوئے زبردست غلطیاں کیں۔ جو ان کی ناکامی کا سبب بن گئیں۔ دوسری صلیبی جنگ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عالم اسلام سے فرنکوں کی دشمنی انہیں خود کشی کے راستے پر لے گئی۔ خطے میں ان کی اجنبیت بھی مشرق قریب کی حقیقی سیاست پر ان کی گرفت مضبوط نہ کر سکی۔

دوسری صلیبی جنگ کی ناکامی نے 15 جولائی 1149ء کو گرجا مزار مقدس کی بحالی کی تقریب کو یقیناً بدمزہ کر دیا ہوگا۔ یہ دن شہر کی تسخیر کی پچاسویں سالگرہ تھا۔ تقریب کے بعد سارا مجمع جلوس کی صورت میں خداوند کے معبد اور پھر وادی قدرون میں گیا۔ یہاں یروشلم کی جنگ میں مارے جانے والے صلیبی مجاہدین دفن تھے۔ فلوس کا اختتام شمالی دیوار پر نصب صلیب کے نیچے ہوا۔ 1099ء میں اسی مقام سے گاڈفرے کے سپاہی شہر میں داخل ہوئے تھے۔ صورت حال میں حالیہ ناکامی کی تلخی سب کے لئے تکلیف دہ تھی۔ حالانکہ نیا گرجا ایک بہت بڑی کامیابی تھی صلیبیوں نے تمام مقدس مقامات نئی عمارت میں شامل کر لئے تھے۔ ان میں حضرت عیسیٰ کی قبر، گلگتا کی چٹان اور وہ تہہ خانہ جہاں بسیلینا کو اصلی صلیب ملی تھی۔

اب یہ تمام متبرک اشیاء اور متعلقات ایک بہت بڑی رومن طرز کی عمارت میں موجود تھے۔ انہوں نے گیارھویں صدی عیسوی میں قسطنطین مونو مارکس کے بنوائے گئے گول گرجا کو بھی اپنی نئی عمارت کا حصہ بنا دیا تھا۔ جو پرانے صحن کے مقام پر بنائی گئی تھی۔ ان دونوں کو آپس میں ایک بہت بڑی محراب کے ذریعے ملایا گیا تھا۔ مغربی طرز تعمیر اور بازنطینی طرز تعمیر کا امتزاج ناخوشگوار تاثر پیدا نہیں کرتا تھا۔ صلیبیوں نے کوشش کی کہ اس عمارت کے خدوخال مقامی انداز سے ہم آہنگ رہیں۔ لیکن صلیبی خود زندگی بھر یہ انداز نہ اپنا سکے۔ چٹانی قبر کی باقیات کو سنگ مرمر سے ڈھانپ دیا گیا۔ بعد میں اس کے گرد سونے کا غلاف بنا دیا گیا۔ دیواروں پر نقش ونگار اور رنگدار سنگ مرمر کی تختیاں ایسی تزئین وآرائش پیش کر رہی تھیں جو دلکش بھی تھی اور منفرد بھی۔ آج کی اداس اور پژمردہ عمارتوں میں اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔

نورالدین زنگی نے اپنی مہم جوئی جاری رکھی۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ فرانکوں کو ایک ایسی مسلمان سلطنت میں محصور کر دیا جائے جو ہر وقات جہاد کے لئے خود کو وقف رکھے۔ ادھر یروشلم کی مملکت کے داخلی تنازعات جاری رہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ صلیبی ریاستوں کی زندگی کے ہر پہلو میں شامل کی گئی جارحیت فرانکوں کو مجبور کر رہی تھی کہ ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہیں۔ 1152ء میں نوجوان بادشاہ بالڈوین سوم کا تصادم اپنی ماں میلی زینڈے سے ہو گیا۔ ماں نے بیٹے کے خلاف یروشلم کی قلعہ بندی شروع کر دی۔ اگر شہر کے برجیس ملکہ میلی زنیڈے کو مجبور نہ کرتے تو خوفناک خانہ جنگی چھڑ جاتی۔ معبدی اور ہمدرد، دونوں گروہ ایک دوسرے کے دشمن اور بطریق اور بادشاہ دونوں میں سے کسی کی اطاعت پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ ہمدردوں نے اپنی عمارت میں ایک مینار تعمیر کیا جو گرجا مزار مقدس سے اونچا تھا۔ یہ ایک توہین آمیز اور مقابلے کا اقدام سمجھا گیا۔ اس گروہ نے گرجا مزار مقدس میں اجتماعی عبادت کو بھی سبوتاژ کرنا شروع کر دیا۔ الصور کا ولیم بتاتا ہے کہ جوں ہی بطریق وعظ کے لئے کھڑا ہوتا یہ لوگ اپنے گرجے کی بڑی بڑی گھنٹیاں اتنے زور سے بجانا شروع کر دیتے کہ بطریق کی آواز دب جاتی۔ جب بطریق نے ان کے طرز عمل پر اعتراض کیا تو جواب میں انہوں نے گرجا پہ دھاوا بول دیا اور تیروں کی بارش کر دی یہ طرز عمل حضرت عیسیٰ کی محبت اور انسان دوستی کی اخلاقیات سے عاری تھا۔ لیکن صلیبیوں کو اس بات کی پروا کب تھی۔

مملکت کا مہلک انتشار، المناک انجام تک جاری رہا۔ یروشلم کے عیسائی داخلی کشمکش میں اپنی توانائیاں ضائع کرتے رہے۔ فرانکوں نے کوشش کی کہ نورالدین کو فاطمیوں کے مصر کی تسخیر سے روک لیں لیکن ناکام رہے۔ کروجرنیل شرکوہ نے مصر پر قبضہ کر لیا۔ یوسف ابن ایوب ''وزیراعظم'' کی حیثیت سے 1170ء میں اس کا جانشین بنا۔ اس نے شیعی خلافت تحلیل کر دی۔ یوسف کو مغرب میں صلاح الدین کہا جاتا ہے لیکن یہ اس کا نام نہیں، خطاب تھا۔ اسلامی دنیا میں اسے سلطان صلاح الدین ایوبی کہا جاتا ہے۔ صلاح الدین جہاد کے جذبہ سے سرشار تھا لیکن وہ سمجھتا تھا کہ نورالدین یا وہ یروشلم آزاد کرانے پر مامور نہیں ہیں۔ یہی بات صلاح الدین اور سلطان نورالدین زنگی کے درمیان تنازعہ کا سبب بن گئی۔

1174ء میں نورالدین دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گیا تو اس کے بیٹے اور صلاح الدین کے درمیان سلطنت پر قبضہ کرنے کے لئے جنگ چھڑ گئی۔ صلاح الدین کی شخصیت کا سحر، اس کی رحم دلی اور مذہب سے وابستگی نے لوگوں کے دل جیت لئے تھے۔ وہ نہ صرف سلطان نورالدین زنگی کی سلطنت کا وارث بنا بلکہ اگلے دس برسوں میں خطے کے تمام بڑے اسلامی شہروں میں مسلمانوں کا مسلمہ قائد بن گیا۔ صلیبیوں نے اب خود کو ایک متحدہ اسلامی سلطنت میں محصور پایا۔ اس سلطنت کی قیادت ایک راسخ العقیدہ اور کرشمہ ساز سلطان کے پاس تھی۔ وہ صلیبیوں کی مملکت کو تباہ کرنے کا عزم رکھتا تھا۔

اس کھلے خطرے کے باوجود فرانک باہم دست و گریباں رہے ایک ایسے وقت میں جب انہیں کسی مضبوط قیادت کی ضرورت تھی، ان کا نوجوان بادشاہ بالڈوین چہارم، جذام میں مبتلا ہو گیا۔ مملکت کے عیسائی جاگیردار بالآخر بادشاہ کے قائم مقام تریپولی کے نواب ریمنڈ کی قیادت میں اکٹھے ہو گئے۔ ریمنڈ جانتا تھا کہ سلطان صلاح الدین کا غیض و غضب روکنے میں ہی عافیت ہے۔ چنانچہ اس نے پڑوسی مسلمانوں سے اچھے تعلقات قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ لیکن نو وارد فرانکوں کے ایک گروہ کی مخالفت نے اسے کسی پیش رفت میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ انتہا پسند فرانکوں نے شاہی خاندان کا گھیراؤ کر لیا اور ریمنڈ کو اشتعال انگیز اور جارحانہ پالیسی اپنانے پر مجبور کر دیا۔ ان انتہا پسندوں میں نمایاں اور بدنام ترین رینالڈ تھا۔ جس نے ریمنڈ کی طرف سے کئے جانے والے جنگ بندی اور امن و امان کے ہر معاہدے کو توڑ دیا۔ وہ مسلمانوں کے قافلوں پر حملے کر کے سلطان کو برانگیختہ کر دیتا۔ رینالڈ (دائی کرک ارناط) نے مکہ اور مدینہ پر حملہ کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس کے نزدیک مسلمانوں سے نفرت اور اسلام کی مکمل مخالفت ایک مقدس مذہبی فریضہ اور سچی حبالوطنی تھی۔ یروشلم کی مملکت ان دنوں مذہبی قیادت سے بھی محروم تھی۔ اسقف اعظم ہرقل بھی نو وارد، جاہل اور اوباش تھا۔ وہ سرعام اپنی داشتہ کے ساتھ میل جول رکھے ہوئے تھا۔ جذام کا مریض بادشاہ مارچ 1185ء میں مر گیا۔ اسی سال جب اس کا نابالغ بیٹا بالڈوین پنجم تخت نشین ہوا تو مملکت میں اقتدار کے حصول کے لئے خانہ جنگی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ سلطان صلاح الدین بھی مملکت پر حملے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ ریمنڈ نے مملکت کو بچانے کے لئے سلطان کے ساتھ ایک اور معاہدہ کیا لیکن رینالڈ نے اکی خلاف ورزی کر کے صورت حال بگاڑ دی۔ خانہ جنگی میں الجھے ہوئے جاگیرداروں کے لئے اب ایک ہی راستہ تھا کہ وہ مرنے والے بادشاہ کے بہنوئی ''گے'' کی حکمرانی تسلیم کر لیں۔ یہ نو وارد مغربی بھی غیر موثر اور کمزور تھا۔ لیکن مقامی جاگیردار اس کے باوجود مسلسل منقسم اور متحارب رہے۔ جب 1187ء میں فوج سلطان صلاح الدین کے خلاف لڑنے کے لئے گلیلی جانے کی تیاری کر رہی تھی تو اختلافات موجود تھے۔ انتہا پسند گروہ بادشاہ ''گے'' کے گرد اکٹھا ہو گیا اور اسے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ ریمنڈ نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی اور سمجھانا چاہا کہ ابھی کچھ دیر صورت حال دیکھنا اور انتظار کرنا ہی دانشمندی ہے۔ کٹائی کا موسم قریب تھا اور سلطان صلاح الدین کے لئے اپنی فوجوں کو زیادہ عرصہ تک وطن سے دور رکھنا مشکل تھا۔ لیکن انتہا پسندوں نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ بادشاہ گے نے فوج کو کوچ اور مسلمانوں پر حملے کا

حکم دے دیا۔ نتیجہ انتہائی خوفناک تھا۔ طبریس کے نزدیک حطین کی خون ریز جنگ میں مسلمان پوری طرح فتح مند رہے۔ یروشلم کی مسیحی مملکت سرنگوں ہوگئی۔

حطین کی لڑائی کے بعد سلطان صلاح الدین کی فوجیں فلسطین سے گزرتی ہوئی ایک کے بعد دوسرا شہر فتح کرتی ہیں۔ بچ رہنے والے صلیبیوں نے الصور میں پناہ لی۔ کچھ صلیبی محاربین شہر مقدس کو بچانے کی آخری کوشش کے لئے یروشلم میں چلے آئے۔ بالاخر مسلمان فوج یروشلم آن پہنچی اور کوہ زیتون پر خیمہ زن ہوگئی۔ سلطان صلاح الدین نے کوہ زیتون سے نیچے شہر پر نظر ڈالی اور حرم کی بے حرمتی اور قبۃ الصخرہ پر نصب صلیب کا منظر دیکھا۔ جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے اپنے کمانڈروں کے سامنے تقریر کی اور انہیں ''فضائل القدس'' یاد دلائے۔ ''یروشلم ہیکل سلیمانی کا شہر ہے انبیاء کا شہر ہے، معراج النبی کا شہر ہے اور روز محشر کا شہر ہے۔'' سلطان صلاح الدین اس امر کو اپنا فریضہ سمجھ رہا تھا کہ 1099ء کے قتل عام کا انتقام لے اور شہریوں پر کسی طرح کا رحم نہ کیا جائے۔ اندرون شہر عیسائی خوف زدہ اور دم بخود تھے۔ کوئی سردار اس قابل نہیں تھا کہ شہر کا موثر دفاع ممکن بنا سکے۔ اور پھر جیسے لوگوں کی دعائیں قبول ہوگئیں۔ ابینین کا ایک ممتاز جاگیردار بالین شہر میں آ گیا۔ اس نے سلطان صلاح الدین سے یہ کہہ کر خصوصی اجازت حاصل کر لی کہ وہ اپنی بیوی کو لینے آیا ہے اور اسے لے کر واپس الصور چلا جائے گا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ شہر میں صرف ایک رات گزارے گا۔ لیکن جب اس نے محصور عیسائیوں کی بری حالت دیکھی تو وہ سلطان کے پاس واپس آیا اور اس سے کہا کہ ''مجھے میرے وعدہ سے آزاد کر دیا جائے۔'' سلطان نے بالین کو لفظوں کی قید سے آزاد کر دیا۔ اس کا احترام کرتے ہوئے اس کی بیوی بچوں اور سامان کو ساحل کی طرف بحفاظت پہنچانے کے لئے خصوصی دستہ مہیا کیا۔

بالین اہل خانہ کو روانہ کر کے یروشلم میں واپس آ گیا اور شہر کے دفاع کے لئے موجود اور دستیاب معمولی وسائل کو بروئے کار لانے میں مصروف ہو گیا۔ لیکن سب کچھ کارلا حاصل تھا۔ 26 ستمبر 1187ء کو سلطان نے شہر کے مغربی دروازے پر ایک حملہ کیا۔ اس کے بارود بچھانے والے سپاہیوں نے شمالی دیوار میں سینٹ ستفنس کے دروازے کے قریب آتش گیر مادے کی سرنگ بچھائی۔ تین دن بعد دیوار کا کچھ حصہ، گاڈفرے کی صلیب سمیت خندق میں آ گرا۔ لیکن مسلمانوں کے سامنے اب ایک اور داخلی دفاعی دیوار تھی۔ اس سے پہلے کہ مسلمان یہ دیوار توڑتے، بالین نے امن کی درخواست کی۔ پہلے تو سلطان نے کہا کہ ''کوئی رحم نہیں کیا جائے گا۔ ہم تم لوگوں کے ساتھ وہی کچھ کریں گے جو تم نے (شہر فتح کرنے کے بعد) کیا تھا۔ کشت وخون ہوگا۔ لوگوں کو قیدی بنایا جائے گا اور ہر قسم کی سفاکی کی جائے گی۔''(27) بالین نے مایوس ہو کر کہا ۔۔۔ہم سب کچھ گنوا چکے ہیں۔ اب ہمارا آخری قدم یہ ہوگا کہ تمام عیسائی اپنے بیوی بچوں کو خود قتل کر دیں گے۔ مکانوں کو نذر آتش کر دیں گے۔ قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کو زمین بوس کر دیں گے اور تمہاری فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے باہر آ جائیں گے۔ پھر ہر عیسائی مرنے سے پہلے ایک مسلمان کو قتل کرے گا۔'' سلطان نے اپنے علما سے مشورہ کیا اور شہر کی پر امن تحویل پر

رضا مند ہو گیا۔ لیکن شرط رکھی گئی کہ کوئی فرانک شہر کے اندر نہیں رہے گا۔ وہ قیدی بنائے جائیں گے۔ البتہ انہیں نہایت معمولی تاوان کے بدلے رہائی مل سکے گی۔

12 اکتوبر 1187ء کو سلطان صلاح الدین اور اس کے سپاہی یروشلم میں داخل ہوئے۔ اسی روز ان کے پیغمبر ﷺ کے معراج کی سالانہ تقریب تھی۔ کسی ایک عیسائی کو قتل نہ کیا گیا۔ جاگیردار اور رؤسا نے آسانی سے زرتاوان ادا کر دیا لیکن غریب لوگ ایسا نہ کر سکے وہ جنگی قیدی بنا لئے گئے۔ لیکن جنگی قیدیوں کو گرفتار کرتے وقت ان کے عزیزوں کی گریہ زاری نے سلطان کو آبدیدہ کر دیا۔ قیدیوں کی اکثریت کو آزاد کر دیا گیا۔ سلطان کا بھائی العادل اس قدر ملول ہوا کہ اس نے ''ذاتی خدمت کے لئے'' ایک ہزار قیدی مانگ لئے اور پھر انہیں موقع پر رہا کر دیا۔ تمام مسلمان اس بات پر چیں بچبیں ہو رہے تھے کہ امیر اور صاحب ثروت عیسائی اپنی دولت سمیت شہر سے جا رہے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ دولت مند عیسائی اپنے غریب بھائیوں کا زرتاوان ادا کر کے انہیں آزاد کرا لیں۔ جب مسلمان مورخ عماد الدین نے اسقف اعظم ہرقل کو اپنے خزانوں سے لدے چھکڑوں کے ساتھ شہر سے نکلتے ہوئے دیکھا تو سلطان سے کہا۔۔۔۔ ''بقیہ قیدیوں کو رہا کرنے کے لئے اس کی دولت ضبط کر لی جائے۔۔۔۔'' لیکن سلطان نے انکار کر دیا۔۔۔۔ ''وعدوں اور معاہدوں پر حرف بحرف عمل درآمد ہونا چاہیے۔۔۔۔'' عیسائی جہاں کہیں بھی جائیں گے ہماری مہربانی کو یاد رکھیں گے۔۔۔۔'' (28) سلطان نے بالکل درست کہا تھا۔ مغرب کے عیسائی یہ سن کر پریشان ہو جاتے تھے کہ مسلمانوں نے جس طرز عمل کا مظاہرہ کیا وہ یروشلم پر صلیبیوں کے قبضہ کے وقت کئے جانے والے سلوک سے مختلف اور کہیں زیادہ ''مسیحی'' تھا۔ انہوں نے ایسی کہانیاں تراش لیں جو ''صلاح الدین'' کو اخلاقاً عیسائی ثابت کرتی تھیں۔ ان میں سے کچھ کہانیوں میں دعوی کیا گیا تھا کہ سلطان نے خفیہ طور پر بپتسمہ لے لیا تھا۔

یروشلم میں صلیبی جہاد کا تجربہ تقریباً ختم ہو چکا تھا مسلمان چاہتے تھے کہ القدس میں بقائے باہمی اور ایک جہتی کا پرانا دستور بحال کر دیا جائے لیکن صلیبی مجاہدین کی پرتشدد پالیسیوں نے اسلام اور مسیحی مغرب کے درمیان بنیادی سطح پر تعلقات کو اس طرح نقصان پہنچایا تھا کہ زخم مندمل نہ ہو سکے۔ مغربی دنیا سے مسلمانوں کو پہلی دفعہ واسطہ پڑا تھا۔ یہ تجربہ اتنا تلخ تھا کہ آج تک نہیں بھلایا جا سکا۔ صلیبی محاربین کے ہاتھوں پہنچنے والی اذیتوں نے مسلمانوں کو شہر مقدس کے لئے اپنے نکہتہ نظر میں تبدیلی لانے پر مجبور کر دیا۔ القدس کے لئے ان کی عقیدت اور وابستگی نے دفاعی حکمت عملی تخلیق کی چنانچہ ماضی کے مقابلے میں اب یہ شہر ایک جارح اسلامی شہر بن گیا۔

حوالہ جات

1. Alexiade 10: 5-7.

2. The Deeds of the Franks and the Other Pilgrims to Jerusalem Trans. R. Hill (London 1962), p. 91.

3. Fulcher of Charters, History of the Expededition to Jerusalem, 1095- 1127, trans, F. R. Ryan (Knoxville 1969), 1:19.

4. August C. Krey, The First Crusade: The Accounts of Eye Witnesses and Participants (Princeton adn London, 1921). p. 266.

5. Ibid.

6. Robert the Monk, Quoted in Jonathan Riley Smith, The First Crusade And the Idea of Crusading (London, 1987) p. 143.

7. Baldric of Bourgeuil in ibid.

8. Ibid., P 140

9. Krey, First Crusade, P. 38.

10. William, Archbishop of Tyre, A History of Deeds Done Beyonad the Sea, 2 vols., trans. E. A. Babcock and A. C. Krey (New York,1943), 1:368.

11. Fulcher of Chartres, History, 1:33.

12. F. E. Peters, Jerusalem: The Holy City...p.292.

13. William of Tyre, History, 1:507.

14. Joshua Prawer, The Settlement of the Latins in Jerusale,"Speculum 27 (1952).

15. Joshua Prawer, the Latin Kingdom of Jerusalem: European Colonialism in the Middle Ages (London, 1972), p. 214.

16۔ ڈیمبرٹ کو 1102ء میں گرجا کے منصب کی خرید وفروخت اور غبن کے الزامات میں برطرف کیا گیا تھا۔

17. For the military order, see Prawer, Latin Kingdom, pp.253-79; Jonathan Riley-Smith, The Knights of St. John in Jerusalem and Cyprus, 1050-1310 (London, 1967).

18. Jonathan Riley-smith, "Crusading as an Act of Love," History 65 (1980).

19. Sylvia Schein, "Between Mount Moriah and the Holy sepulchre: The changing Traditions to the Temple mount in the Central Middle Ages," Tradition 40 (1984).

20. Fulcher of chartres, History, 3:307.

21. Theoderich, Description of the Holy Places, trans. and ed. Aubrey Strewart, (London, 1896; New York, 1971).

22۔ اس گرجا کو یہ نام اس لیے دیا گیا کہ حضرت عیسیٰؑ نے دوبارہ زندہ ہونے کے بعد عورت کو بتایا تھا کہ وہ اپنے شاگردوں کو گلیلی میں ملیں گے۔(متی 28:7)

23۔ ایف ای پیٹرز، یروشلم، صفحہ نمبر 330۔

24۔ کتاب الاطبیر۔۔۔۔۔صلیبی جنگوں کا احوال لکھنے والے عرب مورخین کی تحریریں فرانسسکو جبرئیلی نے مدون کی ہیں۔اطالوی زبان سے انگریزی میں ترجمہ ای۔جے کوسٹیلو نے کیا۔(لنڈن۔1969ء) صفحہ نمبر 80۔

25۔ قرآن مجید 22:240-41

26۔ آرک بشپ الصور، ولیم، ہسٹری 2:240-41

27۔ ابن الاثیر، کامل التواریخ۔۔۔۔۔صلیبی جنگیں عربوں کی نظر میں ترجمہ جون

روتھس چائلڈ (لندن) 1973ء۔صفحہ نمبر 198۔

28۔ امدادالدین اصفہانی۔۔۔۔الفتح القصی فی الفتح القدسی صفحہ نمبر 200۔

==========

www.HallaGulla.com
Virtual Home for Real People

www.HallaGulla.com
Virtual Home
for Real People

چودھواں باب

جہاد

فرانک، یروشلم سے نکل گئے۔اب مسلمان شہر کے اندر اور اس کے ارد گرد گھومتے پھرتے اور صلیبیوں کی شاندار عمارتوں کو حیرت سے دیکھتے۔لیکن یروشلم میں آنا، ان کے لیے گھر واپس آنے جیسی تسکین کا ذریعہ تھا۔صلیبیوں کے یروشلم کے مرکز میں موجود عالیشان شفا خانہ اور مدرسہ کی عمارت میں سلطان صلاح الدین کی رسم تخت نشینی ہوئی اور اس نے اپنے امیروں، صوفیوں، علما اور عمائدین سے مبارک وتہنیت وصول کی۔عماد الدین بتاتا ہے کہ قاریوں نے آیات قرآنی تلاوت کیں۔شعراء نے اس کی شان میں قصیدے پڑھے۔کچھ لوگ جذبات سے مغلوب ہو کر رو پڑھے۔وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ سلطان کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔(1) لیکن مسلمانوں کو علم تھا کہ شہر کی تسخیر کے ساتھ جہاد کی ضرورت ختم نہیں ہوئی۔لفظ جہاد کے معنی محض ''مقدس جنگ'' نہیں۔اس کے معنی دراصل ''مسلسل جدوجہد'' ہیں۔قرآن میں اس لفظ کا استعمال اسی مفہوم میں ہوا ہے۔مسلمانوں پر زور دیا گیا ہے کہ وہ ''اللہ کی راہ میں جدوجہد'' کریں تاکہ اس ناقص والمناک دنیا میں اللہ کی رضا پوری کرنے کے لیے ان کی زندگیاں بامقصد سعی بن سکیں۔ایک جنگ سے واپسی کے بعد حضرت محمد ﷺ نے فرمایا تھا: ''۔۔۔۔اب ہم ایک چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف واپس آئے ہیں۔زیادہ اہم اور درست ترین جدوجہد اپنے معاشرے میں انصاف قائم کرنا اور اپنے دل میں ایمانداری پیدا کرنا ہے۔'' سلطان صلاح الدین نے اپنا جہاد قرآنی نصب العین کے مطابق شروع کر رکھا تھا۔

MAP (نقشہ)

اسلامی یروشلم

(ایوبی خاندان۔ 1187-1250ء)

www.HallaGulla.com

صلیبیوں نے جب بھی جنگ بندی اور امن وامان کی درخواست کی، اس نے فوراً اسے قبول کیا۔ اس نے اپنے قیدیوں سے ہمیشہ نرمی اور مہربانی کا سلوک کیا۔ ہر فتح کے موقع پر اس نے اعلیٰ انسانی اقدار کا مظاہرہ کیا۔ کچھ مسلمان مورخین کی رائے ہے کہ وہ کوتاہی کی حد تک رحم دل تھا۔ مثلاً اس نے عیسائیوں کو ''الصور'' میں جمع ہونے کی اجازت دے دی۔ یوں انہوں نے فلسطین میں اپنا مستقر قائم کر لیا چنانچہ اگلے ایک سو سال تک خطے میں تصادم جاری رہا۔ تیسری صلیبی جنگ میں انگلستان کا رچرڈ اول اور فرانس کا فلپ دوم یروشلم پر قبضہ کرنے میں ناکام رہے لیکن اسی صلیبی جنگ کی بدولت فرانک ساحل پر ایک چھوٹی سی ریاست تشکیل دینے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ ریاست یافہ سے بیروت تک ایک پتلی سے پٹی پر مشتمل صلیبی مملکت تھی۔ اگرچہ اس کا دارالحکومت عکہ تھا، لیکن اس کا حکمران خود کو ''یروشلم کا بادشاہ'' کہلاتا تھا۔ صلیبیوں کے خواب ابھی زندہ تھے چنانچہ جب تک فرانک فلسطین میں رہے۔ مسلمانوں کو ہر وقت مدافعت اور حرب وضرب کے لیے تیار رہنا پڑا۔

1187ء میں مسلمانوں کا جوش وخروش عروج پر تھا۔ سلطان صلاح الدین جانتا تھا کہ اب اسے ایک ایسا جہاد شروع کرنا ہے جو یروشلم کو ایک بار پھر حقیقی اسلامی شہر میں تبدیل کر دے۔ سب سے پہلا کام، حرم کی تقدیس بحال کرنا تھا۔ مسجد اقصیٰ کو معبدیوں کے بیت الخلاء، سامان اور دیگر نجاستوں سے پاک کرنا تھا تاکہ وہاں جمعہ کی نماز ادا کی جا سکے۔ قبلہ (مکہ) کا رخ متعین کرنے والی محراب کو معبدیوں نے اینٹوں سے بند کر کے دیوار کو برابر کر دیا تھا۔ اسے پھر سے بحال کیا گیا۔ مسجد کے اندر بنائی گئی معبدیوں کی دیواروں کو گرا کر فرش پر قالین بچھائے گئے۔ جس منبر کا حکم نورالدین زنگیؒ نے بہت پہلے دیا تھا، اسے دمشق سے منگوا کر محراب کے پاس رکھا گیا۔ قبۃ الصخرہ میں بنائی گئی تصوریریں اور شبیہیں مٹا کر ان کی جگہ قرآنی آیات کی کندہ کاری کو پھر سے بحال اور نمایاں کیا گیا، چٹان کے اوپر بنایا گیا سنگ مرمر کا صندوق نما غلاف ہٹا دیا گیا۔ خلیفہ عمرؓ کی طرح سلطان صلاح الدین بھی دن بھر کارکنوں کے ساتھ کام میں مصروف رہتا۔ حرم کے فرش دیواروں اور پگڈنڈیوں کو عرق گلاب سے دھویا گیا۔ غریبوں اور ناداروں میں خیرات تقسیم کی گئی۔ 4 شعبان 1187ء کو 1099ء کے بعد پہلی مرتبہ مسلمانوں نے یہاں جمعہ کی نماز پڑھی۔ یروشلم کا قاضی محی الدین القریشی جب نئے منبر پر بیٹھا تو لوگ جذبات سے مغلوب ہو کر رو پڑے۔

صلیبی جنگیں شروع ہونے سے پہلے اسلامی یروشلم حرم کے اردگرد عمارتوں پر مشتمل تھا۔لیکن اب صلاح الدین کا عمارتی جہاد تقاضا کرتا تھا کہ یروشلم کے نقشہ میں عیسائی خدوخال پر اسلامی خدوخال غالب آجائیں۔ایک دفعہ پھر عمارتیں، فاتحین کے ہاتھوں میں نظریاتی ہتھیار بن رہی تھیں۔عیسائی رنگ وروپ میں ڈھلے شہر میں صرف ایک نمایاں اسلامی مذہبی عمارت کی بجائے اب یروشلم کو پوری طرح اسلامی تشخص حاصل کرنا تھا۔اب عیسائیت کے لیے ایک نئی مخاصمت پائی جاتی تھی۔مرقد مسیح سے ملحقہ اسقف اعظم کی رہائش گاہ پر سلطان صلاح الدین نے قبضہ کرلیا۔البتہ سینٹ انا کا گرجا اور خانقاہ سرکاری رقم ادا کر کے حاصل کئے گئے۔لیکن ان عمارتوں کو صرف مساجد میں تبدیل نہ کیا گیا۔شیعوں کے خلاف اپنے جہاد کے ایک جزو کے طور پر سلطان صلاح الدین اور نورالدین زنگی دونوں نے عہد کر رکھا تھا کہ فتح ہونے والے پر شہر میں صوفیا کی خانقاہیں اور فقہ کے مدارس بنائے جائیں گے۔ یہ بنیادی ادارے سنی مصلحین نے متعارف کرائے تھے۔معروف وممتاز عالم الغزالی ان کے بانیوں میں سے تھے وہ پہلی صلیبی جنگ سے کچھ عرصہ قبل یروشلم میں باب الرحمت کے پاس صوفی خانقاہ میں مقیم رہے۔سلطان نے سینٹ انا کے گرجا کو مسجد میں تبدیل کر دیا اور ملحقہ عیسائی خانقاہ کو مدرسہ بنا دیا۔اسقف اعظم کی رہائش گاہ صوفی خانقاہ بن گئی۔دونوں ادارے چونکہ سلطان نے وقف کئے تھے چنانچہ اسی سے موسوم کئے گئے۔یروشلم میں صوفیا تو بہت عرصہ سے تھے لیکن سلطان نے اصرار کیا کہ اس کی نئی خانقاہ میں مقامی لوگ نہیں رہنے چاہئیں۔کیونکہ یہ شیعہ نظریات سے متاثر ہو سکتے ہیں۔چنانچہ صرف وہ صوفیا رہیں گے جو سنی العقیدہ شہروں سے آئیں گے۔

مسلمان صوفیا اور علما دور دراز علاقوں سے ان نئے اداروں میں رہنے کے لیے آ گئے۔متعدد علما حرم کی خدمت کے لیے آئے۔یروشلم کی فتح کے بعد ہزاروں مسلمان اس شہر کو دیکھنے کے لیے آنے لگے جو ایک صدی تک دشمنوں کے قبضہ میں رہا تھا۔شہر میں زندگی بحال ہونے اور پھر وہاں گورنر مقرر کئے جانے تک سلطان صلاح الدین کوہ زیتون پر ہی خیمہ زن رہا۔پھر ایک لشکر کو شہر پناہ میں متعین کر کے وہ دمشق کو واپس چلا گیا۔اب اس کے پیش نظر تیسری صلیبی جنگ میں مسلمانوں کو جوابی کارروائی کے لیے تیار کرنا تھا۔سپاہی اور انتظامیہ سابقہ اسقف اعظم کے علاقے میں مقیم ہو گئے۔شہر کی تسخیر کے فوراً بعد مسلمان شمالی افریقہ سے ''القدس'' میں منتقل ہو رہے تھے۔شمالی افریقہ میں بربر قبائل کے غارت گری نے ان مسلانوں کو نقل مکانی پر مجبور کیا تھا۔یہ مغربی مسلمان حرم کے جنوب مغربی کونے میں آباد ہو گئے۔انہوں نے اپنی مذہبی اور ثقافتی روایت کو ترک نہ کیا۔انہیں حرم میں معبدیوں کے طعام خانہ کو اپنی مرضی کی مسجد میں تبدیل کرنے کی اجازت دے دی گئی۔مغربی مسلمانوں کا گوشہ، یروشلم کے نئے خدوخال میں سے ایک تھا سلطان صلاح الدین یہودیوں اور عیسائیوں کو شہر بدر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔یک جہتی اور بقائے باہمی کا پرانا نظریہ برقرار رکھا گیا۔کئی ہزار شامی اور آرمینیائی عیسائیوں کو ذمیوں کی حیثیت سے رہنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔سلطان نے یونانی تقلید پسند عیسائیوں کی تحویل میں گرجا مزار مقدس (مرقد مسیحؑ) دیدیا۔مقامی عیسائیوں کو صلیبی جنگوں کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔مزار مقدس

کے اردگرد اب نئی اسلامی عمارتیں تھیں۔ سلطان نے صلیبیوں کے شفاخانے کی عمارت کا بہت بڑا حصہ گورنر کی رہائش گاہ، ایک اسلامی شفاخانے اور ایک مسجد کے لیے لے لیا تھا۔ مسجد کی تعمیر میں سلطان کے بیٹے الافضل نے دلچسپی لی۔ شہر پناہ میں بھی ایک مسجد بنائی گئی جسے حضرت داؤد علیہ السلام سے موسوم کیا گیا۔ اب عیسائیوں کے مقدس مقام کے اردگرد سر بفلک مینار ایستادہ تھے اور دن میں پانچ دفعہ اذان کی آواز اسقف اعظم کے علاقہ میں گونجتی تھی۔ کچھ امیروں نے مزار مقدس کو بھی منہدم کرنا چاہا لیکن سلطان کے مشیروں نے اسے بتایا کہ یہ محض گرجا نہیں ایک متبرک مقام ہے۔ سلطان نے مشیروں کی بات مان لی اور اس کے انہدام کو سختی سے روک دیا۔ تیسری صلیبی جنگ کے بعد لاطینی زائرین کو بھی یورپ سے یروشلم میں آنے کی اجازت دے دی گئی۔

سلطان صلاح الدین نے یہودیوں کو بھی واپس یروشلم آنے کی دعوت دی۔ انہیں صلیبی جنگوں کے دوران شہر سے نکال دیا گیا تھا۔ چنانچہ یہودی، سلطان صلاح الدین کی تعریف کرتے ہوئے اسے نیا سائرس (خورس) قرار دیتے تھے۔ صلیبی محاربین نے صرف عالم اسلام میں ایک نیا جہادی جذبہ نہیں ابھارا تھا بلکہ یورپ اور اسلامی سلطنت کے یہودیوں میں صیہونیت کی ایک نئی شکل بھی پیدا کر دی تھی۔ اس نئی مذہبی صیہونیت کا ابتدائی ہیجان بارھویں صدی کے اوائل میں دیکھنے میں آیا۔ تولیدو (طیطلہ، ہسپانیہ) کا معالج یہوداہ حلیومی، ہسپانیہ میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان جنگوں میں عجیب طرح پھنس گیا۔ اسے بار بار خود کو کبھی اسلامی اور کبھی عیسائی علاقے میں منتقل کرنا پڑتا۔ اس لڑھکتے رہنے کی اذیت نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ یہودیوں کو اپنے آباواجداد کی سرزمین میں واپس جانا چاہیے تاکہ وہاں وہ مستقل قیام کر سکیں۔ کیونکہ دنیا میں یہی انکا حقیقی مقام ہے۔ ارض مقدس جس کے لیے عیسائی اور مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں، ان دونوں میں سے کسی سے بھی تعلق نہیں رکھتی۔ یہودیوں کو فلسطین اور شہر مقدس پر اپنا دعویٰ سامنے لانا چاہیے۔ یروشلم دنیا کا مرکز ہے۔ ایسا مقام ہے جہاں انسانوں کی دنیا پہ عالم بالا کے راستے کھلتے ہیں۔ دعائیں جنت کے دروازے میں داخل ہوتی ہیں۔ یہ دروازہ دیور (خانہ اقدس) کے عین اوپر واقع ہے اور الوہی قوت اسی راستے سے واپس بنی اسرائیل کی طرف بہتی اور انہیں پیغمبرانہ قوت سے لبریز کرتی تھی۔ صرف فلسطین ہی ایسی جگہ ہے جہاں یہودی اپنا تخلیقی رابطہ آسمانی دنیا سے رکھ سکتے ہیں اور خود کو حقیقی معنوں میں یہودی بنا سکتے ہیں۔ ان کا مذہبی فریضہ ہے کہ وہ فلسطین کی طرف مراجعت کریں اور صیہون کے لیے اپنی جانیں خطرے میں ڈالیں۔ صفر اسی صورت میں شیکنہ یروشلم میں واپس آئے گی اور نجات کا دور شروع ہوگا۔ حلیوی اسی نصب العین کے لیے ہسپانیہ سے ارض فلسطین کو روانہ ہوا لیکن یقینی طور پر کبھی یروشلم نہ پہنچ سکا۔ غالباً وہ 1141ء میں مصر میں مر گیا۔ کچھ اور یہودیوں نے بھی اس مرحلہ پر حلیوی کی تقلید کی۔ اور پھر اس کی داستان یہودیوں کے لیے ایک علامت بن گئی۔ جب یہودی لوگ اپنے ماحول میں اجنبی بن جاتے اور محسوس کرتے کہ جسمانی اور روحانی طور پر دنیا میں ان کا کوئی وطن نہیں تو انہیں حلیوی کی طرح ارض مقدس ہی اپنی منزل دکھائی دیتی جہاں ان کی جڑیں تھیں اور جو ان کے دکھوں کا مداوا

تھی۔

یروشلم پر سلطان صلاح الدین کا قبضہ یہودیوں کے لیے قابل تعریف بھی تھا ور پریشان کن بھی۔ سلطان یہودیوں کو واپس ان کے مقدس شہر میں لایا اور وہاں انہیں بڑی تعداد میں رہنے کی اجازت دی۔ ستمبر 1187ء میں سلطان نے اسقلون فتح کیا تھا۔ اگلے مہینے یروشلم فتح ہوا تھا۔ مسلمانوں کے لیے بیک وقت دونوں شہروں کا دفاع کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ اسقلون کو خود ہی گرا کر ہموار کر دیا گیا اور وہاں کی آبادی کو یروشلم منتقل کر دیا گیا۔ 1190ء میں یروشلم میں اسقلون کے یہودیوں کو اپنا صومعہ یا کنشت تعمیر کرنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔ انہیں نئے مغربی مسلمانوں کے محلے کے ساتھ کا علاقہ مختص کر دیا گیا۔ ان دونوں کے درمیان اشراف کی رہائش گاہیں تھیں۔ 1198ء میں مزید یہودی شمالی افریقہ سے یروشلم میں پہنچنے لگے۔ 1210ء تک تقریباً تین سو یہودی خاندان فرانس سے شہر مقدس کو مراجعت کر چکے تھے۔ یہ مراجعت یہودیوں کو پر جوش بنا رہی تھی۔ حتمی اور ناگزیر نجات کی مسیحائی امیدیں ایک بار پھر بیدار ہو گئیں۔ لیکن یروشلم کا اسلامی تشخص توانا ہو رہا تھا اور یہ بات یہودیوں کے لیے پریشان کن تھی۔ اس شہر کے لیے مسلمانوں اور عیسائیوں کا جنگ و جدل جو یہودیوں کی نظر میں صرف ان کا آبائی شہر تھا۔۔۔۔۔ ایک ابہام پیدا کر رہا تھا۔ 1217ء میں جب ہسپانوی شاعر یہودا الہریزی نے یروشلم کا سفر کیا تو حرم پہ مسلمانوں کی عمارتیں دیکھ کر بہت مضطرب ہوا۔

معبد سلیمانی کے مقدس صحنوں کو ایک اجنبی معبد میں تبدیل ہوا دیکھنا،
انتہائی اذیت ناک تھا۔ ہم نے اس عظیم اور شاہانہ عبادت گاہ سے نظریں
چرانے کی کوشش کی جو اس قدیم یہودی معبد کے مقام پر قائم ہے جہاں
کبھی خدا کا زجلال مقیم تھا۔(2)

یہودیوں میں یہ بات ایمان و ایقان کا درجہ حاصل کر گئی کہ ارض مقدس اپنے اصل مکینوں کی واپسی کی راہ دیکھ رہی ہے۔ انہیں یقین تھا کہ جس طرح حلیو نے نشاندہی کی تھی، مسلمان اور عیسائی دونوں ہی اس کے تقدس سے فیض یاب نہیں ہو سکتے۔ اس ہیجان نے سلطان کے یہودی طبیب سوبر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس یہودی فلسفی نے بھی باور کر لیا کہ یروشلم، یہودیوں کا مرکز ثقل رہا ہے۔ اور اگر یہودی ریاست اس کے علاوہ کہیں بنائی گئی تو جائز نہیں ہو گی۔ ایک یہودی مملکت اور یہودی آئین کی بنیاد معبد (سلیمانی) ہونا چاہیے۔ معبد اگرچہ کافروں نے ناپاک کر دیا ہے لیکن یہ اب بھی ایک مقدس مقام ہے کیونکہ اسے حضرت سلیمانؑ نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مقدس بنا دیا ہے۔ الوہی موجودگی کو وہ معبد سے کبھی خارج نہیں کی جا سکتی۔'' چنانچہ یہودی جب بھی حرم پہ جائیں وہ اپنے آپ کو ہیکل سلیمانی میں موجود محسوس کریں۔ انہیں نہ

تو ممنوعہ حصوں میں جانا چاہیے اور نہ ہی مشرق کی طرف دیکھتے ہوئے کوئی نامناسب حرکت کرنا چاہیے کہ وہاں کبھی دیور ہوا کرتی تھی۔ معبد ختم ہو چکا ہے لیکن اس مقام کا تقدس برقرار ہے جو ہمیشہ برقرار رہے گا۔ یہ خدا کی اپنے بندوں کے لیے مسلسل رحمت و برکت کی علامت

ہے۔

سلطان صلاح الدین 1194ء میں ثائیفائیڈ بخار سے انتقال کر گیا۔ اس کی سلطنت مختلف شہروں میں تقسیم ہو گئی جن پر اس کے خاندان، ایوبی کے ارکان حکومت کرنے لگے۔ ہر شہر اب ایک خود مختار ریاست تھا جس کی اپنی فوج اور اپنی انتظامیہ تھی۔ یوں وہ اتحاد جو سلطان نے تخلیق کیا تھا، اس کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ اس کے جانشین بہت جلد آپس میں الجھ پڑے۔ یروشلم بھی اس داخلی تصادم سے متاثر ہوا۔ تاہم القدس کے لیے ان کا جوش و جذبہ تحلیل نہ ہوا۔ مسلمان ایک دفعہ القدس گنوا چکے تھے لیکن اب اس کی بازیافت کے بعد ان کی وابستگی ماضی سے زیادہ گہری اور پر جوش تھی۔ انہوں نے اپنا عما رتی جہاد جاری رکھا تھا۔ 1193ء میں یروشلم کے امیر عزالدین یردیق نے مزار مقدس کے قریب چھوٹی مسجد کی تعمیر نو کی جو پہلی صلیبی جنگ سے پہلے خلیفہ عمرؓ سے موسوم تھی۔ مسجد کے ساتھ ایک قرآنی مدرسہ قائم کیا گیا۔ الافضل نے مغربی مسلمانوں کے پورے علاقے پر خصوصی توجہ دی تھی تاکہ شمالی افریقہ کے زائرین اور غریب مسلمانوں کی مدد اور خدمت ممکن رہے۔ اس نے ایک مدرسہ بھی بنوایا جہاں شمالی افریقہ کے مالکی مکتبہ فکر کے مسلمانوں کو اپنی فقہ کی تعلیم مل سکے۔ اس مدرسہ کی مستقل اعانت کا بھی انتظام کر دیا گیا۔

یروشلم میں وقف املاک کا یہ پہلا واقعہ تاریخ میں دیکھنے میں آتا ہے۔ ''وقف'' میں عطیہ دینے والا کوئی فرد اپنی منفعت بخش املاک مثلاً دکان وغیرہ کی آمدنی (رواں اخراجات منہا کر کے) ایسے ادارے کے لیے مخصوص کر دیتا ہے جو انسانی فلاح و بہبود کا مذہبی فریضہ سرانجام دے رہا ہو۔ وقف جنگی قیدیوں کو رہا کرانے کے لیے زرتاوان ادا کرنے، ناداروں اور مسافروں کو کھانا کھلانے اور مدرسہ وغیرہ قائم کرنے جیسے کاموں کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ اس طرح کا نیک کام القدس میں کیا جانا زیادہ موزوں اور مستحسن سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس کے کچھ اور فائدے بھی تھے۔ کچھ لوگ اوقاف کو اپنے بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال میں لاتے۔ ان کے بچے اوقاف کی عمارتوں میں رہ سکتے تھے یا پھر اوقاف کے تنخواہ دار نگران بن سکتے تھے۔ کسی مدرسہ یا خانقاہ میں عطیہ دینے والوں کے لیے کمرے مخصوص ہوتے تھے جو بڑھاپے میں یروشلم میں آ کر رہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وقف انسانی ہمدردی اور خیرات کا عملی اقدام تھا۔ اس نے اسلامی تعلیمات کو فروغ دیا، نادار طلبہ کو وظائف دیئے، غریبوں کی مالی اعانت کی۔ یہ نظام سماجی انصاف کے تصور کو یقینی بناتا تھا جو قرآنی تعلیمات کا مطمح نظر اور یروشلم کے لیے جہاد کا مرکزی نکتہ تھا۔ وقف نے نہ صرف شہر کی خوبصورتی اور سماجی محبت میں اضافہ کیا بلکہ لوگوں کو روزگار مہیا کیا۔ کوئی بھی شخص تنگ دستی میں کسی مدرسہ کے متولی کی حیثیت سے ملازمت حاصل کر سکتا تھا یا پھر کسی حلقہ تصوف

میں شامل ہوسکتا تھا۔ کسی بھی وقف کی زائد آمدنی ہمیشہ غریبوں میں تقسیم کی جاتی تھی لیکن ان کی اہانت نہیں کی جاتی تھی۔ جو لوگ وقف کی خیرات پر بسر اوقات کرتے تھے انہیں مکمل عزت وقار دیا جاتا۔ انصاف اور انسانی ہمدردی یروشلم کی تقدیس کا مرکز ومنبع تھے اور شہر کے قیام کے ابتدائی دنوں سے افضل واحسن سمجھے جاتے تھے۔ ان کا مظاہرہ صلیبیوں کے یروشلم میں تو دیکھنے میں نہیں آیا تھا لیکن سلطان صلاح الدین کی ترجیحات میں یہ ہمیشہ سرفہرست رہے۔ صلیبیوں کے چلے جانے کے بعد حرم کی طہارت کے ساتھ خیرات تقسیم کرنا لازمی ہو چکا تھا۔ اب وقف کے اداروں نے یروشلم کے ایوبی اسلامی دور کا خاصہ غریبوں اور حاجت مندوں کی نگہداشت بنا دیا تھا۔

لیکن مسلمان اس وقت تک آرام سے نہ رہ سکے جب تک صلیبی فلسطین میں موجود رہے۔ عکہ کی مملکت میں رہنے والے فرانک تو اب چاہتے تھے کہ سرحدوں پر امن قائم رہے کیونکہ انہوں نے حطین کی جنگ سے ایک قیمتی سبق سیکھ لیا تھا۔ لیکن مغرب کے عیسائی کچھ زیادہ ہی جھگڑالو ثابت ہو رہے تھے۔ وہ یروشلم کو آزاد کرانے کے لیے مسلسل صلیبی مجاہد روانہ کر رہے تھے۔ العادل کا بیٹا المعظم عیسیٰ 1200ء میں دمشق کا سلطان بنا۔ وہ القدس سے اتنی عقیدت رکھتا تھا کہ اس نے یہاں اپنی مستقل رہائش رکھ لی۔ المعظم دو مدارس سے وابستہ تھا۔ ایک اس کے نام سے موسوم حنفی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا تھا اور حرم کے شمال میں تھا جبکہ دوسرا عربی زبان سکھانے کے لیے قائم کیا گیا تھا اور باب الرحمت کے اوپر واقع تھا۔ المعظم نے حرم کے گرداگرد ستونوں پر استوار برآمدے بھی تعمیر کئے لیکن حالات پرسکون نہ رہے۔ 1218ء میں مغرب نے ایک اور صلیبی جنگ مسلط کر دی۔

اس دفعہ صلیبیوں کے بحری جہاز براہ راست فلسطین کے ساحل پر نہ آئے۔ انہوں نے پہلے مصر کا رخ کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ پہلے مصر سے مسلمانوں کو نکالیں اور وہاں اپنا مستقر قائم کر کے یروشلم کو دوبارہ فتح کرنے کی تیاریاں کریں۔ مشرق قریب میں محض صلیبیوں کی موجودگی خطے میں خوف پھیلانے کے لیے کافی تھی۔ لوگ ابھی تک 1099ء کے قتل عام کو دہشت زدہ ہو کر یاد کرتے تھے۔ صلیبیوں کی نئی آمد سے نئے ظلم وستم کے اندیشے جنم لے رہے تھے۔ المعظم کو یقین تھا کہ صلیبی ایک بار پھر یروشلم حاصل کر لیں گے، آبادی کا قتل عام ہوگا اور اسلامی دنیا پر یہ لوگ غالب آ جائیں گے۔ ابتدا میں واقعی انہوں نے چھوٹی چھوٹی کامیابیاں حاصل کرتے ہوئے پیش رفت کی۔ لیکن فرانک اپنے ظلم وستم کی ایسی داستانیں پیچھے چھوڑ گئے تھے جو لوگوں کو ہمیشہ یاد رہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے لیے صورتحال کو محض معروضی انداز میں دیکھنا مشکل تھا۔ المعظم نے حکم دیا کہ یروشلم کی دیواریں گرا دی جائیں تاکہ صلیبی یہاں آ کر خود کو مستحکم نہ کر سکیں۔ یہ ایک خوفناک اقدام تھا۔ امیروں نے المعظم کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ شہر پر ہونے والے حملے کو پسپا کر سکتے ہیں لیکن سلطان نہ مانا۔ اس نے اصرار کیا کہ دیواریں مسمار کر دی جائیں۔ پھر اس نے حکم دیا کہ وہ اس کام کی خود نگرانی کرے گا۔ ایسے اقدام کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ پہلے آبادی کو تحفظ دینے کا انتظام کیا جائے لیکن یہاں اس طرح کا کوئی متبادل انتظام نہیں تھا۔ چنانچہ

جب سلطان کے انجینئر، معمار اور بارود بچھانے والے لوگ پہنچے تو کہرام مچ گیا۔ آبادی کا سب سے غیر محفوظ طبقہ، عورتیں، لڑکیاں اور بچے خوف زدہ ہو کر گلیوں میں نکل آئے اور اپنے کپڑے پھاڑ کر روتے چلاتے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ لوگ پہلے حرم میں اکٹھے ہوئے اور پھر دمشق، قاہرہ، کرک اور دوسرے شہروں کو بھاگ اٹھے۔ بدحواسی میں وہ اپنے اہل خانہ اور مال اسباب کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔ انجام کار اب شہر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ برجیاں اور دیورایں گرادی گئیں صرف مینار داؤد کھڑا رہ گیا۔ فوج کو بھی یروشلم سے نکال لیا گیا۔

یروشلم مکمل طور پر غیر محفوظ تھا۔ دیواریں گرائی جا چکی تھیں۔ قریب ہی عکہ کی ریاست میں فرانک موجود تھے۔ چنانچہ مسلمان شہر میں رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ یروشلم اب ایک گاؤں کی طرح مختصر سی آبادی کا شہر تھا۔ یہ معدودے چند لوگ صوفیا اور فقیہہ تھے۔ انہوں نے کسی حد تک ایوبی اداروں کو چلانے کی کوشش کی۔ ان کے ساتھ کچھ نڈر قسم کی ریاستی حکام اور مٹھی بھر سپاہی تھے۔ المعظم کا فیصلہ جلد بازی کا مظہر اور قبل از وقت ثابت ہوا کیونکہ 1221ء میں صلیبیوں کو پسپائی پر مجبور ہونا پڑا۔ لیکن وہ وطن لوٹنے سے پہلے خطے کو اس طرح عدم استحکام کا شکار کر گئے کہ مسلمانوں کے لیے مغرب کی موجودگی کے بارے میں اعتماد اور دلجمعی کے ساتھ سوچنا اور تدارک کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ یروشلم کے لیے مسلمانوں نے نئی دفاعی حکمت عملی پر غور کرنا شروع کر دیا لیکن یہ حکمت عملی شہر کے لیے از خود تباہ کن ہو سکتی تھی۔

مسلمان حکمرانوں کی اولین ترجیح اب سلامتی اور تحفظ تھا۔ 1229ء میں مصر کا سلطان، الکامل، صلیبیوں کے کسی نئے حملے کا مقابلہ کرنے کی بجائے یروشلم سے دستبردار ہونے پر تیار ہو گیا۔ اس دوران رومن شہنشاہ فریڈرک دوم کو پوپ نے مجبو کیا کہ وہ از ارض مقدس کے حصول کے لیے از سر نو مہم جوئی کرے۔ ہم عصر حکمران اسے مخبوط الحواس انسان سمجھتے تھے۔ وہ یورپ کی توقعات کو مضحکہ خیز انداز میں دیکھتا۔ اس کی پرورش عروس البلاد سسلی میں ہوئی تھی چنانچہ وہ یورپ کے مسلمان بیزاری میں شامل نہیں تھا۔ اسے اسلام سے کوئی نفرت نہیں تھی۔ اس کے برعکس وہ روانی سے عربی بولتا اور مسلمانوں سے گفتگو اور علمائے اسلام سے بحث مباحثہ سے لطف اندوز ہوتا۔ مسلمان حکمرانوں سے اس کی خط کتابت بھی رہتی۔ چنانچہ وہ یروشلم کے لیے صلیبی جہاد کو محض وقت کا زیاں سمجھتا تھا لیکن اسے علم تھا کہ وہ زیادہ دیر تک راہے عامہ کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ اس نے تحکمانہ انداز میں الکامل سے کہا کہ یرعشلم اس کے حوالے کر دیا جائے۔ دیواریں منہدم کر دیئے جانے کے بعد سلطان کے لیے یہ شہر کسی اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ چنانچہ الکامل شہر کی تحویل کے لیے تیار ہو گیا۔ ان دنوں وہ اپنے بھائی اور دمشق کے سلطان المعظم سے بھی معرکہ آرائی کر چکا تھا۔ چنانچہ ایک متحدہ محاذ کے بغیر اس کے لیے صلیبیوں سے نبرد آزما ہونا ممکن نہیں تھا۔ غیر مستحکم یروشلم میں فرانکوں کی موجودگی اس کے نزدیک کسی عسکری خطرے کا سبب نہیں بن سکتی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ فرانکوں کو یروشلم واپس کر دینے سے مغرب کا خطرہ بھی ٹل سکتا ہے۔ اور المعظم کے خلاف فریڈرک ایک اچھا خلیف ثابت ہو سکتا ہے۔

دونوں فریقوں کی طرف سے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد 29 فروری 1229ء کو یافہ کے مقام پر فریڈرک اور الکامل نے ایک معاہدہ پر دستخط کر دیئے۔ معاہدہ کے مطابق دس سال کے لیے جنگ بندی ہوگئی۔ یروشلم، بیت لحم اور ناصرت کے شہر عیسائیوں کے حوالے کئے جانا تھے۔ فریڈرک نے وعدہ کیا کہ یروشلم کی دیواریں تعمیر نہیں کی جائیں گی۔ یہودی شہر میں نہیں رہیں گے البتہ مسلمانوں کو حرم میں رہنے کی اجازت ہوگی۔ وہاں کسی رکاوٹ کے بغیر مسلمان عبادت کر سکیں گے اور مسلمانوں کے مذہبی نشانات برقرار رہیں گے۔

اس معاہدے کی خبروں نے اسلامی اور مسیحی دونوں دنیاؤں میں اشتعال پھیلا دیا۔ بغداد، موصل اور بیلیو جیسے شہروں کی گلیوں میں مسلمان غم و غصے کے ساتھ امڈ آئے۔ انہوں نے شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا۔ تل الاجول میں اماموں نے الکامل کے خیمے وگھیر لیا۔ انہں تشدد کر کے وہاں سے ہٹایا گیا۔ المعظم شدید بیمار تھا کہ لیکن اس خبر پر اسے اتنا دکھ ہوا کہ وہ بستر چھوڑ کر یروشلم کا رخ کرنے پر اصرار کرنے لگا۔ دمشق کی جامع مسجد میں لوگوں کا ہجوم اس وقت سسک اٹھا جب شیخ سبط الجوزی نے الکامل کی مزمت کرتے ہوئے اسے اسلام کا غدار قرار دیا۔ الکامل نے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔ اس کا موقف تھا کہ ''اسلامی عمارتیں، مساجد اور حرم عیسائیوں کے حوالے نہیں کئے گئے۔ اس نے تو کچھ گرجے اور تباہ شدہ مکانات عیسائیوں کی تحویل میں دیئے ہیں جن کی کوئی وقعت نہیں ہے۔(3) کچھ عرصہ بعد یروشلم پر قبضہ کرنا مسلمانوں کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔'' لیکن جنگ وجدل اور خون ریزی کے بعد یروشلم مسلمانوں کی ہیئت سالمہ کی ایک علامت بن چکا تھا اور کوئی مسلمان حکمران اس مقدس شہر کو کسی غیر مسلم کے حوالے کرنے کا مجاز نہیں تھا۔

عیسائیوں کو بھی اس خبر نے شدید صدمہ پہنچایا۔ ان کے نزدیک کافروں کے ساتھ اس طرح کا معاہدہ توہین مسیح کے مترادف تھا۔ ایک مسیحی شہر میں مسلمانوں کو حرم میں رہنے کی اجازت دینا ناقابل برداشت تھا، فریڈرک نے جب شہر مقدس کا دورہ کیا تو اس کے طرز عمل کو مشکوک نظروں سے دیکھا گیا۔ پوپ نے اسے مسیحی برادری سے خارج کر دیا تھا۔ کسی بطریق یا اسقف کو اجازت نہیں تھی کہ اسے یروشلم کا بادشاہ قرار دے کر اس کی تاجپوشی کرے۔(4) چنانچہ شہنشاہ نے گرجا مزار مقدس میں قربان گاہ کے پاس کھڑے ہو کر سادگی سے تاج اپنے سر پر خود ہی رکھ لیا۔ پھر وہ حرم میں گیا اور وہاں موجود مسلمانوں سے عربی میں لطیفہ بازی کرنے لگا۔ اس نے حرم کے طرز تعمیر کی خوب تعریف کی اور ایک پادری کو اس وقت پیٹ ڈالا جب اس نے بائبل سمیت مسجد اقصیٰ میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ فریڈرک یہ سن کر بہت پریشان ہوا کہ قاضی نے شہنشاہ کی موجودگی میں موذن کو خاموش رہنے کی ہدایت کر رکھی ہے۔ اس نے ہدایت کی کہ اس کے قیام کے دوران معمول کے مطابق اذان کہی جائے۔ ''یہ طرز عمل ایک صلیبی کو زیب نہیں دیتا''۔۔۔۔۔ معبدیوں نے مشتعل ہو کر فریڈرک کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ شہنشاہ نے سازش کی بھنک پڑتے ہی فلسطین چھوڑ دیا۔ جب وہ علی الصبح اپنے جہاز کی طرف روانہ ہوا، عکہ کے قصائیوں نے اس پر انتڑیوں اور اوجھڑیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ یروشلم اب مسیحی دنیا میں اتنا حساس مسئلہ بن چکا تھا کہ

جو شخص مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھتا یا شہر مقدس کے موضوع کو زیادہ اہمیت نہ دیتا وہ سب کی نظروں میں قابل گردن زدنی ٹھہرتا۔ فریڈرک کی داستان ظاہر کرتی ہے کہ اسلام اور مغربی دنیا اب ایک دوسرے کو برداشت کرنا ممکن نہیں سمجھتے تھے۔ دونوں طرف سے بقائے باہمی اور امن وسلامتی کی کسی خواہش کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

بلاشبہ جنگ بندی دس سال تک برقرار رہی، اگرچہ اس دوران حبرون اور نابلوس کے مسلمانوں نے فریڈرک کی رخصتی کے فوراً بعد شہر پر حملہ کیا اور ساحل سے یروشلم کو جانے والے زائرین کو شاہراہوں پر ہراساں کیا گیا لیکن صلح نامہ ختم نہ کیا گیا۔ عیسائیوں کے پاس شہر کے دفاع کے وسائل نہیں تھے۔ دشمن علاقے میں گھرا ہوا یہ شہر یکہ وتنہا تھا۔ 1239ء میں معاہدہ کی مدت پوری ہوئی تو کرک کے گورنر الناصر داؤد نے شہر کے چھوٹے سے محاصرہ کے بعد فرانکوں کو آسانی سے مغلوب کر لیا۔ لیکن ایوبی خاندان کے حکمرانوں میں داخلی کشمکش جاری تھی چنانچہ مصر کے سلطان کے خلاف مدد ملنے پر الناصر نے جلد ہی یروشلم واپس عیسائیوں کے حوالے کر دیا۔ اس مرتبہ مسلمان حرم کو اپنی تحویل میں نہ رکھ سکے۔ عیسائیوں نے مسجد اقصیٰ میں بڑی بڑی گھنٹیاں آویزاں کر دیں۔ قبۃ الصخرہ پر شراب کی بوتلیں رکھ کر رسم عشائے ربانی کی تقریب منعقد کی۔(5) لیکن عیسائیوں کا دور بھی مختصر ثابت ہوا۔ 1244ء میں خوارزمی ترکوں کی ایک فوج فلسطین میں در آئی۔ ان ترکوں کے اپنے علاقے وسطی ایشیا میں منگول بلائے ناگہانی بن کر نازل ہوئے تھے۔ یہ لوگ منگولوں سے ہزیمت اٹھا کر مشرق قریب کو بھاگ آئے اور مصر کے سلطان کے حلیف بن گئے۔ اب یہ شام میں مصر کے سلطان کی فوجوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ انہوں نے دمشق کو سرنگوں کرنے کے بعد یروشلم پر چڑھائی کر دی۔ عیسائیوں کو قتل کر کے گرجوں اور خانقاہوں کو لوٹ لیا گیا۔ گرجا مزار اقدس ان کی غارت گری کا خصوصی نشانہ بنا۔ شہر اب ایک بار پھر ایوبی خاندان کے پاس تھا لیکن اس کے زیادہ تر گرجے اور مکانات محض سلگتے ہوئے کھنڈر تھے۔ اس تباہی کے بعد زیادہ تر باشندے ساحلی شہروں کی طرف بھاگ گئے۔ شہر میں ایک مرتبہ پھر ہو کا عالم تھا۔ گنجان آباد عروس البلاد میں اب گنتی کے دو ہزار مسلمان اور عیسائی رہ گئے۔

فرانس کے بادشاہ لوئی نہم کی قیادت میں ساتویں صلیبی جنگ یروشلم کی بازیافت میں بری طرح ناکام رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ 1250ء میں پوری فوج کئی ماہ تک مصر میں جنگی قیدیوں کی حیثیت سے رکھی گئی۔ جن دنوں صلیبی مجاہدین قید میں تھے، مصر کے ایوبیوں کو منحرف مملوکوں کے ایک گروہ سے شکست اٹھانا پڑی۔ مملوکوں نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ سلطان صلاح الدین کے بعد اس کا ایک جانشین کاکیشیا کے علاقے سے بڑی تعداد میں ترک غلام لے آیا اور انہیں اپنی فوج میں شامل کر لیا۔ یہ سفید فام غلام مملوک کہلاتے تھے۔ مملوک کے معنی ہی غلام ہیں۔ ان کو بڑی احتیاط کے ساتھ فوج کے لیے منتخب کیا جاتا تھا۔ جسمانی لحاظ سے یہ بہت اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ چند برسوں بعد ان مملوکوں نے بغاوت کر دی اور اپنے ایک ہم نسل کو سلطان بنا لیا۔ مملوکوں کو چونکہ بچپن ہی میں غلام بنا لیا تھا چنانچہ وہ مسلمانوں کی تعلیم وتربیت میں رہے اور راسخ العقیدہ مسلمان بن گئے۔ مصر پر قبضہ کرنے کے بعد مملوک مشرق قریب میں ایک بڑی اور اہم قوت بن گئے۔

مملوکوں کے ابھارنے ابتدا میں یروشلم کو قطعاً متاثر نہ کیا۔ ایوبی سلطنت کے تمام حصوں میں ان کی مخالفت کی گئی اور یروشلم بھی ان میں شامل تھا۔ لیکن یروشلم مسلسل عدم استحکام کا شکار تھا۔ 1260ء میں مملوک سلطان الظاہر بیبرس (1260-76ء) نے حملہ آور منگول فوج کو عین جالوت کے مقام پر گلیلی میں شکست دی۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ منگولوں نے عباسی خلافت کو نیچا دکھا دیا تھا۔ بغداد سمیت سبھی بڑے بڑے اسلامی شہروں کو مسخر کر کے بری طرح تباہ برباد کیا گیا۔ اب بیبرس انہیں فرات سے پرے دھکیل کر اسلام کا ہیرو بن گیا تھا۔ چونکہ ایوبی سلطانوں کو منگول ہزیمت سے دوچار کر چکے تھے۔ چنانچہ بیبرس اب شام و فلسطین کا بھی حکمران تھا۔ اسے ابھی بچے کھچے منگول حملہ آوروں سے نمٹنا تھا۔ اور پھر اس کی نظر فرانکوں پر تھی جنہیں وہ ان کی ساحلی ریاست سے نکالنا چاہتا تھا۔ انجام کار مملوک اس خطہ میں وہ امن تخلیق کرنے میں کامیاب ہو گئے جو طویل عرصہ سے ناپید تھا۔

مملوکوں کے لیے یروشلم کی کوئی عسکری اہمیت نہ تھی چنانچہ انہوں نے اس کی دیواریں تعمیر کرنے کی طرف کبھی توجہ نہ دی۔ لیکن وہ شہر کے تقدس کا دل و جان سے احترام کرتے تھے۔ ان کے دور میں شہر کی مذہبی حیثیت میں بہت اضافہ ہوا۔ مملوکوں کے ہر سلطان نے یروشلم آنا ضروری سمجھا اور وہاں نئی عمارتیں بنائیں۔ جب بیبرس نے 1263ء میں القدس کا دورہ کیا تو حرم میں بحالی کا کام شروع کرانے کے ساتھ ساتھ اس نے یروشلم کے تحفظ کا ایک تصوراتی حل سوچا۔ ایسٹر بالخصوص ایک خطرناک موقع ہوتا تھا کیونکہ شہر عیسائیوں سے بھرا پڑا تھا۔ بیبرس نے دو مقدس مقامات بنوائے۔ ایک کو ''نبی موسیٰ'' سے موسوم کیا جبکہ دوسرے کو عرب پیغمبر ''نبی صالح'' سے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے موسوم مقام یریحو کے قریب بنایا گیا اور حضرت صالح علیہ السلام کی نسبت سے رملہ میں تعمیر کیا۔ ان پیغمبروں کے ایام ایسٹر سے پہلے ہفتہ کے دوران آتے تھے۔ چنانچہ یروشلم اس موقعہ پر خوش عقیدہ مسلمان زائرین کے ہجوم میں گھر جاتا تھا۔ ''نبی موسیٰ'' بالخصوص اہمیت اختیار کر گیا۔ مسلمان زائرین یروشلم کے گرد اکٹھے ہو جاتے اور پھر جلوس کی صورت میں گلیوں میں سے گزرتے ہوئے حرم میں پہنچتے۔ ان کا یہ انداز عیسائیوں جیسا تھا جنہیں وہ صدیوں سے دیکھتے آ رہے تھے۔ وہ القدس پر اپنی ملکیت کا مظاہر کرتے جس طرح عیسائی کرتے رہے تھے۔ خصوصی طور پر ''نبی موسیٰ'' کا علم لہرایا جاتا۔ تمام زائرین یروشلم میں جمع ہونے کے بعد ''نبی موسیٰ'' کی درگاہ کی طرف روانہ ہوتے۔ اس بات کا بالخصوص اہتمام کیا جاتا کہ عیسائی ان کی کثیر تعداد کو دیکھ لیں۔ ''نبی موسیٰ'' کے مقدس مقام پر مسلمان پورا ایک ہفتہ قرآن خوانی میں گزارتے۔ صوفیا کی مخصوص رسوم ادا کرتے اور درگاہ کے صحن میں اور اردگرد پہاڑیوں پہ خیمے نصب کر کے خوشگوار انداز میں وقت گزارتے۔ اس دوران عیسائی زائرین یروشلم میں ایسٹر کا تہوار مناتے۔ انہیں یہ احساس رہتا کہ قریب ہی مسلمان انبوہ موجود ہے جو القدس کے تحفظ کے لیے جھپٹ پڑنے کو تیار ہے۔ یہ ایک تصوراتی حکمت عملی تھی لیکن ''نبی موسیٰ'' کی تقریبات اور دیگر تہوار جو نئے مقدس مقامات پر منائے جاتے تھے، اس امر کے غماض تھے کہ مسلمانوں میں ایک نئی قسم کی مدافعت تشکیل پا رہی ہے۔

یروشلم کے لیے یہودیوں کی وابستگی میں ایک عسکری عنصر بتدریج داخل ہو رہا تھا۔ 1267ء میں ربی موسیٰ بن نخمن کو ہسپانیہ سے ملک بدر کیا گیا۔ اس نے یروشلم کو مراجعت اختیار کر لی۔ اسے شہر کی یہ حالت پسند نہ آئی جہاں اس کی آمد کے دنوں میں صرف دو یہودی خاندان پائے جاتے تھے۔ نخمن کی مزاحمت کسی نے نہ کی۔ چنانچہ اس نے ایک ویران مکان میں صومعہ تعمیر کیا اور اس کے ساتھ ایک خوبصورت محراب بنائی۔ یہ مکان یہودیوں کے رہائشی علاقے میں تھا۔ صومعہ کو رمیان کنشت کا نام دیا گیا۔ مملوکوں کے دور میں یہ صومعہ یروشلم کے یہودیوں کا مرکز بن گیا۔ یہودی طلباء نخمن کی علمی شہرت سے متا ثر ہو کر یروشلم میں منتقل ہونے لگے نخمن کے ''یا شیوا'' میں یہودی تعلیمات خصوصاً تالمود کا درس دیا جانے لگا۔ بے وطنی کے اس نئے دور میں نخمن کو یروشلم میں آ کر بھرپور تسکین ملی۔ وہ اپنے آبا و اجداد کے شہر میں اس کے پتھروں کو چھو سکتا تھا۔ عقیدت سے چوم سکتا تھا۔ وہ بنی اسرائیل کی عظمت کو یاد کرتا اور مقدس شہر کی بے حرمتی پر روتا۔(6) تباہ شدہ شہر اس کے لیے اپنی بیوی اور بچوں کا متبادل تھا جنہیں وہ ہسپانیہ میں چھوڑ آیا تھا۔ وہ اپنے عقیدے کا بھرپور اظہار کیا کرتا تھا کہ تمام یہودیوں کا فرض ہے کہ وہ یروشلم میں آ کر آباد ہوں۔ یروشلم اور مضافات کے دیہات کی المناک صورتحال اس کے نزدیک تین سو برسوں کی غا رت گری اور خون ریزی کے بعد اب اس حقیقت کی مظہر تھی کہ یہ علاقہ عیسائیوں یا مسلمانوں کے ماتحت کبھی خوشحالی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ اب وہ اپنے حقیقی مالکوں کے انتظار میں ہے۔ نخمن اپنے طلبا کو تعلیم دیتا کہ یروشلم کو مراجعت ہی ایک مثبت اقدام اور فرمان الٰہی ہے۔ یہ حکم یہودیوں کی تمام نسلوں کے لیے حتمی ہے۔ سامی النسل لوگوں کے خلاف جس تعذیب و ابتلا کا تجربہ نخمن کو ہسپانیہ میں ہوا تھا۔ اس نے اس کی روح میں ایک سفا کی بھر دی تھی اور اب وہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے خلاف اسی مخاصمت سے لبریز تھا جو ماضی میں یہودیوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں اندلس میں ملی تھی لیکن وہ اپنی بقا میں کامیاب رہے تھے۔ اب وہ اپنے یہودی ساتھیوں کو جن لفظوں میں پند و نصیحت کرتا وہ فلسطین میں اس کی قوم کی مذہبی اور سیاسی حریفوں کے لیے انتہا پسندی کے مظہر تھے۔

''جو قومیں ہم پر جنگ مسلط کریں گی ہم انہیں تباہ کر کے رکھ دیں
گے لیکن اگر وہ امن و امان چاہیں گی تو ہم ان کے ساتھ امن و امان
کے ساتھ رہیں گے اور انہیں اپنی شرائط پر رہنے کی اجازت دیں
گے لیکن اپنی سرزمین کو ان کے یا کسی اور قوم کے ہاتھوں
میں کبھی بھی نہیں دیں گے(7)

مشرق میں صلیبی جنگوں اور یورپ میں تسخیر نو کے جنون نے حضرت ابراہیمؑ کے تینوں مذاہب میں دائمی دشمنی پیدا

کر دی۔نخمن ، یہودیوں کے فرقہ باطنیہ کا عالم تھا۔ باطنی علم کو تیرھویں صدی عسوی میں ہسپانیہ میں فروغ ملا۔اگر چہ بہت کم یہودی اس فرقہ کی ریاضت کو پوری طرح سرانجام دینے کی صلاحیت رکھتے تھے لیکن اس کے عقائد اور تصورات یہودی پار سائی کی علامت بن گئے۔فرقہ باطنیہ کی اساطیر نے یہودیت کی خردمندی پر غلبہ پالیا۔اپنی نئی ابتلا میں ہسپانیہ کے یہودیوں کے لیے علم وحکمت کا خدا تسکین کا ذریعہ نہیں تھا۔وہ جبلی طور پر اسی پرانی تقدیس کے تصور کی طرف لوٹ گئے۔اس میں انہیں داخلی اطمینان کا بھرپور احساس ملتا لیکن اب انہیں دیور کے ناقبل رسائی خدا سے پھوٹنے والی تقدیس کے دس درجوں کی بجائے، ربوبیت ناقابل تصور اور بے پایاں دکھائی دیتی۔اس ربوبیت کو وہ این صور یعنی لامحدود کہتے۔یہ دنیا کی طرف دس طریقوں سے اترتی۔اس میں سے ہر ایک خدا کے الہام کی اگلی منزل کی نمائندگی کرتا۔خدا اپنی الوہیت میں انسانوں کے محدود اذہان کے لیے مطابقت پیدا کر دیتا ہے۔لیکن یہ دس طریقے شعور کے ان درجوں کی ہی نمائندگی کرتے جن کے ذریعے صوفیا خدا کی طرف مراجعت کرتے یا خدا سے وصال کی منزل پاتے۔لیکن یہ عمل بھی وہی داخلی معراج تھا جو ذات کی گہرائیوں میں لے جاتا۔فرقہ باطنیہ کے تصورات یروشلم کے معبد کی روحانیت کی ایک نئی تجسیم تھے جو خدا اور انسان دونوں کی دائمی زندگی کی علامت تھی۔فرقہ باطنیہ الوہیت اور انسانیت کے درمیان پائے جانے والے درجوں کی شناخت پر زور دیتا تھا۔آخری درجہ شیکنہ تھا جسے ملکوت یعنی خدائی سلطنت بھی کہا جاتا۔یہ الوہی موجودگی اور بنی اسرائیل کو متحد کرنے والی وقت دونوں کی نمائندگی کرتا تھا۔کرہ ارض پر یہ آخری درجہ صیہون کی صورت میں موجود تھا، جسے اس کی ارضی حقیقت سے نکالے بغیر ملکوتی دائرے میں اٹھالیا گیا تھا۔شیکنہ میں اسرائیل اور یروشلم ایک گہرے مفہوم میں ناقابل تقسیم تھے۔

فرقہ باطنیہ نے خدا سے وصال یا مراجعت کو اجنبی سرزمین میں رہتے ہوئے یروشلم میں پہنچے بغیر ممکن بنالیا۔لیکن ان کا عقیدہ اب بھی یہ تھا کہ صیہون سے یہودیوں کی دوری شیطانی قوتوں کی فتح ہے۔(8) خروج کے دوران بنی اسرائیل کو مجبور کیا گیا تھا کہ وہ دہشت ناک صحراؤں میں بھٹکتے پھریں اور ان شیطانی قوتوں کا مقابلہ کریں جو صحراؤں میں گھومتی رہتی ہیں۔جب بنی اسرائیل نے ارض موعود پر قبضہ کرلیا اور کوہ صیہون پر اپنی مذہبی رسوم ادا کرنا شروع کر دیں تو بدنظمی ختم ہوگئی اور ہر چیز اپنی ترتیب اور موزوں مقام پر آگئی۔پوری دنیا کے لیے نظم وضبط، زرخیزی اور برکت کا ذریعہ شیکنہ دیور (خانہ اقدس) میں مقیم ہوگئی۔لیکن جب معبد کو منہدم اور یہودیوں کو یروشلم سے جلاوطن کر دیا گیا تو انتشار کی شیطانی قوتیں غالب آگئیں۔اب پوری کائنات کے مرکز میں ایک گہرا عدم توازن تھا۔''یہ عدم توازن اسی وقت دور ہوسکتا ہے جب یہودی صیہون سے پھر اتحاد پیدا کریں اور اپنے مناسب مقام پر بحال ہوں۔'' یہ تصور ظاہر کرتا ہے کہ جغرافیائی دربدری نے یہودی روح کو کس قدر بے چین کر رکھا تھا۔اب جبکہ یہودیوں کو ہسپانیہ سے عیسائی بالجبر ملک بدر کر رہے تھے، انہیں ایک نئی اجنبیت اور گمنامی کے احساس نے مغلوب کرلیا تھا۔صلیبیوں کے جبر وتشدد نے ان کی زندگیاں ناقابل برداشت بنا رکھی تھیں۔اس مرحلہ پر بھی بہت سے یہودی یروشلم کو روحانی اور علامتی مراجعت پر مطمئن تھے۔دراصل اب بھی فلسطین کو مراجعت کے ذریعے نجات کا

مرحلہ جلد از جلد لانے کی کوشش کو غلط سمجھا جا رہا تھا۔لیکن کچھ باطنی نجمن کی طرح یروشلم سے جسمانی رابطہ کو ہی اپنے دکھوں کا مداوا سمجھتے تھے۔

مغرب کے عیسائیوں کو اس حقیقت کا سامنا تھا کہ اب وہ یروشلم پر کبھی قبضہ نہیں کر سکیں گے اور انہیں اس نقصان کی تلافی کسی اور طرح کرنا ہوگی۔ 1291ء میں مملوک سلطان خلیل نے آخر کار عکہ کی سلطنت ختم کر دی اور فرانکوں کو اس ساحلی ریاست سے خارج کر دیا۔پچھلے دو سو برسوں میں پہلی مرتبہ پورا فلسطین مسلمانوں کے تصرف میں تھا۔اس مرحلہ پر یروشلم کی قسمت چکم اٹھی۔فرانک جب منظر سے پوری طرح غائب ہو گئے تو مسلمانوں نے محسوس کیا کہ اب وہ وہاں جا کر پوری عافیت کے ساتھ آباد ہو سکتے ہیں۔شہر اگر چہ اب قلعہ بند نہیں تھا لیکن محفوظ تھا۔ادھر عیسائیوں نے ابھی مکمل شکست تسلیم نہیں کی تھی۔وہ یروشلم سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔صدیوں تک وہ نئی صلیبی جنگوں کی منصوبہ بندی کرتے رہے اور شہر مقدس کو آزاد کرانے کے خواب دیکھتے رہے۔ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یروشلم میں کسی نہ کسی نوعیت کی مغربی موجودگی کو محفوظ رکھنا ناگزیر ہے۔عکہ کے سقوط کے فوراً بعد پوپ نکولس چہارم نے سلطان کو کہا کہ لاطینی پادریوں کی ایک جماعت کو مزار مقدس کی خدمت کے لیے یروشلم میں رہنے کی اجازت دی جائے،سلطان راضی ہو گیا۔پوپ چونکہ خود فرانسسکن تھا۔ چنانچہ اس نے فرانسسکن پادریوں کی اک جماعت روانہ کی تا کہ یروشلم میں لاطینی عقائد کے مطابق مذہبی رسوم جاری رہیں۔اس جماعت کے پاس نہ تو کوئی خانقاہ تھی اور نہ ذریعہ آمدنی چنانچہ اسے عام قسم کے زائرین کے مسافر خانہ میں رہنا پڑا۔1300ء میں ان پادریوں کی حالت زار کی طرف

MAP (نقشہ)

مملوکوں کے دور میں یروشلم

(1517--125ء)

سسلی کے بادشاہ رابرٹ کی توجہ دلائی گئی۔اس نے سلطان کو ایک بہت بڑی رقم بھجوائی اور درخواست کی کہ فرانسسکن پادریوں کو کوہ زیہون پر ایک گرجا،مزار

MAP (نقشہ)

مملوکوں کے دور میں حرم الشریف

تفصیل

1۔نمبر سے 52۔نمبر تک

مقدس کے گرجا میں ایک خانقاہ اور مولد مسیح (غار) دے دیئے جائیں۔ سلطان نے یہ درخواست بھی قبول کر لی۔ یہ پہلا موقع تھا جب کسی مغربی حکومت نے یروشلم میں لاطینی مسلک کے فروغ کے لیے اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا۔ اب زیہوں کا گرجا فرانسسکن عیسائیوں کا نیا مرکز اور فادر، مشرق میں رہنے والے یورپیوں کا کسٹوس یعنی سرپرست بن گیا۔ حقیقت میں وہ یروشلم میں ایک سفیر کا کردار ادا کر رہا تھا۔ فرانکوں نے دنیا بھر میں اسلام کے خلاف عسکری پالیسیاں وضع کر رکھی تھیں اور یورپ میں ان کی تبلیغ سے سامی النسل لوگوں کا قتل عام ایک معمول تھا چنانچہ یروشلم میں ان کے بارے میں اطمینان بخش تاثر نہیں ہوسکتا تھا۔

صلیبیوں اور منگولوں کا خطرہ ٹل جانے کے بعد فلسطین میں مکمل امن وامان تھا۔ مملوکوں کے ماتحت یہ علاقہ تیزی سے خوشحال ہوا۔ یروشلم ان کی سلطنت میں کبھی بھی اہم سیاسی مرکز نہ تھا۔ اس پر معمولی درجہ کے امیر کی حکومت رہی۔ عام طور پر ناپسندیدہ عمال کو جلا وطن کر کے یہاں بھیجا جاتا تھا۔ اس غیر قلعہ بند شہر میں رہ کر وہ بہت کم نقصان پہنچا سکتے تھے۔ لیکن جلا وطن ہو کر آنے والے زیادہ تر عمال القدس کی مذہبی زندگی میں جذب ہو گئے۔ کچھ عمال و حکام کو یروشلم اور حبرون کے حرموں کے نگرانوں کا ممتاز منصب دے دیا گیا۔ جبکہ بہت سے افراد نے وقف بنا لیے۔ ''عمارتی جہاد'' جاری رہا۔ اس کے نتیجہ میں صوفیاء، علما، اساتذہ، فقہیہ اور زائرین یروشلم کا رخ کرتے رہے۔ مملوکوں نے شہر کا نقشہ بدل دیا۔(9) صرف سلطانوں کو حرم کی حدود میں تعمیرات کی اجازت تھی۔ چنانچہ بہت سے سلطانوں نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ 1317ء میں سلطان الناصر محمد نے حرم کے مغرب اور شمال میں ستون دار برآمدے بنانے کا حکم دیا۔ اقصیٰ کا گنبد از سر نو تعمیر کیا گیا۔ قبتہ الصخرہ کا نیا ہال بھی بنوایا گیا۔ صلیبیوں کے پرانے بازار کے مقام پر نیا تجارتی مرکز بنا۔ چودھویں صدی کی ابتدا میں یروشلم آسودگی کا نیا منظر پیش کر رہا تھا۔ صابن، سوتی اور اونی مصنوعات شہر میں تیار ہو رہی تھیں۔ حرم کی دستاویزات بتاتی ہیں کہ غیر ملکی تاجر خصوصاً مشرق سے آنے والے کپڑے کے سوداگر اکثر و بیشتر شہر میں موجود ہوتے تھے۔ سلطان کا بنایا ہوا نیا بازار، سوق الکتانین (سوتے کپڑے کے تاجروں کا بازار) کہلاتا تھا۔ سلطان کی خواہش تھی کہ یہ بازار حرم کی دیوار سے متصل ہو۔ چنانچہ وہاں اس نے باب الکتانین کے نام سے ایک شاندار دروازہ بنوایا۔ حرم کے چبوترہ تک پہنچنے کے لیے اس میں 27 قدموں کا زینہ تھا۔

مقدس مقامات سے جسمانی رابطہ قائم کرنے کی خواہش یروشلم سے یہودیوں اور عیسائیوں کی وابستگی کا امتیازی اظہار رہی ہے۔ مسلمانوں میں بھی یہ خواہش موجود تھی۔ مملوکوں کے دور میں حرم کو چھونے کی خواہش یا اس سے جسمانی رابطہ رکھنے کی تمنا کا اظہار ان نئے مدرسوں کی تعمیر کی صورت میں نظر آتا ہے جو حرم کے برآمدوں پر بنائے گئے۔ عموماً معماروں کو اختراع اور خوش تدبیری سے کام لینا پڑتا تھا کیونکہ جگہ بہت کم ہوتی تھی۔ حرم کے مغربی اور شمالی کناروں پر یا ان کے اردگرد ہی کچھ تعمیر کرنا ممکن ہوتا تھا کیونکہ مشرقی اور جنوبی کناروں پر تیز ڈھلوانیں تھیں۔ لیکن مدرسہ بنوانے والوں کی ایک ہی خواہش ہوتی تھی۔ کہ حرم کا منظر نظر میں رہے یا مقدس زمین سے ان کا اتصال ممکن ہو۔ نئی عمارتوں میں سب سے پہلے بننے والی عمارت ایک وقف سے تعلق رکھتی تھی جو شام کے امیر، تنزیق نے 1326 میں مغربی معاون دیوار کے ساتھ بنوائی۔ اسے اس بات پہ بالخصوص ناز تھا کہ اسلام کے تیسرے افضل ترین مقام کے قریب اس کی عمارت ہے۔ تنزیقیہ مدرسہ کی مسجد میں ایک کتبہ پر تحریر تھا: ''اس کی مسجد کو (خدا نے) مسجد اقصیٰ کا پڑوسی بنایا اور ایک متبرک پڑوس کتنی اچھی چیز ہے۔'' یہ عمارت نہایت عمدگی سے مزین کی گئی۔ اس کی شکل صلیب جیسی تھی۔ درس و تدریس کے لیے چار بڑے کمرے اور باجماعت نماز کے لیے مرکزی صحن تھا۔ طنزیقیہ محض فقہی مدرسہ نہیں تھا۔ اس میں ایک خانقاہ بھی تھی جس میں بیک وقت گیارہ صوفیا قائم کر سکتے تھے۔ علاوہ ازیں یتیموں کے لیے ایک مدرسہ تھا۔ مراقبہ، مطالعہ اور درس و تلمیذ کے علاوہ فلاح و بہبود کے کام بھی یہاں کئے جاتے تھے۔ عمارت کا نقشہ ارتباط کی خواہش کا مظہر تھا۔ مقدس مقامات سے ارتباط کا تصور بھی اسلامی تصورات میں اہمیت رکھتا تھا۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انسانی ہمدردی کا عملی اظہار القدس کے اسلامی کردار میں جاری و ساری تھا۔ معماروں نے دیکھ لیا تھا کہ تمام شعبوں کے لیے کافی جگہ نہیں ہے چنانچہ صوفیا کی خانقاہ حرم کی مغربی دیوار یعنی ستون دار برآمدے یا غلام گردش پر بنائی گئی۔ یوں صوفیا اپنی ریاضت اور استغراق کے دوران قبۃ الصخرہ پر نظریں جما سکتے تھے۔

دیگر مخیّر حضرات نے بھی طنزیق کی پیروی کی۔ امینیہ مدرسہ (30-1229ء) ایک تنگ سی پٹی پر بنایا گیا۔ یہ محض نو میٹر چوڑی تھی اور انتونیوں چٹان کی مشرقی نوک اور گلی کے درمیان واقع تھی۔ چنانچہ اسے عمودی انداز میں بنایا تھا۔ اس کی تیسری منزل شمالی برآمدے کی چھت پر بنائی گئی۔ مالکیہ مدرسہ کے لیے بھی یہی حل سوچا گیا۔ تاکہ فقہی مدرسہ کے فرش سے حرم نظر آتا رہے۔ منجاکیہ مدرسہ (1361ء) کی تمام تر عمارت ڈیوڑھی اور باب الناظر پر بنائی گئی تھی۔ مملوک دور میں یہ دروازہ بڑے اور مصروف دروازوں میں سے ایک ہوتا تھا۔ طلونیہ مدرسہ فارانیہ مدرسہ بھی شمالی ڈیوڑھی پر بنائے گئے تھے۔ یہ دونوں باب الاسباط کے مینار کے پہلوؤں میں تھے۔ انمیں پہنچنے کے لیے طلبہ مینار کے تنگ زمینوں کو استعمال کرتے تھے۔

MAP (نقشہ)

حرم الشریف کے ایک گوشے کا منظر۔ مملوکوں نے برآمدوں
کی چھتوں اور ملحقہ ٹیلوں کا سہارا لے کر مدرسے تعمیر کئے۔

یہودیت کی طرح اسلامی قوانین کی تعلیم خشک اور محض علمی دستور العمل نہیں تھی بلکہ صوفیانہ انداز میں دل و دماغ کو خدا سے مربوط کرنے کا ایک ذریعہ تھی۔ قبتہ الصخرہ روحانی معراج کی عظیم اسلامی علامت تھی۔ اس کو آنکھوں میں بسا کر ریاضت کرنا دل و دماغ کو سرشاری کا احساس دیتا تھا۔ منگولوں کے حملوں کے بعد مدرسوں نے ایک نئی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ بہت سی لائبریریاں، مخطوطے اور فن پارے منگولوں کے حملوں میں تباہ و برباد اور نذر آتش کئے جا چکے تھے۔ چنانچہ اپنی تعلیمات کی تدریس کے لیے مسلمانوں میں ایک نیا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ اس کی ضرورت بھی تھی کیونکہ جو کچھ ضائع ہو چکا تھا اسے پھر سے بنانے اور لکھنے لکھانے کا عمل ایک جہاد سمجھ کر کیا جا رہا تھا۔ غالباً ناگزیر انداز میں ایک نئی قدامت پسندی مسلمانوں کے خیالات میں داخل ہوگئی۔ نئے مدارس حرم کے اردگرد حفاظتی نکتہ نظر سے بنائے گئے۔ انہیں مقدس مقام اور دشمن دنیا کے درمیان فصیل کی حیثیت سے دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ ایک نئی مدافعت کا اظہار تھے جو یروشلم کے لیے مسلمان اب چاہتے تھے۔ اسے سادہ قسم کے رباطوں (مسافر خانوں اور شفاخانوں پر مشتمل عمارتوں) میں بھی دیکھا جا سکتا تھا جو شہر بھر میں تعمیر کئے جا رہے تھے۔ ابتدا میں رباط ایک طرح کا عسکری قلعہ ہوا کرتا تھا لیکن اب اسے صوفیا، نادار افراد اور زائرین کی رہائش کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

نئی قدامت پسندی کا مقابلہ صوفی تحریک نے کیا۔ اسے منگولوں کی تاخت و تاراج کے بعد پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔ کیونکہ مسلمان اس بلائے ناگہانی اور اپنے مصائب کو کوئی اور مفہوم دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ چودھویں صدی میں مسلمان صوفیا جتنی بڑی تعداد میں یروشلم میں جمع ہوئے، ماضی میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں تھی۔ ان میں سے کچھ نے حرم کے اردگرد عمارتوں میں رہائش رکھ لی۔ بقیہ پورے شہر میں بکھر گئے۔ صوفی ازم یہودیت کی طرح ''منتخب لوگوں'' کا مسلک نہیں تھا۔ یہ ایک عوامی تحریک تھی لیکن مکمل طور پر انفرادی سطح پر درآمد چاہتی تھی۔ اس نے عام لوگوں کو ''علما کی روایتی تعلیمات'' کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ دیا۔ تاہم کچھ صوفی شیوخ اپنے مدارس میں فقہ کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ انجام کار صوفی ازم اسلامی دنیا میں آزادی رائے متعارف کرانے کا ذریعہ بن گیا۔ صوفیا مذہب کے مسلمہ عقائد کو اس صورت میں قبول نہ کرتے جس صورت میں مذہبی رہنما پیش کرتے تھے۔ صوفیا اپنے بڑے بڑے حلقے تشکیل دے رہے تھے۔ ان میں سے کچھ یروشلم میں بھی قائم ہو چکے تھے۔ لیکن مسلمان صوفیا اپنے حلقے کے ارکان کو عیسائی صوفیا کی طرح دنیا سے منہ موڑنے کی تعلیم نہیں دیتے تھے۔ یروشلم میں سب سے بڑا اور موثر حلقہ سلسلہ قادریہ تھا۔ اس کا مرکز پرانے عیسائی ہسپتال یا شفاخانے

میں تھا۔

قادریہ حلقہ کے صوفی سکھاتے تھے کہ سماجی انصاف سب سے بڑا مذہبی فریضہ ہے۔ روحانیت اور تزکیہ نفس کے لیے جہاد ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ انسانی ہمدردی کے لیے جہاد کا اشتراک بھی ہونا چاہیے۔ بسطامیہ حلقہ کے صوفی شہر کے شمال میں مقیم تھے۔ یہ اپنے ارکان کو یوگا جیسی ریاضتیں بھی سکھاتے تھے تاکہ وہ اپنے لاشعور میں موجود خیالات کے گہرے بہاؤ پر توجہ مرکوز کر سکیں کیونکہ یہی خیالات خوابوں اور کشف میں ظاہر ہوتے ہیں لیکن یہ حلقہ ''صلح کل'' یعنی عالمی مفاہمت کے فروغ کے لیے بھی کوشاں تھا تاکہ مختلف مذہبی تعلیمات کو سمجھنا ایک دوسرے کے لیے ممکن ہو سکے۔ صدیوں کی نفرت اور جنگ وجدل کے بعد یہ ایک ایسی مفاہمت کی تلاش تھی جو کشیدگی کے شکار شہر القدس کے لیے بہت قیمتی اور ضروری تھی۔

قدامت پسندوں اور اختراع پردازوں کے درمیان محاذ آرائی کو چودھویں صدی کے مصلح تقی الدین ابن تیمیہ کی تحریروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس نے یروشلم کے لیے عقیدت و وابستگی میں نئی شدت کے خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ وہ اسے اسلامی تعلیمات کے منافی سمجھتا تھا۔ مملوکوں کے دور میں فضائل القدس میں کم از کم تیس نئے فضائل کا اضافہ کیا گیا۔ شہر کی تقدیس کے بارے میں پرانی روایات کو دہراتے ہوئے مسلمانوں پر زور دیا گیا کہ وہ یروشلم (لقدس) کی زیارت کریں۔ حرم کی عقیدت میں کچھ ایسی باتیں داخل ہوگئی تھیں جو ابن تیمیہ کے لیے پریشان کن تھیں۔ ہم پچھلے صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ کسی زمانے میں مسلمان حج کی رسوم یروشلم میں ادا کرنا پسند کرتے تھے۔ اس طرح وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ القدس کی تقدیس مکہ کی مرہون منت ہے۔ ابن تیمیہ کا اصرار تھا کہ القدس کی زیارت کو مکہ کے حج سے بالکل مختلف رکھا جانا ضروری ہے۔ وہ اپنے رسالہ ''زیارات یروشلم'' میں کہتا ہے کہ یروشلم میں صخرہ (چٹان) کے گرد دائرہ بنانا اور اسے چومنا طواف کعبہ اور حجر اسود کو بوسہ دینے کی نقل ہے۔ وہ اسے بدعت اور ناقابل برداشت قرار دیتا ہے۔ اسی طرح وہ کہتا ہے کہ مولد مسیح اور گہوارہ مسیح کے متبرک مقامات فرضی اور من گھڑت ہیں اور احمق لوگ ہی انہیں اہمیت دے سکتے ہیں۔ ابن تیمیہ یروشلم کو عالم اسلام کا تیسرا افضل ترین مقام تو سمجھتا ہے لیکن اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ اس کی زیارت محض ذاتی عقیدت و وابستگی ہے، حج کی طرح یہ مسلمانوں پر فرض نہیں ہے۔ اصل روایات کے تحفظ اور بدعت کے بطلان کے لیے اس کا جوش و جذبہ اپنے وقت کا امتیازی اقدام تھا لیکن یروشلم کے لیے عقیدت میں راستی اور سادہ و سخت نکتہ نظر لوگوں کی اکثریت کو متاثر نہ کر سکا۔ مسلمانوں کی بڑی تعداد نے ابن تیمیہ کے خیالات قبول نہ کئے۔ وہ مسلسل ''فضائل القدس'' کا حوالہ دیتے اور یروشلم کی مذہبی رسوم کو مستند اسلامی فرائض قرار دیتے رہے۔

یہ ایک عقیدت تھی جسے شعوری طور پر پیدا کرنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ فضائل القدس میں شامل چند فضائل زیارت کو ایک ایسا نیک عمل قرار دیتے تھے جس کی ادائیگی کے لیے حوصلے اور برداشت کی ضرورت تھی۔ ''یروشلم میں رہنے وا

لاہر شخص 'جہادی' ہے۔۔۔۔۔'' یہ بات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلام سے منسوب کر کے نئی سامنے آنے والی احادیث میں شامل کر دی گئی۔ کچھ لوگ القدس کی زیارت کو ایک کٹھن سفر قرار دے کر غیر ضروری سمجھتے تھے۔(10) چودھویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں مملوک اقتدار میں پہلی دراڑ نمودار ہوئی۔ نئے سلطانوں کے لیے اپنا اقتدار اعلیٰ برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ صلیبیوں کے دور میں بدوی یروشلم پر حملہ آور ہونے سے ڈرتے تھے۔ انہوں نے اپنی دراندازی پھر شروع کر دی۔ 1348ء میں انہوں نے حقیقتاً شہر کے تمام باشندوں کو باہر نکال دیا۔ 53-1351ء میں یورپ میں پھیلنے والی طاعون سے یروشلم بھی شدید متاثر ہوا۔ شہر سیاسی عدم استحکام کا بھی شکار رہا۔ مملوک اس علاقے میں گورنروں کو مختصر عرصہ کے لیے تعینات کرتے انہیں مقامی حالات سے پوری طرح آگاہی نہیں ہوتی تھی۔ پندرھویں صدی کے اوائل میں بدویوں کے حملوں میں شدت آ گئی۔ ادھر فلسطین کے ساحلی شہروں کو عیسائی قزاق لوٹنے لگے۔ معیشت تباہ ہو گئی۔ ٹیکسوں میں اضافہ کر دیا گیا۔ شہر میں وقفے وقفے سے بلوے ہونے لگے جن میں مالی نقصان کے ساتھ ساتھ انسانی جانوں کا ضیاع ایک معمول بن گیا۔ ان مسائل کے باوجود عمارتی جہداد جاری رہا۔ سلطان الناصر حسن (51-1347ء) اور الصالح صالح (54-1351ء) نے مسجد اقصیٰ میں توسیع و مرمت کی۔ حرم الشریف کے اردگرد اور شہر میں نئے مدارس اور رباط وجود میں آئے۔ ان کاموں کے لیے دولت شہر میں آتی رہی لیکن اس نے معیشت بہتر بنانے میں کوئی کردار نہ ادا کیا کیونکہ مدارس وغیرہ پیداواری ذرائع نہ تھے۔

اقتصادی اور سیاسی مسائل نے ہمیشہ کی طرح اب بھی اسلامی یروشلم میں عیسائیوں اور مسلمانوں کا پرامن طریقے سے اکٹھے رہنا مشکل بنا دیا۔ یہودی اسلام کے خلاف جارحانہ رویہ نہیں رکھتے تھے۔ اس دور میں یروشلم کا سفر کرنے والے لوگ بتاتے ہیں کہ پندرھویں صدی کے یہودی بہت خوشحال اور پرامن تھے۔ لیکن نئے آنے والوں نے صورتحال کی سنگینی کے پیش نظر گلیلی میں آباد ہونے کو ترجیح دی کیونکہ وہاں آسودہ زندگی کے مواقع بھی زیادہ تھے اور یہ علاقہ مقدس ربانوی خطہ بن رہا تھا۔ یہودی زائرین اب علمائے تالمود، ربی یوھانن بن ذکائی اور ربی عاقیوہ کے مزاروں پر جا کر عبادت کرنا پسند کرتے تھے۔ ربی شمعون بن یوھائی، فرقہ باطنیہ کی ممتاز شخصیت تھی۔ اس کی قبر کے قریب صافید کا شہر یہودی صوفیا کے لیے خصوصی طور پر ایک مقدس مقام بن رہا تھا۔ مسلمان بھی ان مزاروں کا احترام کرتے تھے۔ یہودی زائرین یہ بات دلچسپی کے ساتھ دیکھتے کہ فلسطین کے ان مزاروں کی نگہداشت یہودی اور مسلمان دونوں ہی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے تعلقات القدس کے مقامی اور آرمینیائی عیسائیوں سے بھی بہت اچھے تھے۔ مسئلہ صرف مسلمانوں اور مغربی عیسائیوں کے درمیان کشیدگی تھا۔ مغربی عیسائی دراصل صلیبی مجاہدین کے ورثا تھے اور امن وامان خراب کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

1365ء میں ''ہمدرد عیسائیوں'' نے اپنے مرکز قبرص سے نکل کر اسکندریہ پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں نے پوری فرانسسکن برادری کو قید کر کے گرجا مزار مقدس میں محبوس کر دیا۔ فرانسسکن بھی معصوم نہیں تھے۔ انہوں نے بھی یروشلم کی

انتظامیہ کے خلاف اسی طرح خودکش حملے شروع کر دیئے جس طرح فرانسسکن بقیہ اسلامی دنیا میں کر رہے تھے۔ 11 نومبر 1391ء کو ان کے ایک گروہ نے مسجد اقصیٰ کے باہر پُرشور مظاہرہ کیا۔ وہ اصرار کر رہے تھے کہ قاضی ان کی بات سنے۔ جب انہیں قاضی کے سامنے لایا گیا تو انہوں نے نعرے لگانے شروع کر دیئے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال کئے۔(11) پیغمبر اسلام کی توہین کی خبر پورے یروشلم میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ آناً فاناً مشتعل ہجوم قاضی کے گھر کے سامنے جمع ہو گیا۔ توہین رسالت چونکہ بہت بڑا جرم تھا اور اس کی سزا موت تھی چنانچہ قاضی نے فرانسسکن عیسائیوں کو موت کی سزا سنانے سے پہلے انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ فرانسسکن یہی چاہتے تھے کہ مسلمان انہیں شہید کرنے پر مجبور ہو جائیں اور اس طرح عذاب الٰہی کے مستحق ٹھہریں۔(12) 1393ء میں پھر اسی طرح کا ایک واقعہ رونما ہوا۔ تین فرانسسکن پادریوں نے علمائے اسلام کو مناظرہ کا چیلنج دیا اور پھر ہم آواز ہو کر حضرت محمد ﷺ کے خلاف نعرے لگائے۔ اس طرح کے واقعات عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان فساد پیدا کرنے کے علاوہ اور کیا کر سکتے تھے۔ اب پرامن بقائے باہمی ناممکن تھی۔

تناؤ کے عروج میں بھی مسلمانوں کا عمارتی جہاد جاری رہا جو بعض اوقات محسوس ہوتا تھا کہ دوسرے مذاہب کے مقدس مقامات پر جان بوجھ کر قبضہ کرنے کے لیے ہے۔ ملحقہ مسجد سے تعلق رکھتا تھا۔ اس قربت نے آگے چل کر بہت فساد کھڑا کیا۔ 1417ء میں صالحیہ خانقاہ کے شیخ نے ایک مینار تعمیر کیا جو اشتعال انگیز انداز میں مزار مقدس کی عمارت سے بلند و بالا تھا۔ یروشلم کے مسلمانوں کا کہنا تھا کہ شیخ کو اس عمل کی جزائے خیر یوم حساب کو ضرور ملے گی۔ لیکن مفادات کا یہ ٹکراؤ کوہ زیہون پر فرانسسکن پادریوں کے مرکز میں جارحانہ انداز میں سامنے آیا۔

MAP (نقشہ)

کوہ زیہون پہر تنازعہ (نام نہاد) مزار داؤد کے احاطہ میں یہودی اپنے بیٹوں کی
پہلی حجامت پر روایتی جوش و خروش کے ساتھ تقریب کا اہتمام کرتے ہیں۔

جب فرانسسکن عیسائیوں نے 1300ء میں زیہون گرجا کی زمین خریدی تو اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کی نام نہاد قبر بھی شامل تھی۔ اس کا انکشاف صلیبیوں کے دور میں ہوا تھا لیکن اس میں صلیبیوں کی کوئی دلچسپی نہ تھی۔

فرانسسکوں کو یہودی عقائد روایات سے بہت کم محبت تھی۔ جب وہ زائرین کو شہر کے مختلف مقامات دکھاتے تو وہ صرف نئے عہد نامے سے متعلق مقامات کا ذکر کرتے۔ کوہ زیہون کا گرجا بنیادی طور پر ابتدائی کلیسیا کی ایک یادگار تھا۔ زائرین کو بالا خانہ دکھایا جاتا، عید فسح کی یادگار دکھائی جاتی جہاں یوحنا حواری کنواری مریم کیلیے دعا کیا کرتا تھا اور جہاں مقدسہ مریم زمینی زندگی کے بعد ابدی نیند سو رہی تھی۔ بادشاہ داؤد اور یہودیوں کے بادشاہوں کی قبروں کا ذکر کبھی کبھار آخر میں کر دیا جاتا۔ اب شہر کے یہودی بادشاہ کی قبر عیسائیوں کی تحویل میں تھی۔ انہوں نے سلطان بیرس بے (37-1422ء) سے بار بار درخواست کی کہ یہ مقام انکے حوالے کیا جائے۔ لیکن یہ ایک غلطی تھی جب سلطان کو پیغمبر داؤدؑ کی قبر کے بارے میں علم ہوا تو اس کے لیے یہ بات نا قابل برداشت تھی کہ اسلام کے شدید دشمنوں کی تحویل میں یہ مقدس مقام رہے۔ وہ کوہ زیہون پر چڑھا اور قبر کو اس طرح مقفل کر دیا کہ وہ اس میں اپنی خانقاہ کے ذریعے داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر اس نے قبر سے عیسائیوں کے لوازمات ختم کر کے اسے ایک مسجد بنا دیا۔ اگلے اقدام کے طور پر اس نے بالا خانہ بھی بند کر دیا کیونکہ یہ براہ راست لحد داؤد کے اوپر تھا اور عیسائیوں کو اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی کہ وہ نئی مسجد کی چھت پر اپنی مذہبی تقریبات کے نام پر شور وغوغا کریں۔ (13) لاطینی یعنی فرانسسکن عیسائیوں کے حوالے سے مسلمانوں کا بقائے باہمی کا جذبہ اب کلی طور پر سرد ہو گیا تھا۔

سلطان لظاہر (53-1438ء) نے جہاد جاری رکھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ مخصوص عبادت خانوں کے علاوہ ذمی اجازت کے بغیر اپنے عبادت خانے بحال نہیں کر سکیں گے۔ زیہون کا گرجا بند کر دیا گیا اور قریبی قبرستان میں دفن فرانسسکن پادریوں کی ہڈیاں کھدوا کر باہر پھینکوا دیں۔ لکڑی کا ایک جنگلہ جو گرجا مزار مقدس پر ''غیر قانونی'' طور پر لگایا گیا تھا اسے اتار کر مسجد اقصیٰ میں پہنچا دیا گیا۔ بیت لحم میں بنائی جانے والی نئی عمارتیں بھی گرا دی گئیں، ایک شامی خانقاہ بھی ضبط کر لی گئی۔ لیکن سلطان کا سب سے بڑا جارحانہ اقدام براہ راست لاطینی عیاسئیوں کے خلاف تھا۔ اس نے آرمینیائی عیسائیوں کے حق میں ایک فرمان جاری کیا جس کے تحت یروشلم کے امیر کو حکم دیا گیا کہ وہ آرمینیائی عیسائیوں پر غیر ضروری ٹیکس نافذ کر کے ہراساں نہ کرے۔ آرمینیائی عیسائیوں کے محلّہ کی داخلی دروازوں پر اس حکم کا کتبہ آویزاں کر دیا گیا۔ آرمینیائی اگرچہ صلیبی جنگوں میں شریک رہے تھے لیکن وہ ان کی طرح اسلام کے خلاف نفرت کا مذہبی جنون نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے غیر جانبدار رہنا سیکھ لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے تین سو برسوں کے دوران ہونے والی بغاوتوں اور اکھڑ پچھاڑ کے دوران صرف وہی ایک ایسی برادری تھی جسے اپنے علاقے سے نہیں نکالا گیا تھا۔

شہر میں کشیدگی کے باوجود مغرب سے بڑی تعداد میں زائرین کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کا قیام اگرچہ پُر آسائش نہیں ہوتا تھا لیکن وہ جو کچھ دیکھنے کے لیے آتے تھے وہ سب کچھ دیکھنے کی انہیں اجازت ہوتی تھی اور ان کی زیارتوں کو مناسب طریقے سے مکمل کیا جاتا تھا۔ وہ گرجا مزار مقدس میں پوری رات گزارتے اور پھر اگلے روز شہر میں تمام مقدس

مقامات کی زیارتوں کے لیے نکلتے۔ اس کا آغاز دن طلوع ہونے سے پہلے کیا جاتا تا کہ مسلمانوں میں کوئی اشتعال نہ پھیلے۔ زیارتوں کے سفر کا آغاز کرتے ہوئے عیسائی زائرین گرجا مزار مقدس سے خاموشی کے ساتھ شہر کے مشرقی دروازے کی طرف جاتے جسے آجکل لائن گیٹ کہا جاتا ہے۔ وادی قدرون سے گزر کر گتسمنے باٹ میں پہنچتے اور پھر کوہ زیتون پر گرجا صعود مقدس میں آجاتے۔ پھر وہ سلعوم کے تالاب کی طرف سے واپس شہر کو آتے اور آخر میں کوہ زیہون پہ آجاتے۔ زیارتوں کے اگلے مرحلہ میں بیت لحم اور دریائے اردن پر تین دن گزارے جاتے۔ پہلے کی طرح زائرین مساجد یا مدارس کا ذکر بہت کم کرتے۔ فرانسسکن، حرم کے اسلامی رنگ و روپ سے توجہ ہٹانے کے لیے اس کی مسیحی نسبت کا ذکر زیادہ کرتے۔ وہ ابھی تک قبتہ الصخرہ کو ''خداوند کا معبد'' کہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہاں مقدسہ مریم کو بچی کی حیثیت سے خداوند کے حضور پیش کیا گیا تھا۔ بعد میں وہ معبد کے مدرسہ میں گئی اور پھر یہیں اس کی شادی یوسف سے ہوئی۔ جنانچہ عیسائی مالکانہ انداز میں مسجد اقصیٰ کو ''ہماری بی بی ءکا گرجا'' کہا کرتے تھے۔

فرانسسکن، مصائب مسیح سے خصوصی عقیدت رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ ان مقامات کی نشاندہی کرتے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری اور اذیت ناک لمحے گزارے تھے۔ یہ تمام مقامات یروشلم کے شمالی حصوں میں پائے جاتے تھے۔ کوہ زیہون سے منتقلی جو صلیبیوں کے دور میں شروع ہوئی تھی اب محسوس ہوتا تھا کہ مکمل ہو چکی ہے۔ ویرونا کا جیمز، جس نے 1335ء میں یروشلم کا سفر کیا۔ اس کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ وہ شہر میں مشرقی دروازے (لائن گیٹ) سے داخل ہوا۔ جو بیت حصدا کے تالاب کے پاس تھا۔ سینٹ انا کے گرجا کے پاس سے گزرا جو بعد میں صالحیہ مدرسہ بنا اور پھر نیچے سڑک پر پہنچا جسے اب وایا ڈولوروزا کہتے ہیں۔ جیمز کو اناس کا گھر دکھایا گیا (اب یہ مسجد میں تبدیل کیا جا چکا تھا) پھر اسے ہیرودیس کا مکان اور پیلاطس کا گھر بھی دکھایا گیا، جہاں ہیڈریان نے فورم بنا دیا تھا۔ اسے وہ مقام بھی دکھایا گیا جہاں بی بی مریم، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کندھے پر صلیب اٹھائے دیکھ کر بے ہوش ہو گئیں تھیں۔ ایک کھنڈر دروازہ دکھایا گیا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ آخری مرتبہ اسی کے ذریعے شہر سے باہر نکلے۔ مزار مقدس کے نواح میں پہنچ کر جیمز کچھ ''اور مقامات'' پر بھی ٹھہرا۔ مزار مقدس کے صحن میں ایک تڑخا ہوا پتھر تھا۔ جیمز کو بتایا گیا کہ حضرت عیسیٰ نے گلگتا پہاڑی پہ چڑھنے سے پہلے یہاں آرام کیا تھا۔ گرجا کے اندر ایک پنجرہ پڑا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ صلیب تیار ہونے کے دوران مسیح کو اس میں قید کیا گیا اور یہیں انہیں بے لباس کیا گیا۔ پھر جیمز گلگتا کی زیارت کا ذکر کرتا ہے۔ کالے رنگ کے پتھر کی اسی چٹان کی وجہ سے صلیب کے مقام کو کھوپڑی کی جگہ کہا جاتا تھا۔ صلیب سے اتارنے کے بعد یسوع مسیح کو یہیں لٹایا گیا۔ اور آخر میں اس قبر کی زیارت کرائی گئی جس میں یسوع کے مردہ جسم کو رکھا گیا اور جس میں وہ دوبارہ زندہ ہوئے۔ ان میں سے کچھ مقامات کو تبدیل کر دیا گیا تھا۔ مثلاً جب فرانسسکن گائیڈ، زائرین کو لے کر مشعل کی روشنی میں نیچے وایا ڈولوروزا پہ آتے تو انہیں مخالف سمت میں لے کر جاتے۔ لیکن اب زمین ہموار ہو چکی تھی۔ اب چونکہ لاطینیوں کے پاس ان کے اپنے

گرجا مزار مقدس میں زیادہ جگہ نہیں تھی چنانچہ وہ دوسرے مقامات کو منتقل ہو رہے تھے۔

جرمن سیح فیلکس فبیری 1480ء کے قریب یروشلم میں آیا۔اس نے اپنی زیارتوں کا احوال لکھا ہے۔اس کا جہاز جب یافہ کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا تو اسے یروشلم میں مسلمانوں اور لاطینی عیسائیوں کے درمیان پائیجانے والی کشیدگی کا پتہ چل گیا۔مسلمان ہر زائر کے ساتھ درشتی سے پیش آتے۔اس کا نام اور دیگر کوائف پوچھتے۔فیلکس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ پھر اسے ایک تاریک اور بوسیدہ، سے تہہ خانے دھکیل دیا گیا جہاں اسے اس طرح بیٹھنا پڑا جیسے لوگ بھیڑ بکریوں کا دودھ دوھنے کے لیے بیٹھتے ہیں۔(14) یہاں اسے ایک ترجمان مہیا کیا گیا جو یروشلم میں

قیام کے دوران اسلامی دنیا سے اس کا واحد رابطہ تھا۔فرانسسکن سرپرست (کسٹوس) نے زائرین کو سخت قسم کی ہدایات دیں۔زائرین کو کہا گیا کہ وہ اپنے ترجمان کے بغیر شہر میں کہیں نہ جائیں۔دیواروں پر کچھ نہ لکھیں۔مسلمان عورتوں کی طرف دلچسپی سے نہ دیکھیں۔سرعام شراب نہ پئیں۔اس طرح کا کوئی بھی اقدام مسلمانوں کو مشتعل کر دے گا اور انہیں قتل کیا جا سکتا ہے۔مسلمانوں کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کی جائے۔شہر میں کشیدگی کا یہ عالم تھا کہ حکام مقامی آبادی کے تحفظ کی بھی ضمانت نہیں دے سکتے تھے۔

اس ہیبت ناک استقبال کے باوجود زائرین کے اشتیاق میں کمی نہ آئی۔فیلکس بتاتا ہے کہ زائرین نے جونہی مقدس شہر کو دیکھا وہ اپنے گدھوں سے کود کر نیچے اترے اور زاروقطار رونے لگے۔اسی طرح انکی گریہ زاری اس وقت دیکھنے میں آئی۔جب انہوں نے مزار مقدس کو پہلی مرتبہ دیکھا۔لوگوں کا برا حال تھا۔شدت غم سے وہ سسکیاں لیتے، آہیں بھرتے، آہ وبکا کرتے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے۔(15)

''لیکن اس زیارت مین ان کے لیے ایک اندوہ کے ساتھ ساتھ تسکین اور روحانی اطمینان تھا۔کچھ زائرین شدت جذبات سے سینہ کوبی کرنے لگے۔عورتیں یوں چیخ اٹھیں جیسے دردزہ میں مبتلا ہوں۔کئی زائرین تو نڈھال ہو کر گر پڑے اور زمین پر یوں بے سدھ پڑے تھے جیسے لاشیں ہوں۔متعدد زائرین اس طرح غم سے بے حال ہوئے کہ ان میں سے بیشتر کو ہسپتال میں داخل کرانا پڑا۔یروشلم کے ساتھ مغرب کے عیسائیوں کی عقیدت ہسٹیریا کی حدوں کو چھوتی تھی۔لیکن نہ تو منظّم انداز میں ان کی روحانی رہنمائی موجود تھی اور نہ انہیں کوئی ماورائے ادراک تجربہ میسر آتا تھا۔وہ محض اپنے اعصاب کی خلل میں مبتلا ہو کر رہ جاتے۔

لیکن مغرب کی دین داری اور تقویٰ تبدیل ہو رہا تھا۔فیلکس خود اپنے محسوسات کا تجزیہ کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اس کے پیشرو زائرین مختلف تجربہ سے دوچار ہوتے تھے۔اس کا کہنا ہے کہ زیارت ایک انتہائی کٹھن کام ہے۔تپتے سورج کے نیچے ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانا آسان بات نہیں۔گھٹنوں کے بل جھکنا، زمین پر سجدہ ریز ہونا اور پھر اس بات کا خیال رکھنا کہ آپ کا طرز عمل پوری مناسبت رکھے ہوئے ہے یا نہیں بہت پریشان کن ہے۔ایک مقام سے دوسرے مقام

کو پیدل چلتے ہوئے ذہنی یکسوئی کی جدوجہد بیزار کر دیتی ہے۔(16) فیلکس کچھ مقامات کے بارے میں اپنی تشکیک کا اظہار بھی کرتا ہے مثلاً اس کا کہنا ہے کہ اصل قبر اتنا وقت گزر جانے کے باوجود کس طرح درست حالت میں رہ سکتی ہے؟ آخر بادشاہ داؤد کی قبر کا سراغ اس سے پہلے کوئی کیوں نہ لگا سکا؟(17) مقدس مقامات کے بارے میں تنقیدی نکتہ نظر غالب آ رہا تھا جس نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یورپ کے زیادہ تر زائرین کے لیے یہ مقدس فریضہ غیر اہم بنا دیا۔

لیکن زیارتوں کے دن شاید ویسے ہی پورے ہو چکے تھے۔تمام بڑے مذاہب کا اصرار تھا کہ ایک حقیقی مذہبی تجربہ عملی دردمندی سے ابھرنا چاہیے۔مستند روحانیت کا حقیقی امتحان یہی ہے۔ماضی میں یروشلم نے عیسائیوں کو اپنے ہم مذہبوں یا دیگر مذاہب کے لوگوں کے لیے دردمندی کا جذبہ پیدا کرنے میں مدد نہیں کی تھی۔صلیبی جنگوں کو مذہب کی مضحکہ خیز شکل کی حیثیت سے دیکھا جا سکتا ہے۔ایک پرجوش عقیدت جس کی حتمی منزل محض ایک مقدس مقام پر قبضہ کرنا تھا۔جدیدیت کی سرحد پر قدم رکھنے والا فیلکس یروشلم کے باشندوں کے بارے میں کوئی اچھا لفظ کہنے سے قاصر ہے اس کا کہنا ہے کہ ''مسلمان'' ہر قسم کی بدعت سے آلودہ ہو چکے ہیں۔وہ اب بت پرستوں سے زیادہ برے اور یہودیوں سے زیادہ گھناؤنے ہیں۔یونانی کلیسیا جو کبھی علم و فضل کا نمائندہ تھا اب لاتعداد غلطیوں کی وجہ سے تاریک ہو چکا ہے۔شامی، شیطان کے بچے ہیں۔آرمینائی طرح طرح کی بدعتوں میں ڈوب گئے ہیں۔یہودیوں سے سب جائز طور پر نفرت کرتے ہیں۔ان کی عقل مصائب سے زنگ آلود اور اس ذلت سے زائل ہو چکی ہے جس سے وہ گزر رہے ہیں۔شہر کے تمام باشندوں میں صرف فرانسسکن ہی ایسے ہیں جو نیکی کی زندی گزار رہے ہیں۔ان کی دینداری کا نشان خلوص نیت کے ساتھ ایک نئی صلیبی جنگ کی خواہش ہے تاکہ شہر مقدس فتح کیا جا سکے۔(18) یہ ناگوار اور آزردہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ زیارتوں نے فیلکس کو اس کے تعصّبات اور تصورات سے

نجات نہیں دلائی تھی بلکہ اسے نفرت اور خود پسندی کی انتہاؤں پر پہنچا دیا تھا۔

سلطان الاشرف کائیت بے (96-1468ء) کے دور میں مملوک اپنے اقتدار کے آخری مرحلے میں داخل ہو گئے۔ایشیائے کوچک کے عثمانی ترکوں کی فوجیں ان کے علاقے فتح کرتی آ رہی تھیں۔بدویوں کے حملوں نے یروشلم سے لوگوں کا باہر نکلنا خطرناک بنا دیا تھا۔ساٹھ افراد یروشلم کی دیواروں سے باہر 1461ء میں بدویوں کے ہاتھوں مارے گئے۔مملوکوں کی تجارت بھی پرتگیزوں نے تباہ کر دی۔لیکن سلطان اب بھی یروشلم کو نظر انداز نہیں کر رہا تھا۔اس نے حرم کی مغربی دیوار کے ساتھ ایک نیا مدرسہ تعمیر کرنے کا حکم دیا۔اشرفیہ مدرسہ غالباً مملوکوں کی تمام عمارتوں میں سب سے زیادہ حسین تھا۔مجیرالدین اسے حرم کا تیسرا نگینہ کہتا ہے۔یہ جزوی طور پر بلدیہ مدرسہ کی چھت پر اور بقیہ حرم کی ڈیوڑھی پر بنایا گیا۔اس کا ہال کمرہ منفرد انداز میں حرم پر پھیلایا گیا۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آخری مملوک قبتہ الصخرہ کی تمنا کر رہے تھے جبکہ القدس ان کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔اشرفیہ مدرسہ اسلام کی یک جہتی کی علامت تھا۔اس میں چاروں مکتبہ فکر کے علماء اور ساٹھ صوفیا

رہتے تھے۔سلطان کوشش کر رہا تھا کہ یروشلم میں مذہبی کشیدگی ختم ہو جائے۔اس کی جوانی کے دور میں فرانسسکن اس کے دوست تھے۔ان دنوں یروشلم میں اس کے داخلہ پر پابندی تھی اور سلطان اس بات کو بھول نہیں سکا تھا۔اس نے فرانسسکن عیسائیوں کو کوہ زیہون پر آنے کی اجازت دے دی۔لیکن وہاں وہ ناخوشگوار صورتحال میں بند مکانوں میں رہے۔انہوں نے اپنے تحفظ کے لیے خونخوار کتے رکھے ہوئے تھے۔1489ء میں انہوں نے رشوت دے کر بادشاہ داؤد کی قبر اور خانقاہ واپس لے لی اور اس کی تعمیر نو شروع کر دی۔لیکن اگلے برس علما کی ایک مجلس نے فتویٰ دے دیا کہ چونکہ یہ مقام ایک بار مسجد کی صورت اختیار کر چکا ہے چنانچہ اس کی عیسائیوں کو واپسی ناجائز اور غیر قانونی ہے۔

ان آخری برسوں میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان تعلقات نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔یہ رخ انتہائی ناخوشگوار تھا۔1473ء میں طوفانی بارشوں نے رامبن صومعہ کا ایک حصہ منہدم کر دیا۔جب یہودیوں نے اس کی تعمیر و مرمت کی اجازت طلب کی تو متصلہ مسجد کی انتظامیہ نے شدید مخالفت کی۔اس کا موقف تھا کہ لوگوں کو صومعہ کی زمین پر سے گزر کر مسجد تک پہنچنے کی بجائے گلی سے براہ راست داخلہ کی سہولت ہونی چاہیے۔یہودیوں نے رشوت دے کر عبادت خانہ بچا لیا لیکن مسلمان اتنے مشتعل ہوئے کہ انہوں نے ایک رات صومعہ پر حملہ کر کے اسے مسمار کر دیا۔سلطان کائیت بے یہودیوں کا ہمدرد نکلا اور اس نے صومعہ کی تعمیر نو کی اجازت دے دی۔لیکن اس زمانے میں یروشلم میں صرف ستر یہودی خاندان رہتے تھے اور وہ سب کے سب مفلوک الحال تھے۔زیادہ تر جھونپڑیوں جیسے مکانوں میں مقیم تھے۔انکے لیے تعمیر نو کے مصارف برداشت کرنا ناممکن تھا۔

اوبادیاہ ڈے برٹی نیرو نے 1487ء میں یروشلم کا سفر کیا۔وہ اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے کہ اصل مسئلہ جرمنی کے اشکنزی یہودیوں اور سپین اور دوسرے اسلامی ملکوں کے سفاردی یہودیوں کے درمیان تلخ تنازعات تھے۔صومعہ مسمار ہونے کے بعد یہودیوں نے حرم میں قدم نہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔بعض اوقات مسلمانوں کو وہاں مرمت کا کام کروانا ہوتا تھا لیکن یہودی وہاں کوئی کام کرنے پر تیار نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ خود کو ضروری مذہبی پاکیزگی میں نہیں سمجھتے تھے۔یہودیوں کی طرف سے اس خود ساختہ پابندی کا ذکر پہلی دفعہ سننے میں آتا ہے۔اس پر وہ آج تک قائم ہیں۔جب سیاح میمونیڈیس یروشلم میں آیا تو صورتحال ایسی ہی تھی۔وہ بھی برٹی نیرو کے خیالات کا حامی تھا۔لیکن اسے حرم میں داخل ہونے میں کوئی مزاحمت پیش نہ آئی۔اب چونکہ کوہ معبدان کی رسائی میں نہیں تھا چنانچہ یہودیوں کو کسی نئے مقدس مقام کی ضرورت تھی۔برٹی نیرو یروشلم میں اپنے قیام کے دوران جب حرم کی مغربی دیوار کے پاس سے گزرتا تو اسے کوئی خاص بات محسوس نہ ہوتی۔ ''دیوار بڑے بڑے تراشیدہ پتھروں پر مشتمل تھی۔''اس طرح کے پتھر میں نے کبھی کسی پرانی عمارت میں نہیں دیکھے تھے۔ یہاں تک کہ روم اور دیگر بڑے شہروں میں بھی نہیں۔(19) مغربی دیوار ابھی یہودیوں کے لیے اہم نہیں ہوئی تھی۔لیکن پھر جلد ہی تبدیلی آ گئی۔

مورخ مجیرالدین نے 1496ء میں مملوکوں کے آخری دنوں کا احوال تفصیل سے لکھا ہے۔ مملوکوں کے عہد میں یروشلم کا تقدس مسلمانوں کی نظروں میں ہمیشہ سے زیادہ اہم رہا لیکن شہر کے گرد دیواریں نہ اٹھائی گئیں اور نہ ہی وہاں فوج رکھی گئی۔ شہر پناہ میں شام کی پریڈ بھی ختم کر دی گئی۔ گورنر ایک عام شہری کی طرح رہتا تھا۔ اگرچہ مملوک حرم پر دل کھول کر خرچ کرتے تھے لیکن انہوں نے شہر کی قلعہ بندی کرنے پر کبھی توجہ نہ دی۔ ان کی نظر میں یروشلم کی کوئی عسکری اہمیت نہ تھی۔ البتہ مملوکوں نے شہر کی سماجی زندگی کو کبھی نظر انداز نہ کیا۔ مجیرالدین بتاتا ہے کہ شہر کی عمارتیں ٹھوس اور مستحکم انداز میں تعمیر کی گئی تھیں۔ اس کے بازار دنیا کے بہترین بازاروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ حرم کیلیے مملوکوں کی عقیدت نے شہر کا منظر تبدیل کر دیا تھا۔ چنانچہ زندگی کا مرکز مغربی پہاڑی سے واپس اندرون شہر منتقل ہو چکا تھا۔ قسطنطین کے زمانہ سے مغربی پہاڑی کا علاقہ بقیہ شہر پہ غالب تھا۔ جب سلطان صلاح الدین نے یروشلم فتح کیا تو اس کے امیروں نے مزار مقدس کے پہلو میں اپنی رہائش رکھی۔ مجیرالدین کے زمانہ میں گورنر، حرم کی شمالی سرحد کے ساتھ رہتا تھا۔ مشرق کے بیشتر شہروں کی طرح یروشلم بھی مختلف محلوں میں تقسیم تھا۔ شہر کے لوگ مختلف محلوں میں اپنے ہم مذہبوں اور ہم نسلوں کے ساتھ رہنا پسند کرتے تھے۔ آرمینیائی اور مغربی عیسائی اکٹھے رہتے تھے۔ اسی طرح ایران، افغانستان اور ہندوستان سے تعلق رکھنے والے مسلمان ایک محلّہ میں رہتے تھے۔ یہ لوگ حرم کے شمال مغربی گوشہ کے پاس رہتے تھے۔ لیکن کوئی سخت قسم کی علیحدگی اور آبادی کا امتیاز موجود نہیں تھا۔ مثلاً شہر کے جنوب میں مسلمان اور یہودی ایک ہی محلّہ میں ایک دوسرے کے پڑوس میں رہتے تھے۔ بیزیتا میں عیسائی اور مسلمان ایک دوسرے کے ہمسائے تھے۔ یوں مذہبی یا نسلی تفریق کی بنیاد پر آبادیوں کی تقسیم زیادہ سخت نہیں تھی۔

سلطان الاشرف اخنوق الغوری (16-1513ء) کے دور میں صورتحال واضح ہو چکی تھی۔ اب مملوک، عثمانیوں کو زیادہ دیر تک غالب آنے سے روک نہیں سکتے تھے۔ 1453ء میں عثمانیوں نے قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد بازنطین کی پرانی عیسائی سلطنت تحلیل کر دی۔ ایک مرحلہ پر تو یوں لگتا تھا کہ یہ پورے یورپ کو فتح کر لیں گے۔ لیکن بلغراد سے ہنگری کی فوجوں نے انہیں واپس دھکیل دیا۔ پھر 1515ء میں عثمانی سلطان سلیم اول نے جارحانہ انداز اپنایا۔ دو سال کے اندر اس نے ایرانی پیش قدمی روک دی اور الیپو کے شمال میں مرج دیبک کے مقام پر مملوکوں کو بری طرح شکست سے دوچار کیا۔ قاہرہ کے باہر ایک اور جنگ ہوئی اور پھر مملوک سلطنت ہمیشہ کے لیے غروب ہو گئی۔ یکم دسمبر 1516ء کو سلطان سلیم یروشلم کے بارہ پہنچا۔ کوئی مزاحمت موجود ہی نہیں تھی۔ علما کا ایک وفد سلطان کے پاس آیا اور اسے قبتہ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کی چابیاں پیش کیں۔ سلطان فوراً گھوڑے سے اترا اور یہ کہتے ہوئے سجدہ ریز ہو گیا۔

''خدا کا شکر ہے۔۔۔۔ قبلہ اول کی تولیت اب میرے پاس ہے۔''

============

حوالہ جات

1۔ امدادالدین اصفہانی، الفتح القصی فع الفتح القدس۔انگریزی ترجمہ صفحہ نمبر 182۔

2. M. Schwab, Al-Harizi et ses peregrinations en Terre Sainte (vers 1217), "in Archieves de I'Orient Latin, ed. Ernest Leroux, 2 vols. (Paris, 1884), 2:239.

3۔ ابن واصل۔مفرج القرب فی اخبار بنی ایوب (کتاب عرب مورخین کی نظر میں صلیبی جنگیں از جبیر ئیلی) صفحہ نمبر 271۔

4۔ فریڈرک نے عکہ کے تحت کی وارث یولاندہ سے شادی کی تھی۔ چنانچہ وہ یروشلم میں تاجپوشی کی رسم کا حقدار تھا۔

5۔ المقریزی۔۔۔۔۔تاریخ۔۔۔۔۔کے اقتباسات ڈولنڈ پی لٹل نے اپنی کتاب ہسٹری میں دیئے ہیں۔

Jerusalem Under Ayyubids and Mumluk 1187-1556. by K. J Asali (1990) p. 185

6. F. Kobler, ed., Letters of Jews Through the Ages from Biblical Times to the Middle of the Eighteenth Centur, 2 vols(New York, 1978), 2:227.

7. Joshua Prawer, The latin Kingdom of Jerusalem: European

Colonialism in the Middle ages (London 1972), pp. 247-48.

8. Eliezer Schweid, The Land of Israel: National Home or Land of Destiny, trans. Deborah greniman (Lodon and Toronto, 1985). pp. 71-81.

9. Michael Hamilton Burgoyne and D. S. Richards, Mamluk Jerusalem: An Architectural Survey (London,1987).

10. E. Sivan, L'Islam et La Croisade: Ideologie et propagande dans les reactions musulmans aux Croisades (Paris, 1968), p.118.-
یہ احادیث غالباً 1244ء کے بعد مدون کی گئی تھیں

11. P. Durrien. "Proces-verbale du martyre des quatre freres Mineures en 1391" in Archives de L'Orient Latin, I (1910)

12۔ ہسپانیہ اور شمالی افریقہ میں اسی طرح کے خودکش حملے کئے گئے تھے۔
بنجمن کے کیدر کی کتاب کروسیڈ اینڈ مشن (1984ء) میں اس کی تفصیل
موجود ہے۔

13۔ دی بک آف وانڈرنگز آف برادر فیلکس، فیبری، انگریزی ترجمہ آبُرے سٹیوارٹ
(لنڈن 1887ء، نیویارک 1971ء) صفحہ نمبر 394-305-

14۔ ایضاً صفحہ نمبر 224۔

15۔ ایضاً صفحہ نمبر 283۔

16۔ ایضاً صفحہ نمبر 299۔

17۔ ایضاً صفحہ نمبر 304-408-416

18۔ ایضاً صفحہ نمبر 384-391

19. E. N. Adler, Jewish Traveliers: A Treasury of Travelogues from Nine Centuries (New York, 1966), p. 240.

==========

www.HallaGulla.com
Virtual Home
for Real People

www.HallaGulla.com
Virtual Home
for Real People

www.HallaGulla.com
Virtual Home
for Real People

www.HallaGulla.com
Virtual Home
for Real People

www.HallaGulla.com
Virtual Home
for Real People

www.HallaGulla.com
Virtual Home
for Real People

www.HallaGulla.com
Virtual Home
for Real People

www.HallaGulla.com
Virtual Home
for Real People

www.HallaGulla.com
Virtual Home
for Real People